

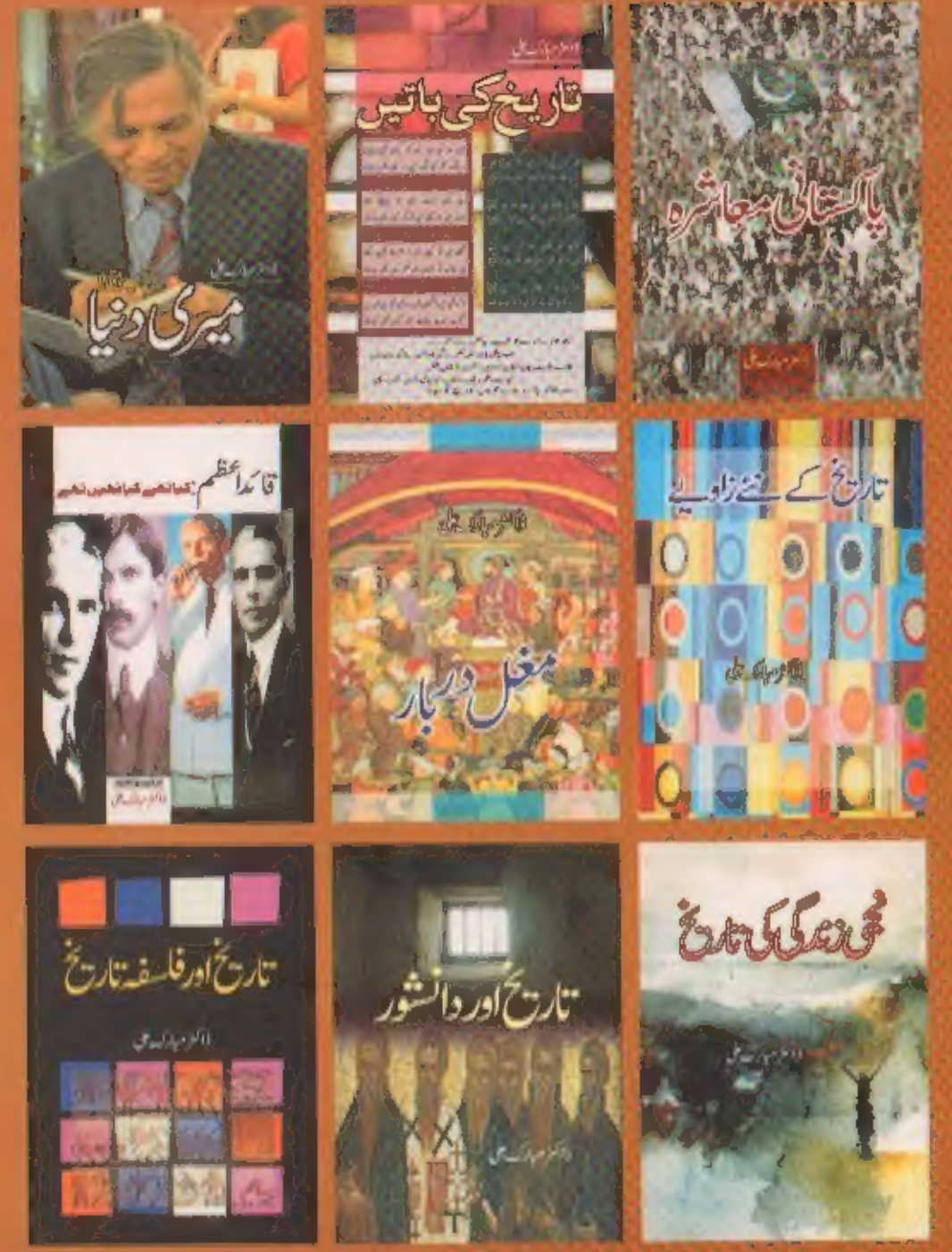
تاریخ کا سفر

(ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)

ترتیب ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

تاریخ کا سفر (ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)

ترتیب ڈاکٹر ریاض احمد شیخ



تاریخ پبلیکیشنز

فکشن ہاؤس

لاہور • حیدرآباد • کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com



تقسیم کردہ

تاریخ کا سفر

(ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)

تاریخ کا سفر

(ڈاکٹر مہارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)

ترتیب: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

تاریخ پبلیکیشنز

بک سٹریٹ 39- مرگ روڈ لاہور پاکستان

e-mail: tarikh.publishers@gmail.com

فہرست

- ☆ پیش لفظ 9 ڈاکٹر ریاض احمد شیخ
- ☆ پبلشر کی جانب سے 11 ظہور احمد خان
- 1- جرمنی کی یادیں 13 ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ احمد
- 2- خرد افروزی کا مورخ — ڈاکٹر مبارک علی 21 اسلم گورداسپوری
- 3- ڈاکٹر مبارک علی — ایک منفرد تاریخ نویس 37 ڈاکٹر سید جعفر احمد
- 4- ڈاکٹر مبارک علی اور دانشوری کی روایت 42 ایوب ملک
- 5- ڈاکٹر مبارک علی اور ان کا فن تاریخ نویسی
- ایک طائرانہ جائزہ 49 فاروق بلوچ
- 6- ڈاکٹر مبارک علی: ایک عہد ساز شخصیت 61 ڈاکٹر خالد اشرف
- 7- ربیع صدی کا قصہ 84 ڈاکٹر ناظر محمود
- 8- نظریہ تاریخ: گڑھے مردوں سے زندہ انسانوں تک 89 ڈاکٹر روبینہ سہگل
- 9- ایک ٹیز ہے خان صاحب کی کہانی 96 وسعت اللہ خان
- 10- ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں 99 قاضی جاوید
- 11- تاریخ ساز — ڈاکٹر مبارک علی 108 اشفاق سلیم مرزا
- 12- ناتواں عہد کی توانا شخصیت — ڈاکٹر مبارک علی 113 ڈاکٹر غافر شہزاد
- 13- ڈاکٹر مبارک علی 118 ڈاکٹر ریاض احمد شیخ


- نام کتاب : تاریخ کا سفر
(ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)
ترتیب : ڈاکٹر ریاض احمد شیخ
اہتمام : ظہور احمد خان
پبلشرز : تاریخ پبلیکیشنز
بک سٹریٹ 39- مرگ روڈ لاہور، پاکستان
کلشن کمپوزنگ اینڈ گر افکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : نین تارا
اشاعت : 2013ء
قیمت : 600/- روپے

تقسیم کردہ:

کلشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مرگ روڈ لاہور فون: 042-37249218-37237430

کلشن ہاؤس: 52، 53 رابع اسکوائر حیدر چوک حیدر آباد فون: 022-2780608

کلشن ہاؤس: نوشین سنٹر فرسٹ فلور دکان نمبر 5 اردو بازار کراچی فون: 021-32603056


فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

- 14- ڈاکٹر مبارک علی انور کمال 126
- 15- ڈاکٹر مبارک علی رضی عابدی 128
- 16- ڈاکٹر مبارک علی ایک تابندہ ستارہ سردار عظیم اللہ میو 131
- 17- ایک تاریخ داں، ایک انسان رفاقت علی انصاری 134
- 18- ڈاکٹر مبارک علی زمان خان 139
- 19- چند یادیں کھٹاؤ دل 144
- 20- تاریخ اور مؤرخ ڈاکٹر توصیف احمد خان 146
- 21- ڈاکٹر مبارک علی ڈاکٹر تنہم صدیقی 150
- 22- شاید کہ اتر جائے حیرے دل میں میری بات حسین صدانی 154
- 23- ڈاکٹر مبارک علی — ایک معروضی مؤرخ جاوید صدیقی 159
- 24- ڈاکٹر مبارک علی — جدوجہد کی ایک کہانی سلمان عابد 165
- 25- ڈاکٹر مبارک علی کا تاریخی کارنامہ افضل رحمان 172
- 26- ڈاکٹر مبارک علی — تاریخی دنیا کا درویش امر ناتھ موہل ایڈووکیٹ 178
- 27- ڈاکٹر مبارک علی سماجی علوم اور تاریخ نویس رؤف نظامانی 185
- 28- ڈاکٹر مبارک علی — ایک مؤرخ، ایک ادارہ حیات کشمیر 190
- 29- میرا محسن — ڈاکٹر مبارک علی ڈاکٹر عتیق چوہدری 196
- 30- ڈاکٹر مبارک علی — جیسے میں نے ان کو دیکھا اعجاز احمد قریشی 199
- 31- ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کے احساس کے ساتھ زبیدہ مصطفیٰ 203
- 32- ڈاکٹر مبارک علی اسحاق سمرو 208
- 33- روشنی اور روشن خیالی کا استعارہ — ڈاکٹر مبارک علی محمد ابراہیم خلیل 212
- 34- ڈاکٹر مبارک علی — ایک دوست کا تاثر راحت سعید 215
- 35- تاریخ کا شعور اور ڈاکٹر مبارک علی مقتدر منصور 218
- 36- ڈاکٹر مبارک علی — حیدر آباد کی یادیں فتح محمد 225

- 37- ڈاکٹر مبارک علی عزیز بگٹی 230
- 38- ایک مدبر — ایک مؤرخ لطف راجہ ایڈووکیٹ 233
- 39- ڈاکٹر مبارک علی — چند تاثرات شہزاد احمد 236
- 40- ناقابل فراموش خورشید احمد شیخ 238
- 41- میں نے تاریخ کا مضمون کیوں لیا ارم علی دروگ 241
- 42- انسان دوست مسعود جمال 244
- 43- یادوں کی واپسی ڈاکٹر مبارک علی 247
- 44- سہ ماہی تاریخ کا تنقیدیں 251
- 45- تاریخ پہلی کیشنز کا کتابی سلسلہ سہ ماہی "تاریخ" 252
- 46- ڈاکٹر مبارک علی کی اردو کتب 255
- 47- ڈاکٹر مبارک علی کی انگلش کتب 258
- 48- ڈاکٹر مبارک علی کو ملنے والے ایوارڈز 259

پیش لفظ

پاکستان جیسے ملک میں جو کہ طویل عرصے تک فوجی آمریتوں کے زیر تسلط رہا ہے وہاں آزادی تحریر پر پابندیاں عائد رہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوقومی نظریے کے تحفظ اور نام نہاد مسلم ائمہ کا حصہ بننے کی جستجو میں ہم نے حقیقت سے منہ موڑتے ہوئے خیالی اور افسانوی دنیا میں زندہ رہنے کو ترجیح دی۔ ریاست کے زیر سائے نصابی کتب اور تمام علوم کو ریاست کے گھڑے گئے نظریے میں پابند کرنے کے لئے ایسے کھلائے کہ سچ اور حقیقت ہماری کتب اور مضامین سے غائب ہو کر رہ گئیں۔ یہی سبھی کمر جزل ضیاء الحق کے دور میں اپنے آپ کو بلا ضرورت افغان جہاد میں الجھانے اور پاکستانی معاشرے کو اسلامی بنانے کے عمل نے پوری کر دی۔ اس پورے عمل نے ویسے تو پاکستانی معاشرے کے تقریباً تمام شعبوں کو متاثر کیا لیکن سب سے زیادہ نقصان نصابی کتب کا ہوا جہاں نصاب کو بدل کر نفرت، جھوٹ اور بغض سے بھر دیا گیا اور اس سلسلے میں بھی سب سے زیادہ جس مضمون کا حشر ہوا وہ تھا ”شعبہ تاریخ“۔

ہمارے تمام حکمران حقیقت اور سچ کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ سچ کا سامنا کرنا انتہائی دشوار اور تکلیف دہ ہے۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اس لئے تو وہ سچ سننا نہیں چاہتے ہیں۔ نہ حقیقت دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ایسے لوگوں کو برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ جو کہ حق اور سچ کی بات کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ہمیشہ ایسے کرداروں کی سرپرستی کی جو کہ ان کے وضع کردہ نظریوں کو جو صرف جھوٹ، نفرت اور کدورتوں پر مشتمل ہیں ان کی تبلیغ کرتے رہے۔ پاکستان کے حکمرانوں کی خواہشات پر لکھی جانے والی تاریخ نے حقیقت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔

اس تحسن اور تھک نظری کے ماحول میں ڈاکٹر مبارک علی جیسے سچے اور کھرے مورخ کا سامنے آنا اور پھر تاریخ جیسے حساس علم کو حقیقت کی نگاہ سے بیان کرنا ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جس طرح گزشتہ تین دہائیوں سے اپنے قارئین کو

سچائی سے روشناس کرایا ہے وہ ایک بے مثال اور بے نظیر کاوش ہے۔ آج اپنی تحریروں کے ذریعے چاہے وہ اخبارات و جرائد میں چھپنے والے ان کے مضامین ہوں یا پھر ان کی تاریخ کے موضوع پر کسی نگین کتب ہوں وہ اس ملک کے ہر عمر، علاقے، مختلف زبان بولنے والوں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے طبقات میں یکساں مقبول عام ہیں۔

یہ کتاب ڈاکٹر مبارک علی کے گزشتہ تین دہائیوں سے زائد عرصے سے جاری علمی جہاد کو مختلف دوستوں کی تحریروں کی صورت میں خراج تحسین پیش کرنے کی ایک کاوش ہے۔ 21 اپریل 2013ء کو ڈاکٹر مبارک علی کی 72 ویں سالگرہ ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر مبارک علی کے دوستوں اور قارئین کی طرف سے ڈاکٹر مبارک علی کی خدمت میں محبت اور خلوص کے چند الفاظ ہیں جو کہ مرحب کر کے ایک کتاب کی صورت میں یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ ان مضامین اور تحریروں پر مشتمل ہے جو کہ تمام دوستوں نے ڈاکٹر صاحب کے متعلق تحریر کئے ہیں جبکہ دوسرے حصے میں چند تصاویر کو شامل کیا گیا ہے کیونکہ تصاویر خود بولتی ہوئی تاریخ ہوتی ہیں جبکہ تیسرے حصے میں ڈاکٹر صاحب کی تحریر کردہ کتابوں کے ساتھ ان کی رہنمائی میں منعقد کی جانے والی سالانہ تاریخ کانفرنسوں اور ان کی زیر صدارت شائع ہونے والی سہ ماہی تحقیقی جرنل ”تاریخ“ کے مختلف شماروں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ قارئین جو کہ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتے آئے ہیں وہ اس فہرست سے استفادہ کریں اور اگر ان کی کسی تحریر کو اب تک نہ پڑھ سکے ہوں تو وہ اس کا بھی ضرور مطالعہ کریں۔

میرے لئے یہ انتہائی فخر اور اعزاز کی بات ہے کہ میں ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کا قاری ہونے کے ساتھ اب اس کاوش میں بھی شریک ہو گیا۔ میں ان تمام دوستوں کا مشکور ہوں جنہوں نے ہماری تجویز پر خلوص اور محبت کے ساتھ اس کتاب کے لئے اپنے خیالات کو رقم کیا۔ بیماری خواہش اور دعا ہے کہ ڈاکٹر مبارک مزید ہمت اور استقامت کے ساتھ لکھتے رہیں اور نوجوان نسل کی اسی طرح رہنمائی کرتے رہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

فروری 2013ء

پبلشر کی جانب سے

1988ء کی بات ہے ڈاکٹر مبارک علی صاحب اقبال احمد خان (مرحوم) کے ساتھ مکتبہ فکر و دانش پر تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تین کتابیں جمیل عمر صاحب کو اشاعت کے لئے دیں۔ یہ 1989ء کی بات ہے کہ جمیل صاحب نے یہ کتب اشاعت کے لئے میرے حوالے کر دیں۔ دسمبر 1990ء میں، میں مکتبہ فکر و دانش سے علیحدہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی کتب مکتبہ فکر و دانش سے شائع نہ ہو سکیں۔ مکتبہ فکر و دانش سے علیحدگی کے بعد میں نے تینوں کتابوں کے مسودے ڈاکٹر مبارک علی صاحب کو واپس کر دیئے۔ جب میں یہ مسودے واپس کرنے کے لئے گیا تو ڈاکٹر صاحب ان دنوں گونے انشی ٹیوٹ لاہور سے وابستہ تھے۔ جب تک گلشن ہاؤس کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ یہ کتابیں اب تم چھاپ لو۔ میں نے عرض کی کہ ڈاکٹر صاحب ابھی وقت نہیں جب میں اس پوزیشن میں ہوں گا تو آپ سے مسودے اشاعت کے لئے لے لوں گا۔

1994ء میں، میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے گونے انشی ٹیوٹ گلبرگ گیا۔ پھر میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک کتاب ”شاہی محل“ اشاعت کے لئے لی، اور پھر اشاعت کا ایسا سلسلہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی درجنوں کتب گلشن ہاؤس سے شائع ہوتی رہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور اضافہ ہوا کہ گلشن ہاؤس پر بیٹھے والے دن ادبی علمی محفل کا سلسلہ شروع ہوا یہاں پر ملک بھر سے دانشور حضرات تشریف لاتے تھے۔ ان علمی ادبی محفلوں سے میں نے بہت سیکھا۔ میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ یہ محفلیں میرے علمی ادبی اور تاریخی شعور کو اجاگر کرنے میں سودمند ثابت ہوئیں۔

1998ء میں ڈاکٹر صاحب انڈیا کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہے تھے ان ہی دنوں میں انڈیا پاکستان نے دوستی بس سروں لاہور سے دہلی کا آغاز کیا اور میں نے اس بس سروں کے ذریعہ ہندوستان کا پہلا سفر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سہ ماہی مجلہ ”تاریخ“ نکالنے کا آغاز 1999ء میں کیا۔ جس کو گلشن ہاؤس نے شائع کیا۔ 1999ء سے اب تک سہ ماہی ”تاریخ“ کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا

انٹرویو جو کہ سبیل و نراج نے جنگ اخبار کے لئے کیا تھا، جب وہ شائع ہوا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے انٹرویو کی تعریف کی اور ساتھ ہی ذکر کیا آپ سے بات ہوئی۔ ذکر کیا آپ نے پوچھا ظہور انٹرویو کیا لگا۔ میں نے جواب دیا۔ آپ ڈاکٹر صاحب آخری بات سب سے پہلے کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے سمیت کوئی کتابی اختلاف کرے لیکن یہ تو ج ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ عام آدمی کے لئے لکھی ہے۔ پبلشر ہونے کے ناطے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں نے عام آدمی کو روشن خیالی، نردباری اور قوت برداشت دی ہے۔ جس کا سب سے زیادہ فائدہ سندھ، بلوچستان اور سرانگنی بیلٹ کے لوگوں نے اٹھایا ہے۔

میرا تعلق میداتی گھرانہ سے ہے۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے مجھے بہت ہمت اور حوصلہ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تاریخ پر تحقیق کو ڈاکٹر صاحب کے ہم خیال اور مخالف دونوں حلقے مانتے ہیں۔ ان کی زیر اوارت اب تک سہ ماہی "تاریخ" کے 46 شمارے شائع ہو چکے ہیں اور میں ڈاکٹر صاحب کی 70 سے زائد کتابیں اردو اور انگریزی میں شائع کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی بچوں کے حوالے سے تحقیقی کتب "تہذیب کی کہانی" اور "قدیم ہندوستان" کو بہت سراہا گیا ہے۔

ظہور احمد خان

مارچ 2013ء

جرمنی کی یادیں

ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ احمد

مبارک علی سے میری دوستی 1972ء میں اس وقت ہوئی، جب انہوں نے جرمنی کے شہر بوخوم کی روہر یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں داخلہ لیا تھا۔ جرمنی کے نامور پروفیسر اے۔ آر۔ یو سے جو عربی اور اسلامی تاریخ کے پروفیسر تھے، اور اورینٹل اسٹڈی کے صدر تھے، وہ ان کے سپروائزر ہوئے۔ جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے سپروائزر کو ڈاکٹر فادر (Vater) یا ڈاکٹر فادر کہا جاتا ہے، وہ اپنے طالب علموں کے ساتھ باپ کی طرح کا شفقتانہ سلوک کرتے ہیں۔ مبارک علی کے لئے انہوں نے وظیفہ کے لئے کئی اداروں کو لکھا، اور ان کی سفارش پر انہیں سوشل ڈیموکریٹک (Social Democratic) پارٹی کی جانب سے فریڈریش ایبرٹ فاؤنڈیشن کا وظیفہ ملا۔

پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علموں کو تھیسس لکھنے سے پہلے مختلف کورسز لینا ہوتے ہیں۔ ان میں اول تو تحقیق سے متعلق کورس ہوتا ہے۔ اس کے بعد دو مضامین دوسرے شعبوں سے لینا ہوتے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علم کو ایک کلاسیکل زبان سیکھنا لازمی ہوتا ہے۔ مبارک علی نے لاطینی کی جگہ عربی زبان کا مطالعہ کیا، اور فارسی زبان کو اپنے موضوع کی مناسبت سے سیکھنا پڑا۔ اس طرح اس نے عربی، فارسی، جرمن اور انگریزی زبانوں میں دسترس حاصل کر لی۔

مبارک نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مغل دربار اور اس کی رسومات کا انتخاب کیا۔ مقالہ کی تحقیق کے سلسلہ میں بنیادی فارسی کے ماخذوں کا مطالعہ کیا۔ یہ کتابیں روہر یونیورسٹی نے جرمنی کی دوسری لائبریریوں سے منگا کر دیں۔ مخطوطات کے مطالعہ کے لئے وہ لندن میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری گئے۔ جرمنی میں تحقیقی مقالہ میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اس میں موضوع کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ ہو اور بجنل خیالات کے ساتھ اسے لکھا جائے۔ تحقیق کا یہ سلسلہ 1972ء سے 1976ء

تک رہا۔ مبارک نے اپنے تھیمس میں مغل و بار کی رسومات اور آداب کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ ان کے ذریعہ بادشاہ اپنی رعایا سے تعلق پیدا کرتے تھے اور ان میں وفاداری کے جذبات کو ابھارتے تھے۔ تہوار، جلوس، اور شادی دہ بد کے مظاہر لوگوں میں بادشاہ کا رعب قائم کرتے تھے۔

پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کی تکمیل کے بعد، اس کا دفاع فیکلٹی آف آرٹس کے پروفیسرز کے سامنے کرنا ہوتا ہے، جو ایک گھنٹہ تحقیق کے موضوع اور آدھ آدھ گھنٹے دوسرے دو مضامین پر سوالات کرتے ہیں۔ اس کے بعد نتیجہ کا اعلان کیا جاتا ہے، اور امیدوار کو عارضی شوقیٹ دیا جاتا ہے، ڈگری اس وقت ملتی ہے جب تھیمس کو شائع کر دیا جاتا ہے۔ مبارک نے اس مرحلہ کو کامیابی سے پورا کیا، اور اعزاز کے ساتھ امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

جرمنی کی یونیورسٹی میں یہ رسم ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے امتحان میں کامیابی کے بعد جشن منایا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے امیدوار کے لئے نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے کہ امیدوار تحقیق کے حربوں سے آراستہ ہو کر اب اپنے میدان میں اور زیادہ بہتر کام کرے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر فائز کو اپنے ڈاکٹریٹ کے طالب علم پرفر ہوتا ہے کہ اس نے تحقیق کے سلسلہ میں ایک اور امیدوار کو تیار کر کے علم کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ تحقیق کے اس تجربہ کے بعد، نئے ڈاکٹر کو آزادانہ طور پر نئے خیالات و نظریات اور توانائی کے ساتھ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ اس ذریعہ سے تحقیق کے طریقوں کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور یہ سلسلہ ایک ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ جو تحقیق کے میدان میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔

مبارک کے پانچ سال، جو اس نے یونیم میں قیام کیا، اس دوران اسے موقع ملا کہ دھڑ کے علاقہ اور اس کی تاریخ سے واقفیت حاصل ہو، یہ علاقہ اپنی کونکے کی کانوں کی وجہ سے مشہور تھا، اور بعد میں اپنی صنعت کی وجہ سے آکریس کا مشہور کارخانہ اس کے ایک شہر ایسن (Essen) میں تھا۔ جس نے اسلحہ بنانے میں شہرت حاصل کی تھی۔ یہ علاقہ مزدوروں کی تحریک کی وجہ سے بھی اہم تھا یہاں مزدور یونین کی جانب سے ہسپتال تھا، اور دیگر سہولتیں تھیں، اس کے علاوہ یہ علاقہ دریائے روہر کی وجہ سے سرسبز و شاداب ہے اور جو کارخانوں اور ان کی آلودگی کے باوجود، اس کی فطری خوبصورتی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جرمن یونیورسٹیاں بائیس بازو کی سیاست کا گڑھ تھیں۔ ویت نام کی جنگ کے خلاف طلباء مظاہرے کرتے تھے، تقریریں ہوتی تھیں اور امریکی سامراجیت کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔

جب جرمنی میں بائیس بازو کی سیاست کمزور ہوئی ہے تو اس کے سابق طالب علم راہنما بعد میں گرین پارٹی میں شامل ہو گئے، جس نے جرمنی کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں کئی نشستیں حاصل کیں، اور حکمران پارٹی کا حصہ بھی رہے۔ میرا خیال ہے کہ مبارک نے جرمنی کی اس سیاسی تبدیلی اور اتار چڑھاؤ سے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔

اپنی تحقیق اور پڑھائی کے باوجود مبارک نے دوستوں کے ساتھ اپنے تعلقات برکھے اور سماجی سرگرمیوں میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ ہم اکثر یونیورسٹی کے کیفیریا میں لُچ یا شام کے کھانے پر ملتے تھے۔ یہ کیفیریا اس قدر وسیع تھا کہ اس میں بیک وقت 25 ہزار طالب علم کھانا کھا سکتے تھے۔ وہ اکثر دوستوں کو اپنے ہاسٹل بھی بلا لیتے تھے جہاں تاریخ اور سیاست پر گرم بحث و مباحثہ ہوتا تھا، اور ہم سب ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا کہ میں خود بھی اپنے ڈاکٹریٹ کے لئے فزیا لوجی میں، جو میڈیسن کی فیکلٹی تھی، وہاں کام کر رہا تھا۔ روہر یونیورسٹی میں میڈیسن، آرٹس، نیچرل سائنس کی بلڈنگیں ایک دوسرے کے قریب قریب تھیں۔ ڈاکٹر ایچ۔ جی۔ حیدر بھی اس زمانے میں بائیولوجی کے شعبہ میں گھیلیوں کی پیداوار پر تحقیق کر رہے تھے۔ اس وقت ہم پی۔ ایچ۔ ڈی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔

یونیورسٹی میں سوشل سائنسز، نیچرل سائنس اور میڈیسن کی بلڈنگوں میں علیحدہ علیحدہ شعبے تھے۔ مثلاً سوشل سائنس یا آرٹس کی بلڈنگ میں تاریخ، میوزک، اور آرکیالوجی کے شعبے تھے۔ اس طرح سے یونیورسٹی کے شعبے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، اور یہ موقع دیتے تھے کہ سارے طالب علم اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے شعبوں میں ہونے والی تحقیق سے بھی واقف ہوں، یہ مواقع سیمینار کے ذریعے ملتے تھے، اور طالب علموں کو وسیع تناظر میں دوسرے مضامین سے آگاہی ہوتی تھی۔ اکیڈمک بحث و مباحثہ میں آزادی رائے کا حق حاصل تھا، جس کی وجہ سے طلباء میں نئے نظریات و خیالات کو بحث میں لانے کا پورا موقع ملتا تھا۔ اس ذہنی کاوش سے طلباء تحقیق کے حربوں سے مسلح ہو کر جب عملی زندگی میں داخل ہوتے تھے تو انہیں کامیابی حاصل ہوتی تھی اور وہ معاشرے کی ترقی اور فلاح کے لئے کام کرتے تھے۔ جرمن یونیورسٹی کا یہ ماڈل تھا کہ جسے امریکہ میں جان ہاکسنس اور شکاگو یونیورسٹیوں نے اختیار کیا اور بعد میں امریکہ کی یونیورسٹیاں اس ماڈل میں دخل کر تحقیق اور نظریات کی پیداوار کا مرکز بن گئیں۔

مجھے جب بھی اپنی ڈاکٹریٹ کی تحقیقات سے فرصت ملتی تھی، تو میں مبارک کے پاس اس کے ہاسٹل چلا جاتا تھا، جو یونیورسٹی اور میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بعد میں جب وہ شادی شدہ فلیٹ

میں منتقل ہوئے تو پھر ہماری بیٹھک وہاں ہونے لگی۔ جب وہ غیر شادی شدہ تھا تو اس نے کھانا پکانے کا ایک سادہ طریقہ دریافت کر لیا تھا۔ وہ دال کو چوبھے پر چڑھا کر اس میں پیاز، ٹماٹر اور دوسرے مصالحے ڈال دیتا تھا اور یہ دال آہستہ آہستہ پک کر تیار ہوتی تو ہم سارے جرمن برادریوں یا چادلوں کے ساتھ کھاتے تھے۔ اس کا ڈانٹہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ دال کے تیار ہونے تک ہماری بات چیت اور بحث جاری رہتی تھی۔

میں نے مبارک سے ان ملاقاتوں اور بات چیت میں تاریخ کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ یہ بحثیں یا سیمینار جو مبارک کے ساتھ ہوتے تھے، ان کی خوشگوار یادیں آج بھی میرے ساتھ ہیں۔ ان بحثوں کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ ہماری تاریخ کو کس قدر مسخ کیا گیا ہے اور حقائق کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس نے اس کو واضح کیا کہ درحقیقت یہ عوام کی طاقت اور توانائی ہوتی ہے جو تاریخی عمل کو آگے بڑھاتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں عوام تاریخ کو بنانے والے ہیں، وہ تاریخ کے دھارے کو آگے چلاتے ہیں۔ اب تاریخ کا مضمون فلسفہ کی طرح سے نہیں ہے، بلکہ اس میں فلسفہ، ادب، عمرانیات، علم بشریات، اور نفسیات بھی شامل ہو گئے ہیں جنہوں نے اسے ایک نئی زندگی اور توانائی دی ہے۔

جب ذکیہ بھابھی جرمنی میں آئیں، تو مبارک شادی شدہ فیملی اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے جو یونیورسٹی کے جہاں میں رہتا تھا، زیادہ دور نہیں تھا۔ یونیورسٹی کا ایک پل کے ذریعہ یونیورسٹی کی لائبریری، اور دوسری عمارتوں سے ملایا گیا تھا۔ ان عمارتوں میں یونیورسٹی کی انتظامیہ کا آفس، آڈیٹوریم، اور ایک وسیع و عریض میزا (Mensa) یا کینے پیر یا تھا اور اس کی چھت پر کافی دچائے کی جگہ۔ جہاں سے یونیورسٹی کے ارد گرد پھیلے سرسبز و شاداب جنگل نظر آتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں جب سورج نکلا ہو تو اس کی چھت کی کھلی فضا، تازہ ہوا طلباء کو تازہ دم کر دیتی تھی۔ یونیورسٹی کی عمارتیں ایک دائرے میں تھیں۔ جن میں آرٹس، انجینئرنگ، میڈیسن اور انجینئرنگ کے شعبہ جات تھے، جوان علوم کی ہم آہنگی کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت یونائیٹڈ گارڈن اور اسپورٹس کا سینٹر تھا۔ اس پورے منصوبے کے تحت یونیورسٹی کا مقصد طلباء کی فنی، جسمانی اور جمالیاتی تربیت کرنا تھا۔

یہ نوجوان جوڑا کیپس میں ایک نئی تازگی اور خوشگوار تہذیبی لایا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہر کہانی کے پس منظر میں عورت کا حصہ ہوتا ہے۔ سو یہ مبارک کے ساتھ بھی ہوا۔ ذکیہ بھابھی کو کیپس کی زندگی اور ماحول میں عادی ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور وہ بہت جلد اس کی عادی ہو گئیں۔ جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علموں میں شادی کا رواج بہت زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ فرد کی تخلیقی

ڈینیٹنگ سوسائٹی



(بینٹے ہوئے دائیں سے دائیں) مبارک علی خاں، اے۔ کے عزیز، عابد عباس (پرنسپل) منظر اکبر، اکبر (کھڑے ہوئے دائیں سے دائیں) ظفر مسعود، عبدالسلام قریشی، عاقل، انعام اللہ

سٹی کالج سٹوڈنٹ یونین



(بینٹے ہوئے دائیں سے دائیں) سید مسرور الحسن، مرزا عابد عباس، عثمان علی خان (کھڑے ہوئے دائیں سے دائیں) امان الرحمن، مشتاق احمد، رمضان احمد، ملازم حسین بلوچ، مبارک علی خان



تاج محل میں



شیر میں ٹیلی کے ساتھ



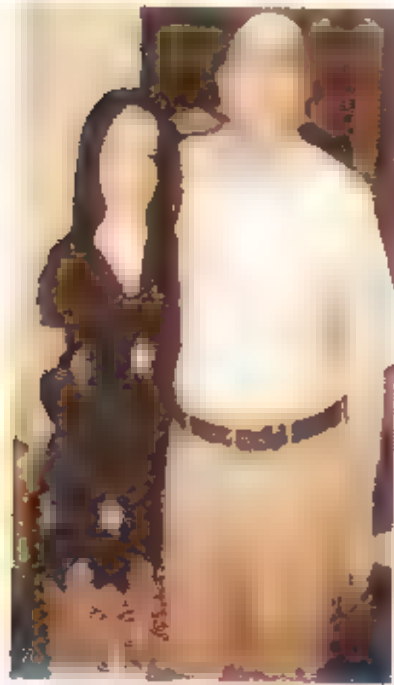
کے پاس تاج محل میں تقریر کرتے ہوئے



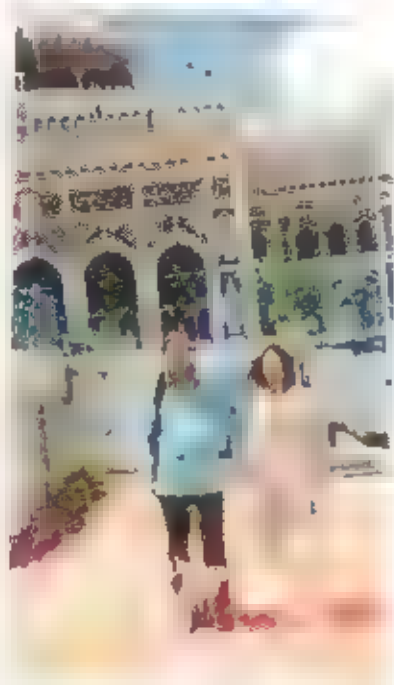
کے پاس تاج محل میں تقریر کرتے ہوئے



کے پاس تاج محل میں تقریر کرتے ہوئے



میں تاج محل کے ساتھ



نیشنل آف ایجوکیشن کی مام پانڈا پر



دلائے، مدد سے اجاڑتے ہوئے



دہلی میں ہونے والی سہ ماہی کانفرنس میں پرو فیسر امریت گنگوے ساتھ



دہلی میں دلوائے، مدد اور دیگر دستوں کے ساتھ



پرو فیسر ہریش گھیل، راجیو مہجوا کے ساتھ



کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے



دلائے لہجہ کے ساتھ



قلم ختم در اورنگ کے ساتھ



اساتذہ کرام اور طلبہ کے ساتھ



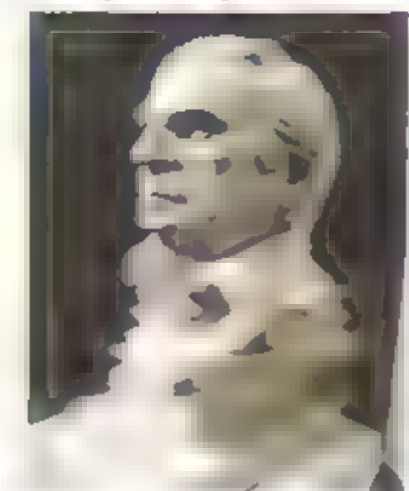
اسم گورداسپوری کے ساتھ



اساتذہ کرام



اساتذہ کرام اور طلبہ کے ساتھ



اساتذہ کرام

صدا جیتوں کو، بھرنے میں روناں کا اہم کردار رہا ہے۔ اب ہمارا تجرباتی کھانے کا سلسلہ تقریباً ختم ہو اور یہ ذمہ داری ذکیہ بھابھی نے سنبھال لی۔ اب ہمیں بحث و مباحثہ کے لئے اور زیادہ وقت مل گیا، میں نے ایک طرف تو مارکس کے نظریات کے بارے میں اپنے جرمین دوستوں سے بہت کچھ سیکھا، تو دوسری طرف مہارک نے مغل بادشاہ اکبر کے نظریات اور اس کی رہنمائی تحریک سے مجھے روشناس کرایا۔ مجھے ہمیشہ سے یہ تجسس رہا کہ اچین میں علم و ادب کی بارش کے کچھ قطرے کیوں نہ ہندوستان کی سرزمین کو سیراب کر سکے، جیسا کہ انہوں نے یورپ کے نظریات کو آیا کر کیا۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ کونئی ذرائع نہ تھے کہ جوان کے درمیان راستوں کو پیدا کرتے اور انہیں آپس میں ملاتے۔ افسوس ہے کہ یہ محرومی سچ بھی مسلم دنیا اور پاکستان میں جاری ہے۔ مجھے ایک وقت چھی طرح یاد ہے کہ ہمیں بونم شہر کی جانب سے یکم ماڈے فینسیوں میں دعوت دی گئی کہ ہم وہاں اپنے ہاٹل کے اشال لگائیں یہ فینسیول ہر سال تین دن کے لئے منعقد ہوتا ہے۔ جس میں مختلف ملک سے تعلق رکھنے والے اپنے کھانوں کے اشال لگا کر انہیں مناسب قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔

اس موقع پر پاکستان، بنگلہ دیش، ورائیڈ کے طلباء نے فیصلہ کیا کہ وہ کھانے کا مشترکہ اشال لگائیں گے۔ سمے یہ کھانا میز کے باورچی خانہ میں پکایا جو کہ تنہا ہی جدید چاہوں اور پلانے کے برتنوں سے آراستہ تھا۔

پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈیا کے کھانوں کا یہ سٹا فینسیوں میں بڑا کامیاب رہا۔ ذکیہ بھابھی اور خاندان نے اشال پر پیسوں کا حساب رکھا۔ اس اشال کو لگانے میں تینوں ملکوں کے طلباء نے برابر کا حصہ لیا، بنگلہ دیش کے شبیر نے اس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔

ہمارے کھانوں کو لوگوں نے پسند کیا، اور کھانے کے ساتھ جرمنوں نے پیر کے جام پر جام چڑھائے۔ ہمارے کھانے کی تعریف میں مقامی خبروں نے بھی خبریں لگائیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اشال جو تین ملکوں کی جانب سے لگایا گیا، یہ ایک مشترکہ کلچر کی نمائندگی کر رہا تھا، اور جرمنوں کو پیغام دے رہا تھا کہ ان تینوں ملکوں کا مشترکہ کلچر کس قدر توانا ہے۔ جب ہم غیر ملک میں جاتے ہیں تو تینوں ملکوں کے لوگ ایک ہو جاتے ہیں، مگر جیسے ہی یہ واپس جاتے ہیں، پھر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب انسانی رویہ ہے کہ حس کا تجربہ کرے کی ضرورت ہے۔ برصغیر ہندوستان آزاد تو ہو گیا ہے، مگر اس آزادی کی قیمت اس نے تقسیم کی صورت میں دینی ہے۔ اس کی قیمت ہم تینوں ملک غربت و افلاس کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ تینوں ملکوں کے باہمی تعلقات در



... میز پر...



حسن قبیل کے ساتھ



یوب ملک اور تصیف کے ساتھ

[illegible]

قول "رہنڈ ٹوانس بی" "فردوس سائی میں نسائیت کی تربیت پاتا ہے" اقرب مہاراج کے مراد سے
- یہ بالکل تفسیر کی طور پر توقعات کا بڑا لینڈ اور ریاست نوشہرہ کے نام اس وقت تیار رہیں یا اس
میں شامل ہو جائیں تو ہم نسائیت کے درجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

۱۹۷۶ء میں جب شہر کامیونہ آیا تو مبارک کے لئے پلی-ایچ ڈی کرنے کے بعد سندھ یونیورسٹی
 لاہور جانے کا وقت آ گیا کہ جہاں سے وہ انڈی پر جرنی آئے ہوئے تھے۔ اُن چہلے کی مدد سے
 یہ سٹوڈنٹ کی پیش کش تھی مگر اس سے اپنے مہر نامہ لا کر قرار دیتے ہوئے اس نے انکار کیا اور یہی
 فیصلہ کر لیا۔ جب مبارک اور ڈوکیہ بھی لے کر واپس آئے تو اس وقت وہ اکیلا تھا، اور ایک سوٹ کیس کے ساتھ آیا
 تھا۔ اس نے اس کے پاس ڈکٹریٹ کی ڈگری سمیت سائنس کیس، کتابوں کے
 نسخے، پیرچر، ایک سال کی عطیہ اور دو ماہ کی شہلا بھی۔ جس کا شہلا نام میرا رکھا ہوا تھا۔ میں عطیہ کو
 سب سے زیادہ یاد کرتا تھا۔ جب بھی ۱۰ دنوں کیس جاتے تھے۔ جب مبارک وراہیدہ بھی عطیہ کو یہیے

میرے پارٹنرٹ میں آتے تو وہ میرے ساتھ اور زیادہ رہنا چاہتی تھی، اور جانے سے انکار کرتی تھی۔ جب کسی فرد کو بچے اور کتے پسند کریں تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں کوئی دلکشی ضرور ہے۔

یہ اتفاق ہے کہ جب مبارک اور یہ بھی نے جوخم چھوڑا ہے تو میں اپنی شریک حیات رافہہ کے ساتھ وینہ آیا۔ یہ 1976ء واقعہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ سفارتی تبدیلی تھی، اس جوڑے نے مجدد بننے والی۔ رافہہ مبارک اور اکیہ بھی کے بارے میں بہت کچھ نہ تھا، جب کہ وہ جوخم میں 9 سال تک رہیں، مگر آخر کار 1976ء کے خاندانوں کا کرچی میں ملنا ہوا جب میں نے آغا خان یونیورسٹی کی پیش کش کو 1985ء میں قبول کیا، بعد ازل دعوایں کے کراچی چلا آیا۔ رافہہ ذکیہ بھی اور مبارک سے پہلی مرتبہ کراچی میں بیٹیں۔ فیصل اور سمیرہ کی عطیہ ور شہرہ سے دوستی ہو گئی، یہ جوخم کے رہنے والوں کا ایک چھوٹا کلب ہو گیا۔

مبارک سے میری اس بات پر کافی بحث ہوئی کہ آخر میں نے کیوں ایک طویل عرصہ جرمنی میں رہنے کے بعد آغا خان یونیورسٹی کی پیش کش کو قبول کیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جنوبی ایشیا کا پہلا میڈیکل کالج ہے کہ جہاں بی۔ ایچ۔ ڈی اور تحقیق کے مواقع ہیں۔ اس لئے اگر اس کے ساتھ مل کر جو کہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری کے لئے پڑھتے ہیں، اگر انہیں سائنسدان بننا میں تو یقیناً اس کا ثراں بنی قیام۔ ایٹ۔ وک۔ اس سے میرے یہ موقع تھا کہ میں جرمن یونیورسٹی کے ڈال پر یہاں تحقیق کا دورہ کروں اور سب مہموں میں اس عمل کو آگے بڑھاؤں کیونکہ اس کی اس وقت بھی ضرورت تھی کہ جب میں آیا تھا ورکنگ بھی ہمیں ایک تحقیقی میدان مل ادارہ کی سخت ضرورت ہے۔

اس کے بعد سے آج تک ہم تقریباً روزیہ ہر ہفتہ اکیڈمک یا دوسرے مسائل پر آپس میں بحث و مباحثہ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ ایک دلچسپ موضوع ہے کہ ہم نے ماضی میں کیا کیا، اور اب مستقبل کے سے ہمارے کیا منصوبے ہیں۔ زندگی ایک رنگ کا قلمونی عمل ہے۔ لہذا ہم نے جو فیصد کیا، اس میں ایک مشرک چیز نظر آتی ہے کہ دوبارہ سے اس آکر اپنے معاشرے کے نئے کچھ کیا جائے، اور جو علم حاصل کیا ہے اس میں یہاں کے نوجوانوں کو شامل کیا جائے۔ ہم نے زندگی کے راستوں کو منتخب کرتے ہوئے، سیدھے اور پُرچ راستوں کا انتخاب کیا۔

اپ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مبارک نے جو سفر 1976ء سے شروع کیا تھا اب تک جاری ہے اس کا خزانہ یہاں ہے۔

وطن کے اس ہاسی کی واہسی، جو کہ تعلیم اور تحقیق کے نئے حربوں سے آراستہ ہو کر واپس آیا۔ اس کا جام شور و یونیورسٹی میں خیر مقدم ہونا چاہئے تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے سندھ یونیورسٹی میں

1989ء تک صدر شعبہ اور پروفیسر تاریخ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔

اس دور میں اس نے عوامی تاریخ کے نظریہ کو پاکستان میں روشناس کرایا۔ اگرچہ یہ ایک انہجی تھی مگر یہ مشہور مصوہ روایت کو چیلنج کیا جائے اور حکمرانوں کی تاریخ کی جگہ عوام کی تاریخ کو برسرِ صحنہ لایا۔ یہ قریب کا مقصد ہے کہ نوجوان نسل میں تاریخ کے بارے میں نئے خیالات سے آگاہ ہو۔ اس میں روشن خیالی، خدمات کو پیدا کیا جائے تاکہ وہ جہالت کا تقیدی چارہ لے سکیں۔ اس میں میں ہونے کے بجائے، وہ پوری قوت اور توانائی سے اپنے اس کے ادھروں اور لوگوں کے صدیوں کے خیالات کی میں تاریخی حقیقت کو نہیں ملے گی مگر اس کے نتیجہ میں نوجوان نسل میں جو ہے کہ اس عمل کو جاری رکھا جائے۔ مہارک نے سندھ کی تاریخ کو ایک کے ساتھ مل کر نوجوانوں کو ایک نئی سوچ دی ہے۔ اس کی پہلی کتاب جہاں تک تھی، مگر اس کے موضوع نے لوگوں کو تاریخ کے اس نئے نظریہ کی جانب متوجہ کیا، اور پہلی کتاب کے بعد دوسری کتابوں کو اور زیادہ مقبولیت ملی۔

1984ء میں وہ اکیڈمی بھی، علیہ، شہر، ورنس تار کے ساتھ لہور منتقل ہوئے، تاکہ پاکستان میں سم صوبہ میں روشن خیالی کی تحریک کو مقبول بنایا جائے۔ 1995ء تک وہ گوئے نسی ٹیوٹ، مور کا ڈائریکٹر رہا، اس پوزیشن نے اسے یہ موقع دینے کہ اپنی بات کو وسیع تر حلقے میں روشناس کرے۔ یہاں بھی نئے نئے لیول کے سب علموں کو رد و پڑھانے کے لئے اسکول اور ایک لکچر کالج میں ملازمت کی۔

انہوں نے اپنی پکیوں کی تحقیقی صدیوں کے بعد راہِ علیہ مورخ بن گئی، شہلانے وکات کا پیشہ اختیار کیا، نین تار انے ٹیکسٹائل ڈیزائن میں گریجویشن کی، اور اب وہ مہارک کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ مہارک نے برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں اپنا کردار ادا کر کے روشن خیالی کے نظریات کو فروغ دیا، درخشش کی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں میں ملاپ اور اتحاد ہو، تاکہ اس خطہ میں امن و خوش حالی کی زندگی گزارنے کا ہر فرد کو موقع ملے۔ میں اس کے اس کردار پر سہم پیش کرتا ہوں کہ اس نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ اس کو خوبوں سے نکال کر حقیقت تک پہنچایا۔

خرد افروزی کا مورخ — ڈاکٹر مبارک علی

اسلم گورداسپوری

کبھی کبھی انسان بھی بے فکر و غم نہیں رہتا اور اپنے علم و تہذیب میں بحرِ بیکار بن جاتے ہیں۔ جن کی ذات کا خط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جن کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا آسان نہیں رہتا۔ اس کی شخصیت کا دائرہ کار کئی ایک موضوع اور کئی ایک جہتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ان تمام کو تحریر کے دائرے میں لانا ممکن نہیں ہوتا۔

سقراط نے کہا تھا کہ بڑے انسانوں کے بارے میں مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان کی باتیں آسان ہوتی ہیں مگر ان کو بیان کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ میں انسان کی شخصیت کو عظیم کہہ کر اپنی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی صاحب جن کی ذات کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کے میں مرے میں گرفتار ہوں۔

وہ اس بات کی بھی چارزت نہیں دیتے کہ ان کا فرمانا ہے کہ ایک عظیم انسان ایک قوم یا ایک قبیلے یا ایک گروہ کے لئے تو عظیم ہو سکتا ہے وہ دوسری قوم کے لئے یا قبیلے یا گروہ کے لئے عظیم نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر وہ سکندر کے بارے میں کہا کرتے ہیں لوگ کس قدر جاہل اور غیر متمدن ہیں کہ فاتح اور مفتوح بھی اس کو سکندرِ اعظم کہتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ سکندر اپنی قوم کے لئے تو عظیم ہو سکتا ہے وہ ان لوگوں کے لئے کیسے عظیم ہو سکتا ہے جن کا ملک اس نے تاراج کیا تھا اور ان لوگوں کو قتل کر دیا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ مگر یہ بات صرف جنگجو فاتحین کے لئے کہی جاسکتی ہے۔ اس بات کا اطلاق فنکاروں، شاعروں، مصوروں، ادیبوں، قلم کاروں، فلسفیوں، تاریخ دانوں و درخشاں سڑ مارک علی پر نہیں ہو سکتا۔

تاریخ دانی اور تاریخ نویسی کا انداز ایک بین الاقوامی انداز ہے۔
 تاریخ میں وہ شخص کسی قوم یا کسی قبیلے یا کسی گروہ کی تاریخ نویسی نہیں کرتے۔ لہذا
 ایک علی کا مقام اور شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو حقیقت حال میں انسانی نقطہ
 سے شہرت ملتا ہے۔ اہمیت کوئی شخص کسی قوم اور نہ ہی سے میری بات سے اختلاف کر سکتا
 ہے۔ تاریخ دانی کے اعتبار سے تاریخ میں ہونی وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ہر انسان
 تاریخ میں اپنے اپنے وقت میں رہتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں اس کی قوم اور قید

تاریخ کو نہ تو خشک کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی بے رحم قرار دیا جاسکتا ہے۔
 اس لئے کہ ڈاکٹر مبارک علی نے یہ تاریخ نویسی کو ایک جدید لاتی انداز عطا کر کے تاریخ کے
 قدیم تصور کو ہی تبدیل کر دیا ہے۔ قدیم تاریخ نویسی بادشاہوں کے درباروں کے روزناموں سے
 شروع ہو کر ان روزناموں پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اس قدیم تاریخ نویسی میں اس عہد کی سیاسی
 اور ثقافتی اور تمدنی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ خصوصاً وہ تاریخ نویسی جس مہم کی بھی
 سوانحی تاریخ نویسی میں عوام الناس کو نہ رونا رہیں ہوتا تھا۔

اس لئے کہ ڈاکٹر مبارک علی نے یہ تاریخ نویسی کو ایک جدید لاتی انداز عطا کر کے تاریخ کے
 قدیم تصور کو ہی تبدیل کر دیا ہے۔ قدیم تاریخ نویسی بادشاہوں کے درباروں کے روزناموں سے
 شروع ہو کر ان روزناموں پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اس قدیم تاریخ نویسی میں اس عہد کی سیاسی
 اور ثقافتی اور تمدنی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ خصوصاً وہ تاریخ نویسی جس مہم کی بھی
 سوانحی تاریخ نویسی میں عوام الناس کو نہ رونا رہیں ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی تاریخ نویسی ہر مہم کی ایک مکمل تاریخ ہے ایک مقام سے ایک مقام تک باقیہ تمام
 ہے فلسفہ ہے اور خود افروزی ہے۔

بات خود فروزی کی ہوئی ہے تو یہاں میں ایک بار پھر سترہ کی ہی بات کہہ رہا ہوں۔ تاریخ نویسی کا مقصد
 اپنے شاگرد و پیروں سے گفتگو کرتے ہوئے کہنا تھا کہ انسان کی تاریخ کا جو مطلب ہے۔ یہ ہے کہ انسان
 بات حیات غیر انسانی عمل سے اس کا تعلق ہے۔ اس کا تعلق ہے انسانی وجود سے۔ اس کا تعلق ہے

ہیں۔ یہ طریقہ لوگوں کی سوچ کو بند کرنے کا طریقہ ہے۔

اسی طریقے سے تاریخ کو جب فاتحین کی تاریخ بنایا جاتا ہے اور اس پر جب مذہب کا رنگ
 چڑھا دیا جاتا ہے تو تاریخ نویسی ایک ایسی مذمت کوئی بن جاتی ہے۔ واقعات و حادثات سے باور
 دی جاتی ہے، اور تاریخ نویس سے یہ پیش کن مصومت بن جاتی ہے۔ جبکہ انسانی تاریخ ہرگز
 ایک خوش کن چیز نہیں ہوتی بلکہ تجربات اور حادثات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ انسانوں کی غلطیوں کا پلندہ
 ہوتی ہے۔ بڑی سبق آموز اور عبرت کا مضمون ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے پہلے ہم نے تاریخ کو چار دوسرے انداز میں پایا تھا۔ تاریخ کو ایک گزرا ہوا
 وقت خیال کیا جاتا تھا جس کو ماضی پرستی کہا جاتا ہے۔ تاریخ صرف حکمرانوں کے ہی قصے کہانوں تک
 محدود ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جب ہم بادشاہوں کی اپنی خود نوشت تاریخ پڑھتے ہیں تو اس بات کی
 مکمل تصدیق ہو جاتی ہے کہ تاریخ میں ماضی کی تاریخ نویسی میں عوام کا کوئی اثر و تسخیم نہیں کیا جاتا
 تھا، اور نہ ہی عوام الناس کو اس قابل خیال کیا جاتا تھا کہ ان کا ذکر تاریخ کے صفحات پر مرقوم ہو۔ مسلمان
 بادشاہوں میں بابر بادشاہ کی توڑک بابر میں یا جہانگیری کی توڑک جہانگیری میں اس عہد کے عوام کے
 کردار و عمل کا کہیں کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ اسی طریقے سے پانچ سو سال پہلے بھی عوام نے کردار و کوئی
 اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ہمارے ہاں تو تاریخ کو قصے اور کہانیوں کی شکل میں یا ناول اور افسانوں کی شکل
 میں تحریر کیا جاتا تھا۔ جس طرح عبدالحمید شہر اور شبلی نعمانی کا انداز تاریخ نویسی تھا۔ ان لوگوں نے تاریخ کو
 مذہب بنا رکھا تھا۔ انسانوں کی تاریخ کے بجائے مسلمانوں کی تاریخ کا نام دیا گیا تھا۔ ان کے بعد
 ہمارے ہاں نسیم جازی کو تاریخ دان خیال کیا جاتا تھا۔ جو تاریخ کے ساتھ ایک مذاق تھا۔

عالمی تاریخ میں انسانی جدلیات کی تاریخ نویسی یعنی عوامی تاریخ نویسی کے بانی مولانا
 یزدانی نامن اور ایک ہمسایہ قوم اور ہورڈ وین اور کرسٹوفر لے تھے۔ جنہوں نے تاریخ نویسی کی
 کا یا پلٹ دی تھی۔ تاریخ کو لوگوں کی تاریخ بنا دیا تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر مبارک علی پاکستان میں وہ
 تاریخ دان ہیں جنہوں نے تاریخ کو باقاعدہ زندگی کا مضمون بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر مبارک نے انسانی زندگی کے ہر زاویے پر تاریخ نویسی کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے
 نائن بی کے بقول تاریخ کو صرف ہندو کی شکل میں نہیں رکھا۔ تاریخ کو تیر کی طرح آگے بڑھنے کی شکل
 میں تحریر کیا ہے۔ ان کی کتابوں کے ناموں سے ہی تاریخ کی قوت اور حرکت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور
 تاریخ کو زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

ان کی کتابوں کے نام ہی انسانی ذہن میں ارتقاء پیدا کرتے ہیں۔ آگہی پیدا کرتے ہیں۔ علم اور شعور پیدا کرتے ہیں مثال کے طور پر ان کی کتاب کے نام ہیں ”برصغیر میں مسلمان معاشرے کا امیہ“، ”آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان“، ”تاریخ کا امیہ“، ”تاریخ شناسی“، ”تاریخ اور آگہی“، ”تاریخ کے سنے راویئے“، ”تاریخ اور تحقیق کے نئے رجحانات“، ”گمشدہ تاریخ“، ”تاریخ کے مدتے نظریات“، ”تاریخ اور سیاست“، ”تاریخ کیا کہتی ہے“، ”تاریخ اور دانشور“، ”تاریخ اور مسند تاریخ“، ”تاریخ کی روشنی“، ”تاریخ و رجحان مگر ری“، ”علماء اور سیاست“، ”تاریخ اور عورت“، ”چھوٹ و بگڑ کا ادب“، ”مغل دربار“ یہاں تک کہ انہوں نے ”تاریخ گفت اور ڈکو“ ”نئی زندگی کی تاریخ“ تک کو تاریخ کا حصہ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہی آپ جی ”دور در نظر مباحثے“ اور ”تاریخ سے مکالمہ“ نام کی کتاب لکھ کر تاریخ کو بہت سادہ اور سہل مضمون بنایا ہے۔ پاکستان میں تاریخ کے نام پر یا تاریخ کے حوالے سے کانفرنس منعقد کرنے والی روایت نہیں تھا۔ اس کا سر بھی ڈاکٹر مبارک علی کے سر ہے کہ انہوں نے ماہور، مگر جی۔ سید آغا، حیدر آباد اور پاکستان کے مختلف شہروں میں تاریخ کے حوالے سے کانفرنسوں کا سلسلہ جاری کر کے تاریخ کے مضمون کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ کیا۔

حالی میں انہوں نے کرچی میں عورت اور تاریخ کے حوالے سے کانفرنس کر کے تاریخ میں خواتین کے کردار کو تاریخی عظمت عطا کی ہے جو پاکستان میں خواتین کے تاریخی کردار کی پہلی کاوش کہی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ حسب کا ممبر، طاہرہ بینہ ابوالقاسمی علم نگارہ ہے۔ یورپ کے ممالک میں تاریخ پر متنوع انداز میں بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر مہارک علی نے ایک باقاعدہ شعوری کوشش کے ساتھ پاکستان میں تاریخ کو وہی مقام دیا ہے جو مقام مہندہ تاریخ کو ترقی یافتہ اقوام میں دیا گیا ہے۔ انہوں نے پاکستان میں تاریخ کا جزو بنال کر پاکستان میں تاریخ نویسی کو عوامی سطح کے برابر کر رکھا ہے۔ جس کو سماجی تاریخ نمبر کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ جس کے آج تک تقریباً 46 جزیل آچکے ہیں۔ جس میں پینتالیس نمبر "تاریخ اور عوام" کا خصوصی شمارہ ہے پناہ، اہمیت کا حامل شمارہ ہے۔ انہوں نے تاریخ اور عوام جزو شائع کرنے کے بعد تاریخ اور عوام کانفرنس بھی منعقد کی۔ یہ کانفرنس اپنے عنوان اور پے مضمون کی ایک واحد اور منفرد کانفرنس تھی۔ عورت اور تاریخ کی طرح۔۔۔ "تاریخ اور عوام" کانفرنس میرے علم کے مطابق پاکستان میں پہلی ایسی تھی دہلی کانفرنس تھی جو تاریخ کے حوالے سے عوام کے کردار و عمل کے بارے میں دیکھنے میں آئی تھی۔ ان تمام نئی باتوں کو بھی کرنے کے موجودہ پاکستان کی

تاریخ میں ڈاکٹر مبارک علی ہی ہیں۔

یورپ کے ممالک میں تاریخ پر بہت کام کیا گیا ہے۔ یورپ میں عالمی تاریخ انگریزی زبان میں تحریر کی گئی تھی۔ جس زبان سے شیلی قوام کی بہت کم تعداد وقف تھی۔ پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں ردہ زبان میں تاریخ کا شائع کیا جانا، شہداء کٹر مبارک حق جیسے مفکر، مفکر سفر و راندش و تاریخ دان کا ہی کام تھا۔

”تاریخ و عوام“ کانفرنس پنہنی الفاظ میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت جامع انداز میں کہا تھا کہ ایک طویل عرصے تک تاریخ پر مل افتد اور حکمرانوں طبقوں کا تسلط رہا ہے جس کی وجہ سے عوام کو اس سے خارج رکھ گیا۔ موجودہ دور میں تاریخ میں ان گم شدہ عوام کی اہمیت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان گم شدہ لوگوں کو وہاں تاریخ میں لانے کے لئے مہارتوں کو بھروسہ پر جہد کرنی چاہئے۔ اور تاریخ کے ان ماضیوں کو تلاش کرنا ہوگا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر مہارک علی عوام کو تاریخ کے ماضی قرار دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب س تمام محنت و عرق ریزی اور نسان پرستی اور عوام دوستی کی دانش و فکر سم پر ثابت کرتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی ایک دانش ور و تاریخی دن ہوئے کی حیثیت سے خود ایک درے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ذات باقاعدہ ایک نسلی یوشن ہے۔ وہ اپنی ذات میں تاریخ اور علم و ادب کے ایک معمم ہی نہیں ہیں بلکہ ایک مکتب اور ایک اسکول - ف تھت ہیں۔ ایک مدرسہ ہیں بلکہ ایک کالج اور یونیورسٹی ہیں۔ ایک سنجیدہ فکر انسان ہیں اور بڑے منظم انسان ہیں۔

وہ ایک راستہ کو درحقیقی انسان ہیں۔ میں ان کو حقیقی انسان (Rational) ریشٹل انسان کے معنوں میں تحریر کر رہا ہوں۔ وہ بہت عمدہ آدمی ہیں۔

وہ اپنے تعلقات میں اپنے میل مدد میں اپنی گفتگو میں اپنے مراسم میں بہت صاف بہت سنجیدہ اور بڑی سادگی کے حامل ہیں۔ وہ اپنے تعلقات میں کسی قسم کی کوئی بناوٹ و رمدوٹ نہیں رکھتے۔ اس معاملے میں وہ بہت معصوم انسان ہیں۔ وہ دنیا داری اور عام لوگوں کی ہیرا پھیری سے بالکل منزہ انسان ہیں۔ کسی قسم کی ریا کاری کا ان کی ذات میں شائبہ تک نہیں ہے۔

ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان سے ملنے والا ہر انسان راست گو ہو۔ دوسرا وہ جس طرح تاریخ کے بارے میں سیاست کے بارے میں علم و ادب کے بارے میں فکر و فلسفہ کے بارے میں انسانی مبادیات کے بارے میں خود سوچتے ہیں دوسروں کو بھی بتاتے ہیں کہ انہی کی طرح سوچیں اور انہی کی طرح بات

کریں۔ یہاں آکر ان کا لوگوں کے ساتھ کچھ اختلاف یا لگاؤ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں وہ غلط ہرگز نہیں ہیں۔ مگر ان کی ذات کا ایک ایکسپشنل ہونا ایک مخصوص نوعیت کا حامل ہونا ہے۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات ہر انسان میں ہرگز نہیں ہوا کرتیں۔

ڈاکٹر صاحب جی جیسی شخصیتیں اپنی ان اعلیٰ خدا داد یا فطری خصوصیات کی وجہ سے زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے علم و مقام، حکمت و فلسفہ اور بود و باش میں فطری اعتبار سے خود کفیل ہوا کرتی ہیں۔ جبکہ مابوہوں و زندگی کے معاملات میں بڑی صحیح تفریق کرنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں اور طالب علموں کو اس صحیح تفریق کی اجازت نہیں دیتے۔ بلکہ اجازت ہی نہیں ان کی صحیح تفریق کو گوارا نہیں کرتے۔ جس نوجوان سے ڈاکٹر صاحب سے بدنامی کا حال ہے۔ ڈاکٹر صاحب جیسے لگ جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ کچھ لوگ ڈاکٹر صاحب کے مخالف بھی ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ عادت بالکل نہیں سو فی صد سقراط سے ملتی جلتی ہے۔ اینٹینئر کے تمام قابل ذکر طبقوں کے نمائندہ لوگوں سے سقراط کا خدو و خشن کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ان کے خون کے پاتے سے مل گئے تھے۔ اس قسم کی صورت و حالت میں فطرت کے پیچھے وہ بھی "گلا کون" نے سقراط سے کہا کہ آخر تم شخص کو پناؤن دیوں یا بیٹے ہو۔ فطرت سقراط کا شرارتی کایہ پیچھا بھی لگا کون ایک نام نہاد قسم کا سیاست دان تھا ایک نوڈی قسم کا سیاست دان تھا۔ ہر اقتدار حکومت میں شریک رہتا تھا۔

سقراط کا جواب تھا کہ لوگ حقائق سے منہ چراتے ہیں، حقیقت سے خوف کھاتے ہیں۔ علم و تجسس، تحقیق، عمل سے عاری ہیں۔ اس کا علم ان کی مصومات بے معنی ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ میں ان کی زندگی کو بامعنی اور بامقصد دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان عالموں کی مکاری اور عیاری کا پردہ چاک کرتا ہوں۔ یہ میرے حریف ہو جاتے ہیں۔

یہ بے مقصد اور بے عمل زندگی گزارتے ہیں۔ یہ جگتے سوگ بھی سونے سوتے ہیں۔ سقراط بے شعور انسان کو سوسا ہوا انسان خیال کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں ان سے بولے لوگوں کو جگانا چاہتا ہوں۔ میں بھڑکھٹی کی طرح اپنے ذہن سے ان کے حسوں پر ڈنک مارتا ہوں۔ یہ سست پست نہ سمجھتے ہیں اور مجھے پتی۔ شعوری جس کا نام یہ نیند دیتے ہیں اس میں فعل ڈالنے والا گردانتے ہوئے میرے حریف ہو جاتے ہیں۔

گلا کون نے کہا کہ تم ایسا کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ سقراط نے کہا ایسا کرنا میری فطرت کا یہ

ہے۔ میں غیر فطری انسان نہیں بن سکتا کسی طریقے سے ڈاکٹر صاحب جی صاحب جب فطریہ پاکستان قائد اعظم اور علامہ اقبال پر اپنے تاریخ و فلسفہ کی تحقیق کے مطابق بات کرتے ہیں۔ یا مذہب سے بولنے سے کوئی بات کہتے ہیں تو تمام لوگ اپنی پسند و عقیدہ بناتے ہوئے ہوتے ہیں جن کو تاریخ افکار کہا جاتا ہے۔ جو ایک ہی جگہ پر ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

یادیے لوگ جو معاشرے میں کسی تبدیلی کا شعور نہیں رکھتے وہ ان سے اتفاق نہیں کرتے۔ اب اس میں ڈاکٹر صاحب کا کیا قصور ہے جبکہ تبدیلی ہی انسانی زندگی کا اصل محرک ہوتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ڈاکٹر صاحب خود کو عقل کل خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک بار تحریر کیا تھا کہ تاریخ سے انسان کچھ نہیں سیکھتا۔ ان کا یہ خیال اس عام رویے کے مطابق تھا کہ انسانی تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس بات کی خود ہی اصلاح کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ

یہ نہیں ہے کہ لوگ تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے انہوں نے کہا تھا کہ تاریخ کے بغیر مستقبل کے سفر کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام باتیں میں ڈاکٹر کی محبت میں تحریر کر رہا ہوں۔ ورنہ میں اس کا کوئی حقیق نہیں ہوں۔ میں ان کا ایک طالب علم ہوں ان کے ساتھ محبت کرنے والوں میں سے ہوں۔ تاریخ چونکہ ماضی کی ہی داستان ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب ماضی کو سرے سے زبردست کرتے مگر وہ ماضی کو انسانی تجربات کا انچور رکھتے ہوئے مستقبل کی بات کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "تاریخ کی آواز" میں کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو قومیں ماضی کے بوجھ سے آزاد ہوتی ہیں وہ آگے کی جانب دیکھتے ہوئے تیزی سے ترقی کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پیش نظر تابناک مستقبل ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کرتی ہیں۔

ان کے مقابلے میں جو قومیں ماضی سے لگاؤ رکھتی ہیں۔ وہ ماضی کی شان و شوکت میں کھوئی رہتی ہیں۔ وہ مستقبل کی جانب نہیں دیکھتیں۔ وہ اپنی تمام توانائی ماضی کی تکلیف میں ضائع کر دیتی ہیں۔ وہ آیات سے علیحدہ نہیں ہوتیں۔ ان کوئی ایجادات تخلیق کرنے کا خیال نہیں آتا۔ یہ تحقیق کے بجائے تقلید میں غلط رہتی ہیں۔ ان کی زندگی کا فانی اور قدیم روایت کے درمیان تضاد رہتا ہے۔

اس کی مثال وہ امریکہ کے صدر ٹامس جیفرسن کی اس بات سے دیتے ہیں کہ امریکہ کے زمانہ حال کو ماضی سے اس طرح آزاد دھونا چاہئے جس طرح امریکہ جغرافیائی طور پر یورپ سے علیحدہ ہے۔

اس نے ماضی کے بارے میں کہا تھا کہ مردہ لوگوں کو یہ اجازت نہیں دینی چاہئے کہ وہ زندہ لوگوں پر حکومت کریں۔ یہی لئے ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ماضی صرف استحصانی طبقوں کے لئے شائد رہ سکتا

ہے۔ زیر دست طبقوں کا ماضی نہ تو شاندار ہوتا ہے نہ ہی خوشگوار ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے مورخ کی بات کی مثال دیتے ہوئے تحریر کیا جس نے کہا تھا زمانہ حال کو ماضی سے دور رہنا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں جب قومیں اپنے مروج پر ہوتی ہیں تو اعلیٰ اقدار پر وان چڑھتی ہیں۔ مذہب، راسخوں میں پستی کی طرف گامزن ہوتی ہیں ماضی میں پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ نیکو لوگوں کا کہنا ہے کہ تاریخ کو پڑھنے کا کیا فائدہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ انسانوں کے ذہن کو روشن کرنے میں مدد ملی لانے کے عمل کو پیدا کرتا ہے۔

..... ان کے لئے مورخ ہیں۔ وہ ایک انصافی تاریخ رقم کرنے والے تاریخ نویس ہیں۔ میں مورخوں میں فرق یہ ہے کہ عام تاریخ دان صرف کے واقعات ہی بیان نہیں کرتے وہ تاریخ کے ان میں بیان کرتے ہیں وہ اپنی تاریخ نویسی سے لوگوں کی جدید تعلیم کرتے ہیں۔

..... از میں اپنی کتاب "تاریخ کے بدلنے نظریات" میں خود ہی سوال کرتے ہیں۔ سیکور میں تحریر کرتے ہیں کہ سیکورم کا مطلب ہے کہ وہ سماجی عمل کی وجہ سے مذہبی اثر و رسوخ جو معاشرے پر ہوتا ہے اس سے ذہنوں کو آزاد کرانے والے اور مذہب کو انسانی زندگی میں جی حیثیت دی جائے۔

وہ اس لئے کہ مذہب انسان کو پابند کرتا ہے کہ وہ پیدائش سے لے کر موت تک مذہبی رسومات میں رتہ رتہ رہے۔ مذہب انسان کو اس بات کی آزادی نہیں دیتا کہ وہ سماج کے معاملات کو عقل اور دماغ سے تقاضوں کی بنیاد پر طے پانے مذہب سے ان کو عقل سے بیکار بناتا ہے۔ اس قسم کی جانی صورت حال میں انسان کی تمام تخلیقی صلاحیتیں بھسم ہو جاتی ہیں۔ انسان زندگی کے عمل سے ہی باہر ہو جاتا ہے۔ وہ سائنس، آرٹ، موسیقی، ریاضی، شاعری، فلسفہ، فن تعمیر و تمام علوم و فنون سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔

لہذا سیکورازم انسان کی آزادی و معاشرے کو آگے بڑھانے کے لئے مدد دیتی ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔ معاشرے میں صحت مند قدر پیدا کرتا ہے۔ انسانی نفرتوں کو ختم کرتا ہے۔ میں معاشرے کو ایک بین معاشرہ بناتا ہے، اور اس کو ہر نوع کے استحصال سے پاک صاف کرتا ہے۔ انسان کو یک وسیع اشتراک اور وسیع خیال بناتا ہے۔ قدر مت پسند لوگ سیکورازم کو کفر کہتے ہیں۔ جو ایک انتہائی غلط بات ہے۔ سیکورازم ایک علم ہے، اور علم کفر و غیرہ نہیں ہوتا۔

عام طور پر تاریخ کا معاشرے کی فلاح و بہبود سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور نہ تاریخ دان یا مورخ معاشرے کا کوئی منہصع ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کا حقیقی ماضی کے واقعات سے ہوتا ہے۔ ماضی کے کسی بھی غلط واقعہ کی اصلاح، وغیرہ نہیں کی جاسکتی۔ میری نظر میں ڈاکٹر صاحب پاکستان میں ایسے پہلے مورخ ہیں جنہوں نے تاریخ کو انسانی زندگی کی اصلاح کا مضمون بنادیا ہے۔

وہ انسانی معاشرے میں جدید تہذیبیں پیدا کرنے کے خواہاں ہیں۔ ان کی تاریخ دانی ایک مقام پر پہنچ کر معاشرے کے سے ایک اقتصادی اور معاشی ترقی کا پینڈا بن جاتی ہے۔ ایک مشورہ بن جاتی ہے۔ اس قسم کا معاشی فلسفہ ہمیشہ سوشلسٹ انقلابی رہنماؤں کے اقتدار میں دیکھنے میں آیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب پاکستانی معاشرے پر اپنی تحریر کی گئی ایک مختصر کتاب میں امتحان معاشرے کی جمعی قسم کی حکمرانوں، فلاح و بہبود کے پروگرام کا پرہیز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عوام کی اصلاح کی اصلی تہذیب کے نسل کو روکنے کے سے یعنی انقلابی تہذیب کو روکنے کے لئے جو تہذیبی ہر گیر تہذیبی ہوتی ہے۔ ریاست اور حکمرانوں اور امتحان طبقوں کی جانب سے عوامی فلاح و بہبود کا کوئی نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔

جس میں ریاست غیر مستند و صدق کے نام پر ایک معمولی رقم غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کرتی ہے وہ اس سے بے معنی پروگرام رندہ مثال پاکستان میں "جبل و دھاتی حکومت کی بظنیر انفر سپورٹ سے اور صوبہ پنجاب کی سستی رونی سے ایسے ہیں۔ جس سینہوں سے نہ تو غربت کا خاتمہ ہوتا ہے ورنہ انی معاشرے میں خوشحالی آتی ہے بلکہ یہ سینیسیں بد نظمی کا کارہو ر اپنی اہمیت کھو جاتی ہیں۔ سی طریقے سے ریاضی حکمران اور سرائی نیک نامی و شہرت حاصل کرنے کے سے غریب لوگوں کے لئے فکر کا نمائشی نظام کرتے ہیں۔ لوگوں کو قلعہ داروں میں کھڑے کر کے کھانا دیا جاتا ہے۔ لوگوں کی عزت نفس کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ ان کو محنت کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا جاتا۔ وہ زندگی کی جدوجہد سے عاری بن جاتے ہیں۔ لوگ ایک طرف سے ایک حیوانی سطح پر آ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنجاب کے چند شہروں میں بحریناؤن کے ملک ریاض کا لنگر کوئی کہے کہ انسانی شرف کا حاصل ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب انسانی معاشرے میں انقلاب کے عمل کے بارے میں کہتے ہیں کہ لوگ کسی لیڈر کے انتظار میں رہتے ہیں کہ وہ آئے اور انقلاب لائے جبکہ یہ ایک غیر انقلابی عمل کی بات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انقلاب فرانس میں بہت پہلے عمومی حصہ پیرس کے عوام نے لیا تھا۔ جب ایک مرتبہ عوامی طاقت نے ریاست کی طاقت سے فکرے تو اس نے بعد انقلاب کے رہنما سامنے آئے تھے۔ اس لئے انقلاب پہلے آتا ہے رہنما بعد میں آتے ہیں۔ جو انقلابی صورت حال کو منظم کرتے ہیں۔ انقلاب میں

مسئلہ قوم پرستی

دوشت قوم پرستی کے بارے میں کہتے ہیں کہ قومیں اس جذبات — تحت اثر کی بی جنگ لڑتی ہیں۔ سامراج کے خلاف جدوجہد کرتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی اور سماجی نا انصافیوں کے خلاف جدوجہد کرتی ہیں اور اپنے حقوق کے حصول کے لئے اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہیں۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ منشی قوم پرستی میں قوم پرستی کے جذبات کو انتہا پرستی تک — جایا جاتا ہے۔ نسلی برتری کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ تہذیبی فضیلت کو ذہنوں میں راسخ کیا جاتا ہے، اور ایک سطح پر جا کر یہ تمام

اسی طریقے سے مہاجرین کی سانی شناخت کی قوم پرستی کا فائدہ ان کے ایک مخصوص سیاسی گروہ کو پہنچتا ہے۔ صوبوں کی خود مختاری سے بھی صرف اس حکمران طبقات کو فائدہ ہوتا ہے۔ صوبوں کے عوام کا ان کے اقتدار میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ صوبوں سے یہ حکمران طبقے اپنی سیاست کو مقبول بنانے کے لئے دوران میں طاقت پیدا کرنے کے لئے اپنی ثقافتوں اور اپنی تہذیب کے دل کش اور خوش کن نعرے لگاتے ہیں، در عرب عواموں کی زندگی کے اصل مسائل سے غافل بنا کر ان کو قوم پرستی اور ثقافت

کے نشہ میں مبتلا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ہر قوم میں اور ہر کچھ میں دو قومیں اور دو کچھ ہوتے ہیں۔ ایک اوپر والے حکمران طبقے کا کچھ اور قوم ہوتی ہے دوسری نیچے غریب عوام کی ایک قوم۔ دوران کی غربت کا کچھ ہوتا ہے۔ مگر قوم پرستی کی تحریکیں چلانے والے حکمران صاحب املاک اور زمین کے مالک ہوتے ہیں۔

جاگیردار اور برسر اقتدار سردار اور مراعات یافتہ لوگ قوم پرستی کی تحریک میں استحصالی نظام اور اداروں اور استحصالی روایات کے خلاف دیک لفظ بھی نہیں کہتے۔ غریب عوام کی بد حالی کی کوئی بات نہیں کرتے۔ اپنی ثقافتی قدرتی ہمیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ ثقافتی اقتدار کی شان و شوکت کی بات کرتے ہیں۔ جاگیرداری و ذریعہ شاہی اور سرداری کو اپنی ہی پرستی کو اپنے مزارعوں کے عرس کو ان کی سجادہ نشینی کو خاندانوں کی شرافت کو ان کی فضیلت کو مشائخ پرستی کو عوام کا ثقافتی ورثہ قرار دیتے ہیں۔

اس طریقے سے اپنے تمام استحصالی نظام کو عوام میں مقبول بنانے کی سازش کرتے ہیں۔ جس کا عوام کی ترقی اور خوشحالی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک وڈیرے جاگیردار کی زندگی اور اس کی ثقافت کا ایک کھیت مزدور کی زندگی کی ثقافت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام شہری کا اس قوم پرستی کی سیاست میں کچھ حصہ نہیں ہوتا۔ اس طریقے سے قوم پرستی کی سیاست ایک استحصالی سیاست کی شکل اختیار کر جاتی ہے جو محض ایک دھوکا اور ایک سراب ہوتی ہے۔

تاریخ و روش

میں سے ڈاکٹر مہارک علی پر اپنی تحریر کا عنوان ہی ”خرد فردوسی“ رکھا تھا۔ اس کو خرد افروزی کا مورخ کہا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں اس انسان کو دنیا کا سب سے بڑا انسان تسلیم کیا گیا ہے جو انسان انسانوں کے لئے عقل و خرد کا کام کرتا ہے۔ جو انسانوں کی تعلیم کرتا ہے انسانوں کے لئے خرد افروزی کا کام سرانجام دیتا ہے۔ انسانوں کو سوچنے اور سمجھنے کی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ہر کتاب میں مختلف انداز میں انسانوں کی روشن خیالی میں اضافہ کرتے ہیں۔

ان کی ہر کتاب کے نام اور عنوان میں ہی خرد افروزی کا جو۔ مجھ سے۔ اس کی کتاب تاریخ اور دانش ورتو مکمل طور پر چینی کوشش سے اس کام سے۔ اس کے بعد وہ ان کی کتاب تاریخ کے بدستے نظریات میں انہوں نے یہی بات تاریخ کے بدستے نہایت وضاحت کے ساتھ تحریر کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قوموں۔ انسانوں۔ مزارع افروزی کا



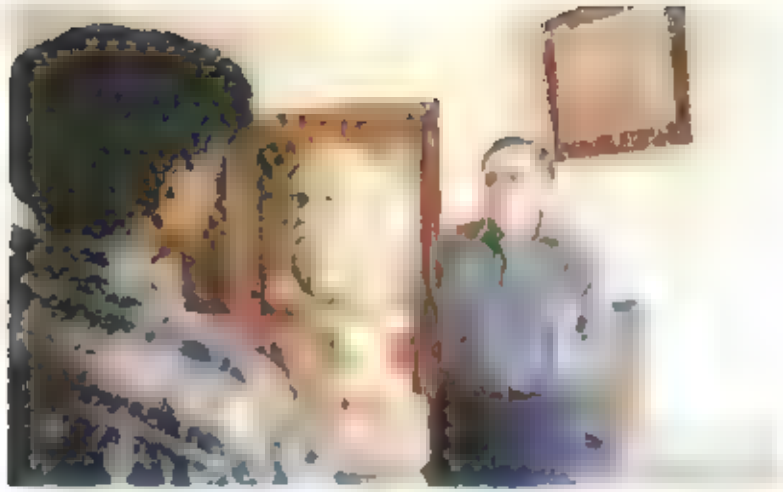
لاہور میں تعلیم کے لئے



فرید (بچپن) اور اس کی فیملی کے ساتھ



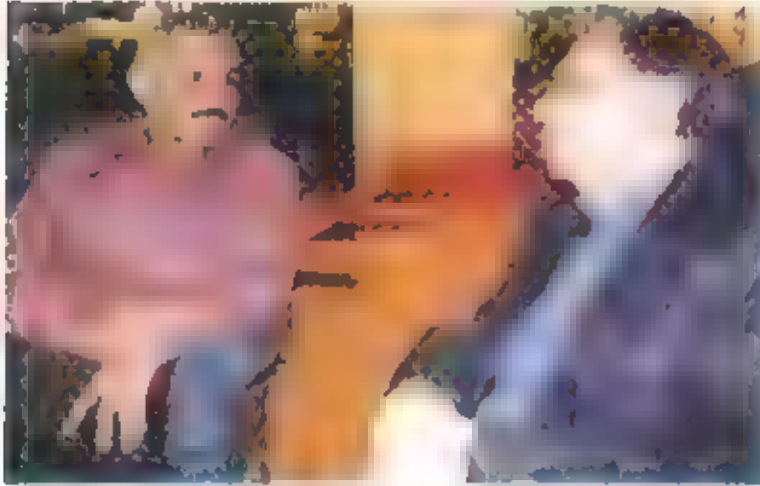
شہداء کے ساتھ



مجموعہ سزاویہ رشتہ کے ساتھ



مجموعہ سزاویہ



ڈاکٹر یاسین محمد کے ساتھ



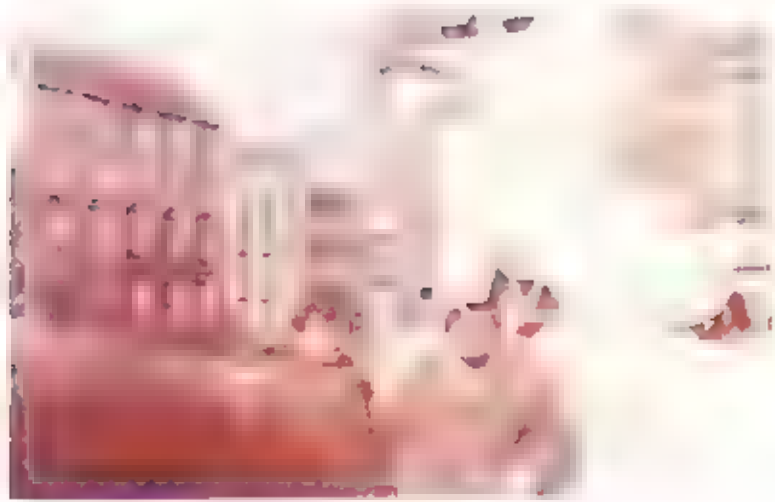
ماہر محمود، مہمان کے ساتھ



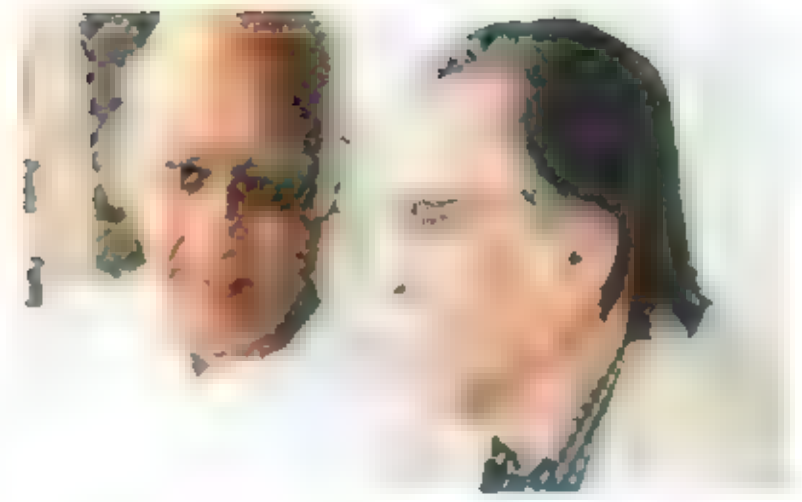
ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ احمد و دیگر اہل فضل کے ساتھ



حزب وحدانی کے مارشل روم میں



مسلمان برقی کے دست مل کے ساتھ



سیدہ خدیجہ — ساتھ



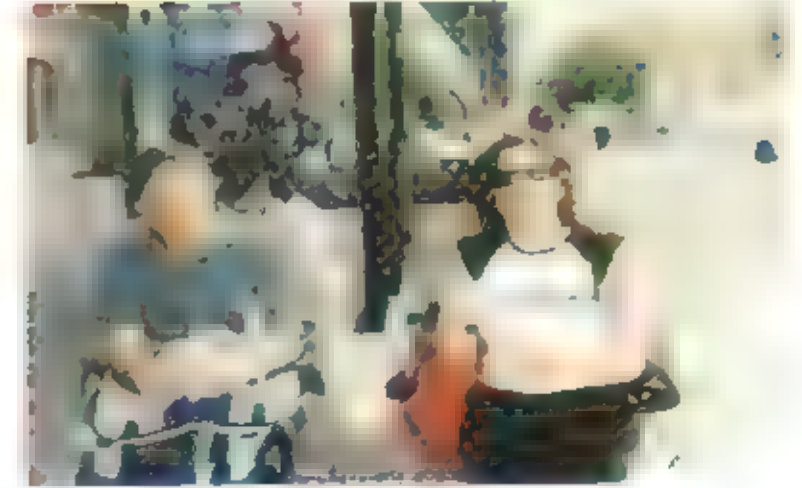
ورمیں سے ساتھ۔ ماہجور ویش



حقیقہ عمر کے ساتھ



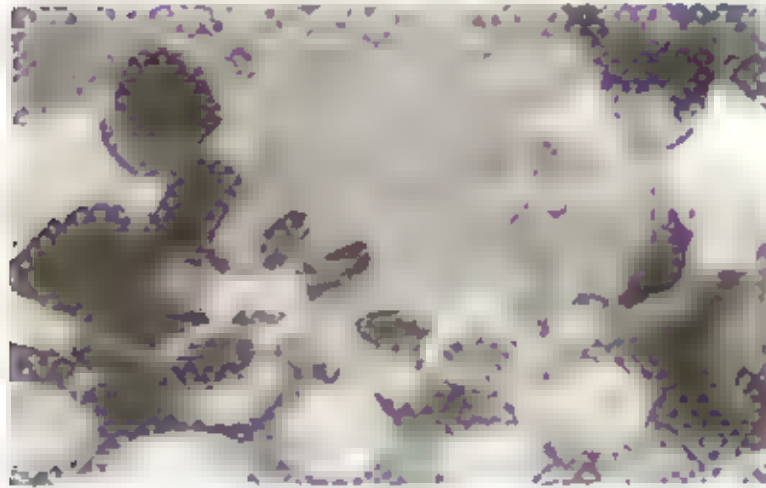
ذکرہ علی۔ آرمہ (رجہ) عطیہ کی پیکل ساتھ



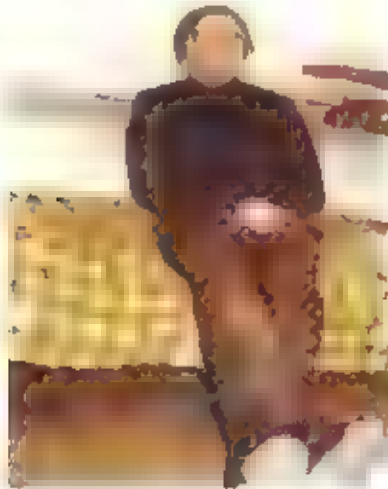
نویارک میں شہد (بنی) کے ساتھ



وینٹل کالج اور کے مہاجر میں پسہ صحت پر



پنسہ صحت پر



شخص۔ ہوش کے سرے میں



مہاجر میں صحت پر



مہاجر میں صحت پر ایک کانفرنس میں



گلز رور میں صحت کے ساتھ

کام دانش وروں نے سرانجام دیا ہے۔

دنیا میں یہ دانش ور ہی تھے۔ جنہوں نے انسان کے ذہن میں سوال پیدا کیا کہ "انسان کیا ہے"۔ اس کا معاشرے میں کیا مقام ہے۔ "سماج اور فطرت" میں کیا تعلق ہے۔ ظریات و خیالات کیوں پیدا ہوتے ہیں، اور کیوں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ کائنات کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ فرماتے ہیں جب یہ سوالات انسانوں کے ذہنوں میں آ گئے تو کائنات انسانوں کی مٹھی میں آ گئی۔ ان کا کہنا ہے کہ ان سوالوں کا جواب سب سے پہلے یورپ کے دانشوروں نے دینا شروع کیا۔

ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ یوں تو مذہب کا غلبہ دنیا میں ہر طرف ہی تھا مگر یورپ میں چرچ کا غلبہ بہت زیادہ تھا۔ یورپ کے تمام تقیسیں اور رے چرچ کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ جس نے انسان کے تخلیقی ذہن اور صد جیتوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی فکر و شعور کے تمام دروازے بند کر رکھے تھے۔ ان پر قدغنیں اور پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ علم و تعلیم کا مقصد انسان و سماج کی خدمت نہیں تھا بلکہ چرچ کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔

یورپی دانش وروں نے معاشرے میں ایک ایسے سماجی عمل کا آغاز کیا جس کے ذریعے مذہبی عقائد کا ذہن و ایمان سے غلبہ ختم کرنا مقصود تھا۔ نبیوں نے ریاضی کے اصولوں سے اور طبقاتی علوم کے ذریعے توہمات کو توڑا۔ انسانوں کے ذہنوں سے وہمات کی دھند کو صاف کیا اور یورپ کا معاشرہ اس تھمن سے نکل کر آزاد فضا میں آ گیا۔ لوگوں نے انسانیت کے ہارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

دانش وروں نے عیسائی قوم اور غیر عیسائی قوم کا فاصلہ ختم کرنا شروع کر دیا۔ جس طریقے سے "ڈاکٹر" نے کہا تھا۔ ہمیں دوسری تہذیبوں کو اپنے نقطہ نظر سے نہیں دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ یہ اس سلسلے میں ایک کارآمد بنیادی سوچ تھا جس نے یورپ میں لوگوں کے ذہن اور تاریخ کے مطالعہ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ جرمنی کے مشہور مورخ "ہوئے زر" نے کہا کہ عیسائیت کی سچائی ہر شخص کو اس کی بات تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ ہر مذہب کا اپنا مقصد ہوتا ہے اس کی عین سچائی ہوتی ہے۔

ان کی اس تعلیم سے لوگوں میں اور معاشرے میں ایک دوسرے کے موقف اور مذہب کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوئی اور لوگوں کی سوچ میں "حقیقت اور پیمید" آ گیا۔ روشن خیالی کے دانش وروں نے اپنی دیانت اور جرات کے ساتھ ایک تحریک کی شکل میں اظہارِ رائے اور عمل کی آزادی پر زور دیا، وراثتی عقل کو تمام نظریات اور مذہب کو جانچنے کا معیار بنایا۔

دانش ور "روسو" نے مطلق العنانی کے اقتدار کی سیاست پر اپنی فکر کی کاری ضرب لگاتے ہوئے



جرمنی (میونخ) میں حسین مہولی کے ساتھ



بوٹم (جرمنی) عینہ کے ساتھ

بادشاہت کے اس تصور کو چیلنج کیا۔ جس میں بادشاہ صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے مطلق العنانی اور عوام کے درمیان ایک عمرانی معاہدے کی بنیاد ڈالی۔ جس کی وجہ سے عوام بادشاہوں کے سامنے ایک فریق کی شکل میں یک قوت بن گئے۔ جس کی وجہ سے انسانی معاشرے میں جمہوری قدر اور روایات کو فروغ حاصل ہوا۔

دانش وروں نے عقائد کی فرسودہ روایات کے حصار کو توڑ کر لوگوں کو سیکولر سوچ اور سائنٹیفک سوچ سے آگاہ کیا۔ جس کی وجہ سے یورپ میں ترقی کی راہیں ہموار ہو گئیں، اور روشن خیالی کی یہی سوچ آج تک دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

پندرہویں صدی میں سوچنے ہوئے پاکستانی دانشور اور معاشرے پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں: پاکستان کا معاشرہ اس وقت جس انتشار، فتنہ، ورنوٹ پھوٹ اور مذہبی انتہا پرندگی کا شکار ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے دانش وروں کی ذمہ داریاں اور بھاری ذمہ داریاں ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ معاشرے میں ذہنی تہذیبی پیدا کریں۔ خصوصیت سے مذہبی جنونیت، بنیاد پرستی، تعصبات، توہمات اور تنگ نظری کے خلاف فکری جہاد کریں۔ اپنی علمی کاوشوں کے ساتھ معاشرے میں وسیع انظری اور برداشت کی قوت پیدا کریں، ورنہ لوگوں کے ذہنوں کو اپنی روشن خیالی سے منور کریں۔ پاکستان میں ریاستی فکر کے سرکاری اور نیم سرکاری دانش وروں کے ذہن میں روشن خیالی کی فکر پیدا نہیں کر سکتے۔ اس سے کہہ رہی ہوں کہ فکری ایک حوالوں سے استحصائی فکر ہو کر رہ گئی ہے۔ پاکستان میں پہلے ان سے ہی اسلام و نظریہ ریاست کو مقتدر طبقوں کے مفادات کے تحفظ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں آزاد خیالی اور روشن خیالی اور قوت برداشت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

اس استدلال پر غور کرنے آج پاکستان کو ایک ہندوئی میں لے کر کھڑا کر دیا۔ آج پاکستان کے دانش وروں کو چاہئے کہ وہ اپنے حکومت سے علیحدہ خود مختار تنظیمیں و ادارے بنائیں۔ انہیں یوروری اور ورگاری فکر سے آزاد کرادیں۔ تاکہ دانش ور حضرات اپنی ذہنی آزادی کے ساتھ اپنا کردار ادا کریں۔

ڈاکٹر صاحب اس علم کو ترجیح دیتے ہیں جس کی بنیاد انسانی تجربات اور مشاہدات پر ہو۔ ان کی سحر خیز علم کسی ایک طبقے کی جارہ داری میں نہیں رہتا۔ بلکہ علم ہر طبقے کا علم بن جاتا ہے۔ علمی جارہ داری ہمیشہ حکمران طبقے پیدا کرتے ہیں۔ حکمران طبقے چنا سہ قائم رکھنے کے لئے اپنے دانش وروں اور مفکرین کی خدمات حاصل کر پیتے ہیں جو مالی مفادات اور منفعت حاصل کرنے کے لئے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ان طبقات کے نظام اقتدار کو ہلکا کر دیتے ہیں۔

اس حکومتی قبیل کے دانش ور حکمرانوں کے "ایشیائیسٹ" کو برقرار رکھنے کی تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں کو تہذیبی پیدا کرنے سے غافل بنا دیتے ہیں۔ ان کو حال میں مست بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کی دانش وروں میں مدھی سٹار جیٹش پیش ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کو قصصوں اور تقدیروں پر قائل کرتے ہیں۔ ان کو راضی بار خدا رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

ان کے عقیدے میں حقیقی دانش وروں کو ان رجعت پسندی کی عوام دشمنی سوچ کی مزاحمت کرنی چاہئے۔ ان کے علمی تقدس و رمز ہی استحصائ کا پردہ چاک کر کے لوگوں کو حقائق کے علم سے آگاہ کرنا چاہئے۔ سچے دانش وروں کو ان ظلم و ستم کے استحصالی جاہل نہ چھوٹی خیانت کو بے نقاب کرنا چاہئے۔ عوام کی رہنمائی کرنی چاہئے۔

اس لئے کہ حقیقی دانش وروں اور مفکرین کا کام لوگوں کو ہاشور مانا ہوتا ہے۔ ہم ان دانش وروں کو ہی عظیم دانش ور اور مفکر کہیں گے جو اپنے خیال و فکر سے سماج کو بدلتے ہیں، انتہا بات و پیدا کرتے ہیں، اور لوگوں کو جبر و تشدد سے نجات دلاتے ہیں اس کے ذہنوں کو آزادی عطا کرتے ہیں اس لئے کہ علم ہی حقیقی علم ہوتا ہے جو بنی نوع انسان کو وقت دیتا ہو۔ جس علم کو ہم کہہ سکتے ہیں۔

قارئین مضمون اس مضمون میں اب تک آپ جتنی باتیں پڑھ چکے ہیں ان باتوں کا ترجمہ علم و فلسفہ اور سماجیات میں سے ہی اخذ ہے۔ میں میرا فکر ہم بہت کم تھا۔ میرے ذاتی ممبران علی کے ساتھ ورشتے میں ایک رشتہ علم کا ہے دوسرا محبت کا رشتہ ہے۔ میرے دن کا آغاز ڈاکٹر صاحب سے ہر روز فون پر بات کرنے سے ہوتا ہے۔ جن دنوں میں کام نوٹ کرنا تھا۔ میں جس موضوع پر کام کرنا چاہتا تھا اس پر ڈاکٹر صاحب سے بات چیت کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے کاموں کا استدلالی کام کہا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ایک بے حد با فیض دانش ور ہیں۔ وہ علم کی تقسیم کو صدقہ جاریہ خیال کرتے ہیں۔ ان کی یہ حدت دنیا کے ان تمام مثالی اور مثالی دانش وروں اور فلاسفوں سے ملتی ہے۔ جو دنیا کی تاریخ میں امر ہو چکے ہیں۔ ان کا طریقہ تعلیم سترادہ، افلاطون اور ارسطو سے ملتا جلتا ہے۔ سترادہ افلاطون و ارسطو کے اپنے مطب ہو کرتے تھے اپنے کتب ہو کرتے تھے۔ جن میں ہر سطح کا ہر طبقے کا شاگرد شریک ہوا کرتا تھا۔ ان کا یہ علم تعلیم کا سلسلہ ایک صدقہ جاریہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی تعلیم دہنی کی کسی سے کوئی قیمت وصول نہیں کیا کرتے تھے۔ یہی طریقہ ڈاکٹر صاحب علی کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آجکل لاہور نیرنگ گیلری میں ہر ہفتہ کے دن گیارہ بجے سے کر تین بجے تک اپنی علمی بیٹھک کرتے ہیں۔ جس کو میں بزم ڈاکٹر صاحب علی کہا کرتا ہوں۔

ان کی اس بزم میں لہو سے لہو سے باہر سے علم کے پیا سے نوگ علم کے طب عالم
فاضل دانش و مفکر ادیب شاعر مورخ تعلیم دان پر فیض حضرت شرکت کرتے ہیں۔ اس شرکت کرنے
میں میں مجھ جیسے کم علم طب علم بھی باقاعدگی سے شرکت کرتا ہے۔ ان کی اس بزم میں کسی مقام
مستند و مفکر نہیں ہوتی۔ کسی کا نامور ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ ان کی یہ محفل بہت اور خالص علمی
محفل ہوتی ہے۔ ان محفل میں کثر اوقات ایک علمی موضوع مقرر کیا جاتا ہے جس موضوع پر تمام
میں محفل میں شرکت کرتے ہیں۔

اس وقت سے ان محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔ یہ طریقہ علم
میں بہت ہی عمدہ ہے۔ اس وقت سے اس محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔ علم
میں بہت ہی عمدہ ہے۔ اس وقت سے اس محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔

اس وقت سے اس محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔ اس وقت سے اس محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔
اس وقت سے اس محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔ اس وقت سے اس محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔
اس وقت سے اس محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔ اس وقت سے اس محفل میں ایک سہ ماہی سہ ماہی شرکت میں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی و قضاة دانش و روں میں سے ایک ہیں جن کو دانش و فکر مورخ اور تاریخ
دان اور فلسفی کہا جاتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ان کی عمر دراز ہو اور وہ جاری تعلیم کرتے رہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی — ایک منفرد تاریخ نویس

ڈاکٹر سید جعفر احمد

معروف تاریخ نویس ہارڈ زین (Howard Zinn) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب
A People's History of the United States امریکی تاریخ اور امریکی معاشرے کے
عہد بہ عہد ارتقاء میں وہاں کے عام انسانوں کے تخلیقی اور تعمیراتی کردار کو بڑی جان فشانی سے اجاگر کیا
ہے۔ اس نے عوام کو تاریخ کا موضوع کیوں بنایا، اس کا جواب اس ضخیم کتاب کے آخر میں مگریزی
کے معروف شاعر شیلے کے ایک بند (Stanza) کی صورت میں دیا ہے۔ عام لوگوں سے مخاطب
ہونے کیلئے لکھا ہے

Rise like lions after slumber

In unvanquishable number!

Which in sleep had fallen on you—

Ye are many; they are few!

خواب راحت سے اٹھو دوستو شیروں کی طرح
اتنی تعداد میں اٹھو کہ جو تخیل کبھی ہو نہ سکے
اور دشمن پر بھی یہ زنجیریں مگر دو اپنی
اُن فنا ہوتے ہوئے اوس کے قلعوں کی طرح
جو کہ اس خیمہ میں گرتے رہے تم پر پیہم
تم بہت ہو، وہ فقط چند ہیں مائل بہ ستم

یہاں عام انسانوں کے نام ایک شعر کا جو پیغام ہے، اس کو ایک تاریخ نویس اپنی کاوشوں کا

مقتدرہ رہے رہے۔ وہاں یہ ہے کہ یہ عام سان، عام لوگ کون ہیں؟ یہ عام لوگ، وہ ہیں جو سماج کے انجمن کو اپنے صحن فراہم کرتے ہیں، جو تفریش کے آواز سے آج تک ارتقا پذیر تہذیب۔ سب سے بڑے معارفات ہوئے ہیں، جن کے خوب دل سے کھیت سے ہوتے رہیں ہیں سنا گنتی میں جن کے سوا قلم سے تصور کائنات میں رنگ بھرتے آئے ہیں، لیکن پھر یہی وہ لوگ بھی ہیں جن سے تاریخ عصر حاضر میں بھی برقی رہی ہے، اس نے اپنے صفحات ان کے سے بندھ گئے ہیں۔ یہ سچیت پچان، شاہد، اس میں تاریخ نویس خاص طور سے مغربی دنیا میں، ماضی کی اپنی اس بہت زیادہ شہرت رہی ہے۔

میں نے اس سے یہ سب سے نظروں سے گرائے بیٹھے ہیں۔ کبھی ہم نفس و قلب و ضمیر سے نہ تہذیب کا، نہ تاریخ کا، نہ کبھی مغربی گمراہیوں کی تاریخ مرحب کرنے کا شوق پر بیٹے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ یہ سوچنے سے قاصر ہیں کہ ہر تہذیب کی طرح معارف تہذیب میں بھی وہاں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ مغرب میں برس برس ہا برس سے ایسے تاریخ نویس سامنے آ رہے ہیں، جن کی لکھی ہوئی تاریخ عام لوگوں کو، اور معاشرے کے ہر حلقے اور ردہ و تحقیق کا موضوع بنتی ہے۔ پھر یہ تاریخ وکوں کے معاشرتی شعور کو پروان چڑھاتی ہے، ان کو صحیح اور غلط کے درمیان تمیز قائم کرنے میں مدد دیتی ہے، انہیں خواب راحت سے بیدار کرتی اور معاشرے کی تعمیر پر کمر بستہ کرتی ہے۔ ہارڈن، جن جس صف میں کھڑے ہیں، اس صف میں ی۔ پی۔ تھامسن (F. P. Thompson)، ایب ہاس (Eric Hobsbawm)، کرس ہارمن (Chris Harman) اور بیسیوں دوسرے تاریخ دان بھی شامل ہیں۔ ان سب تاریخ نویسوں کی کتابیں سنانے کی دوا انہیں بلکہ جگانے کی صدا کا بہت ہو رہی ہیں۔

ادھر اپنی طرف دیکھیں اور اپنی صفوں میں ایسے تاریخ نویس تلاش کریں جو ماضی کی تحقیق کے ذریعے مستقبل کے راستوں کی نشان دہی کرتے ہوں یا عام لوگوں کو ان کی سمیت بار بار نظر آئیں، تو وہ زور و زور تک کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس خانہ دیرانی میں بس ایک تاریخ نویس سے جو بچھتے ہیں، پینتیس سال سے لوگوں کو چگانے کی مہم میں مصروف ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی حوم کی تاریخ کو ان تک پہنچانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ کام وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ تین عشروں سے زائد عرصے سے کر رہے ہیں۔ ان کے کام کا اعتراف ہمارے یہاں کے روایتی تاریخ دانوں کے حلقے اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اندر تو اتنا نہیں ہے، لیکن ان کی مشق ستم رایگان بھی نہیں گئی ہے، بلکہ جن لوگوں کے لئے وہ

تھکتے ہیں، ان تک ان کی بات پہنچی بھی ہے اور سمجھی بھی گئی ہے۔ پاکستان کے ذوقاوق مدد قوں، چھوٹے چھوٹے شہروں و قصبوں میں بھی ان کی کتابیں پہنچ چکی ہیں۔ خیبر پختونخوا میں مانسہرہ کی ایک عام سی مارکیٹ، اسٹیشنری کی دکان، پنجاب کے ریلوے اسٹیشنوں کے اخباروں اور رسالوں کے اسٹالوں پر، تربت میں پرچون کی دکان کی الماری کے ایک خانے میں، نواب شاہ کے ایک فٹ پاتھ پر اخباروں کے مذاکروں کے برابر رکھی ہوئی، مبارک صاحب کی کتابیں میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ ان کو پڑھنے والے اب ایک وسیع و رملک گیر حلقے کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ پاکستان میں روشن خیالی اور جمہوری قدروں کا پیغام شعری پیکر میں جس طرح حبیب چاہ کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچا، اسی طرح یہ پیغام تاریخی کتب کی صورت میں مبارک صاحب کے ذریعے پہنچ رہا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کوئی 70 سے زیادہ کتابیں تحریر کر چکے ہیں، جن میں موضوعات کے حوالے سے غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے ماضی کے حالات و واقعات ہی پر اپنی تحقیق کے نتائج کاربند تک نہیں پہنچائے، بلکہ تاریخ نویسی کے مختلف رجحانات اور فلسفہ تاریخ پر بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ مبارک صاحب نے 1980ء کے عشرے کے اوائل میں جو چیزیں شائع کیں، وہ اتنی بے سرو سامانی کے عالم میں کی گئیں کہ ان کے پاس اپنی کتابوں کی کتابت کروانے کے لئے بھی وسائل موجود نہیں تھے۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے تھ کر اور اپنے ہی خط میں کتابیں شائع کیا کرتے تھے۔ ان کی تعمیر و ترمیم کا بیش تر وقت سندھ یا بیرونی میں گزارا تھا، لیکن بد قسمتی سے یہ محض ان کے لئے تھ زیادہ مہربان ثابت نہیں ہوا، انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ ملنے کے ایک صبر آزما معاشی جدوجہد سے بھی گزرنا پڑا۔ اس کے باوجود ان کا تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا اور اب اس سب کو بہ یک نظر دیکھیں تو نظریں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔ ستر سے زیادہ کتابیں، ہزاروں صفحہ، تاریخ کے مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے ایک مستند اور دقیق تحقیقی مجلے کے 49 شمارے، تاریخ کے مختلف موضوعات پر پندرہ بیس قومی ورہین، قوامی کانفرنسوں کا انعقاد، اپنے مقالات کی پیش کش کے سے ملک کے چنے چنے اور بیرونی دنیا کے ان گنت دورے، یہ سب کچھ کسی غیر معمولی جذبہ اور عزم ہی کا حاصل ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ عزم اور جذبہ کیا ہے؟

مبارک صاحب کی زندگی بھی ایک مکمل کتاب کی طرح ہے۔ کچھ سال پہلے انہوں نے ڈورڈر ٹھوکر کھانے کے نام سے ایک سوانحی کتاب تحریر کی تھی۔ پھر ان پر ایک مقدمے کی آزمائش کی تو ایک کتاب اس کے نتیجے میں وجود میں آئی اور اب انہوں نے 'میری دنیا' کے نام سے، ایک کتاب تحریر کی ہے۔ ان

راتیں تحریروں کو بغور دیکھیں تو اس جذبہ نثر کے تنک رسائی مشکل نہیں رہتی جو مبارک صاحب کو کام اور مسلسل کام پر آدھ رکھتا ہے۔ وہ قلم کے الفاظ میں اوس میں لت پت قوم کو غفلت کے خواب سے بیدار کرتے اور تقلید کی زنجیر سے نکل کر تنقید اور تعمیر کی راہوں میں قدم رکھنے میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کے کام کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا تو یہی کہ انہوں نے عام لوگوں و جن میں صاحب علم، سیاسی درکرار اور محنت کش شامل ہیں، اپنا مخاطب بنایا ہے۔ عام لوگوں کے لئے جیسے کا قصاص تھا کہ وہ سب مبارک اور دھم انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچائیں۔ اس کو سب اس بار پر تقویت حاصل ہو چکی ہے کہ وہ بہت سہولت سے ساتھ مشکل سے مشکل موضوع پر بات کرتے ہیں۔ ان میں بہت سی باتیں نکلتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب 'میری دنیا بہت مسکراتی ہے' ان کی خوب ہے۔ اس میں بعض بہت عجیبہ تصورات کو بھی شامل گفتگو کیا گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ ان کی زبان مناسبتیں ہوتی۔

..... میں نے عام کا دوسرا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ انہوں نے سماجی، حکمران خاندانوں، محنت کشوں میں..... اور ان کی زندگیوں میں..... جو کہ وہ شروع سے عام باشندوں کو تاریخ کا محور بنایا ہے۔ انہوں نے نجی زندگی کی تاریخ لکھی ہے، انہوں نے مختلف نسلوں، طبقوں، خواتین مختلف پیشوں یہاں تک کہ ڈاکوؤں اور ڈکیتی جیسے موضوعات کو بھی تحقیق کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ ہر چند کہ محل دور و مغل درباروں کی ابتدائی تحقیقات کا موضوع تھا، لیکن بعد سے برسوں میں انہوں نے بہت کچھ مغل عہد کے معاشرے پر بھی لکھا۔

ڈاکٹر مبارک علی کی علمی کاوشوں کا ایک تیسرا میدان خود تاریخ نویسی کا موضوع ہے۔ وہ عہد وسطی در جدید دور کی تاریخ کو خود تاریخ نویسوں کے سپنے، رجحانات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا بہت فکر انگیز کام قومی اور قومی تاریخ نویسی کے بارے میں ہے۔ خاص طور سے قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد سرکاری سطح پر جس قسم کی تاریخ نویسی کی حوصلہ فزائی کی جاتی ہے، وہ ریاست کی نثریاتی ضروریات کی روشنی میں طے پاتی ہے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ ریک ہائس بام نے اسی سیاق و سباق میں تاریخ نویسوں کو Functionaries Ideology یا نظریے نو فروغ دینے والے عیسے سے تعبیر کیا ہے۔ خدا ہر ہے ڈاکٹر مبارک علی ایسے Functionaries میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے آزاد حیالی اور فردا فردی کاراستہ منتخب کرتے ہوئے تاریخ کو قومی، امکان معروضی نقطہ نظر سے لکھا ہے۔ انہوں نے خاص طور سے پاکستان میں تاریخ نویسی کے مسائل پر بحث

کی ہے، چنانچہ ان کی کتابیں 'تاریخ کی آواز' اور 'تاریخ کی تلاش' میں ان مسائل اور رجحانات سے بحث کی گئی ہے جو پاکستان میں تاریخ نویسی کے حوالے سے سامنے آئے ہیں۔ ان کا واضح موقف ہے کہ ہم نے تاریخ کو نظریے کے سانچے میں ڈھال کر اپنے ملک میں تاریخ نویسی کے امکانات کو معدوم کر دیا ہے۔

مبارک صاحب کے کام کا ایک چوتھا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے صرف کتابیں نہیں لکھیں اور صرف مقالات پر نکتہ نہیں کیا، بلکہ ایک عوام دوست اور وسیع النظر تاریخ کے مقاصد کے حصول کے لئے مختلف درجوں میں کام کیا ہے۔ 'تاریخ' کے نام سے انہوں نے جو جریدہ شائع کرنا شروع کیا، اس کو اب بارہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس دوران اس کی جریدے کے پلیٹ فارم سے وہ کئی موضوعاتی کانفرنسیں منعقد کر چکے ہیں، جن میں 'سندھ کی تاریخ'، 'بجوب کی تاریخ'، 'نیشنل ازم'، 'استعماریت'، 'تاریخ اور عورت'، 'تاریخ اور عوام'، 'سماجی علوم کی صورت حال'، غرض ایسے ہی موضوعات پر مختلف زوہوں سے گفتگو کی گئی۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مبارک صاحب تاریخ نویسی کے ایک غیر سرکاری اور غیر متعصب تصور کے فروغ کے حوالے سے جو کام کئی سال سے کر رہے ہیں، وہ اب ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ان کا حلقہ، قارئین ملک کے طوں و عرض میں پھیل چکا ہے اور طب علموں اور تاریخ نویسی کی طرف آنے والے نئے لوگوں میں بھی ان کے طرز فکر کو قبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ رجحان گریوں ہی فروغ پا رہا تو ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ مستقبل میں ہم ماضی اور حال کے مقابلے میں زیادہ بہتر تاریخ پڑھ رہے ہوں گے۔ وہ دن جب بھی آیا، خواہ وہ ہماری زندگیوں میں آئے یا ہمارے بعد، پاکستان میں چھی اور قابل اعتبار تاریخ پڑھنے والے، ڈاکٹر مبارک علی کے ضرور شہکار ہوں گے، جنہوں نے حکم عدولی میں باہل کی تھی۔

ڈاکٹر مبارک علی اور دانشوری کی روایت

ایوب ملک

پاکستانی ریاست نے جب سے نظریاتی ہونے کا دھوئی کیا ہے اس نے عوام دوست دانشوروں کے لئے بہت سی مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔ یونکہ اس میں دوسرے نظریات سے سیکھنے کا عمل ممکن ہی نہیں رہتا اور یوں نئے خیالات و نظریات معاشرے میں ظہور پذیر نہیں ہو پاتے اور قدامت پرستی کی جڑیں مزید گہری ہوتی جاتی ہیں۔ تقریباً بیسی صاحب ایک زمانہ میں یورپی معاشرے کا بھی تھا جب چرچ اور ریاستی اداروں نے مل کر معاشرے کو پیسہ مندہ رکھا ہوا تھا لیکن وہاں شاعروں دانشوروں 'سائنسدانوں' ادیبوں مصوروں اور دوسرے باشعور اور آگاہ لوگوں کا کردار ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ جن کی قربانیوں نے یورپین معاشرے کو قدامت پرستی سے آزاد کرایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر دانشور سنت سقراط کا امین ہونا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

اس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں

ورنہ سقراط مر گیا ہوتا

فیض صاحب نے بھی سماجی تبدیلی کا محرک دانشوروں اور شاعروں کو ٹھہرایا ہے اور ایک جگہ لکھ ہے کہ دیہوں اور شاعروں کے لئے صرف مشاہدہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ انہیں مجاہدہ بھی کرنا ہوگا۔ صاف ظاہر ہے سماجی تبدیلی کے لئے معاشرے کے سب سے زیادہ آگاہ طبقہ ہی کو قربانی دینا ہوگی۔ لاطینی امریکہ کے معروف انقلابی Jose Marty جس نے کوئٹل پادر کے خلاف لوگوں کو منظم کیا جنگ لڑی اور انکی صفوں میں پہلی ہی جنگ میں لڑتے ہوئے مارا گیا وہ دراصل ایک شاعر تھا۔ پورے لاطینی امریکہ میں آزادی کے متوالوں میں Jose Marty کا نام سائنس یوور Salmon Bolhvier کے ساتھ آج بھی زندہ ہے۔

ہاں جاں کے زین کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے قتل سے گزر کر جاتی ہے

مجھے پاکستانی معاشرے میں ڈاکٹر مبارک علی ریاست ورسوئی کے جبر سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ سن 2005ء کے اوائل میں جب ڈاکٹر صاحب امریکہ سے واپس آئے تو ان کے چھڑک کر اچھی میں رک کر لاہور جانا تھا۔ مجھے اپنی سرکاری حیثیت میں ایئر پورٹ کے اندر جانے کی سہولت حاصل تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو کراچی میں اتر جانے پر مجبور کیا جس پر وہ مجھ سے بہت ناراض ہوئے اور راستہ بھر کوستے رہے۔ میں ایئر پورٹ سے انہیں سندھ ہائی وے کوٹے گیا۔ جہاں ہمارے سینئر دیگر صاحب جن میں ڈاکٹر حسن ناصر کے، مولیٰ مظہر جمیل، مسم شمیم، وردیگر شامل ہیں نے ڈاکٹر صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری کا اہتمام کیا۔ میں نے ان کو بتایا کہ لاہور ایئر پورٹ پر پنجاب پولیس ان کی گرفتاری کے لئے کھڑی ہے اور ہم انہیں ضمانت دوائے بغیر لاہور جانے نہیں دیں گے۔ لاہور میں پچھلے پچھلے دنوں سے مختلف تھانوں کی پولیس اس کے گھر پر چھاپے، درہنہ تھی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف لاہور کے چار تھانوں میں مختلف تجوں اور وکلاء کی درخواستوں پر ایف سی آر درج تھیں۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی کچھ کتابوں کو ریاستی اداروں اور ان کے پروردہ دانشوروں نے لاہور شہر کے تمام بک اسٹالوں سے غائب کر کے اس میں کچھ صفحات کا اضافہ کر دیا ہے۔ جن میں عدلیہ کو برا بھلا کہا گیا تھا بعض وکلاء نے ان تجوں کو وہ کتابیں پیش کی ہیں جس کے باعث ان لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کے خلاف پڑچے کٹوانے کا بہانہ مل گیا۔ پولیس کے چھاپوں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ شدید پریشانی و تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔

بہرحال ہم نے ڈاکٹر صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری کروا کر انہیں لاہور روانہ کیا اور پھر مختلف عدالتوں میں ڈاکٹر صاحب کی پیشیوں کا ایک لقمہ ہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں میں ایک عدالتی پیشی کا احوال ضرور لکھنا چاہوں گا۔ جب ایک گودہ نے ڈاکٹر صاحب کی ایک تحریف شدہ کتاب عدالت میں پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس گودہ سے پوچھا کہ تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے؟ اس کے جواب پر ڈاکٹر صاحب نے عدالت کو صلی کتاب دکھاتے ہوئے بتایا کہ یہ کتاب میں نے واہ کی پیدائش سے پہلے لکھی تھی۔ اس پر عدالت میں ایک قہقہہ لگا اور گواہ کا جھوٹ بھی سامنے آ گیا۔

اسی سلسلہ میں ایک دن جب میں ڈاکٹر صاحب کے گھر پر موجود تھا تو ایک ایس ایچ او کا فون آیا جو کہ بار بار ڈاکٹر صاحب کو قحانہ میں حاضر ہونے کا کہہ رہا تھا۔ میں یہاں اس ایس ایچ او کے بعض جملے

عمل کر رہا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک دانشور کے خیالات کو ریاستی جبر کے ذریعے کس طرح تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایس ایچ او۔

”اوڈاکٹر اوے میں تینوں کئی داری بلایا ہے۔ اوے توں تھانے کیوں نہیں آندا“

ڈاکٹر صاحب: ”جواب میری اس کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری ہو چکی ہے اور میں نے اپنا مفصل بیان جو آپ کی خدمت میں ارسال کر دیا ہے۔“

پتہ نہ

وہ میں سنا ہے۔ توں سوتیاں ہمیں میں اسے میں اس توں زیادہ فیض آلی آری ہمیں میں
ورجیو اگھو سیدھیان انگلاں نال نہیں نکلا اسی اوہنوں ڈنگیاں انگلاں نال وی کڈھ بیٹاواں۔“
یہ لفظ درج نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب جیسے اس طبیعت دانشور کے سے کتنی گراں ہو سکتی ہیں۔
مجھے اس کا بخوبی اندازہ تھا۔

مجم سیٹھی نے اس دوران ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں ایک مصلح ادارہ لکھا کہ کس طرح تیسری دنیا میں ریاستی ادارے دانشوروں کو اپنے نظریات کا تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت کے گورنر یونیٹن جنرل (ر) خالد مقبول نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو گورنر ہاؤس بلاویا۔ گورنر ہاؤس جانے سے پہلے میں نے خاص طور پر ڈاکٹر صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ وہ گورنر کے سامنے اپنی نظریات کا پرچار نہ کریں بلکہ صرف ان مقدمات کو ختم کرانے کی کوشش کریں۔ اس موقع پر گورنر نے آلی جی پولیس کو جو آکر پوچھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک دانشور پروفیسر کے خلاف چار ایف آئی آر لکھی ہوئی ہیں جبکہ میرے اپنے گاؤں میں ایک قتل کے خلاف میرے کہنے کے باوجود ایک ایف آئی آر درج نہیں ہوئی۔ آلی جی پولیس نے تم سے تصدیق معذور کر کے سامنے پیش ہوا ڈاکٹر صاحب کے خلاف مزید کارروائی سے منع کر دیا۔ آلی جی کے جانے کے بعد گورنر نے ڈاکٹر صاحب سے مختلف موضوعات پر بات چیت کی جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے میرے مشورے کے باوجود اپنے اور بجٹل خیالات کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے خیالات سن کر گورنر بہت پریشان ہوا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کو ایک برادرانہ مشورہ دیا جو یہ تھا کہ ”ان خیالات کے ساتھ آپ پاکستانی معاشرے میں نہیں رہ سکتے اور یہ کہ وہ پاکستان سے چلے جائیں۔ ورنہ ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے۔“

میں نے ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کا اثر سندھ اور پنجستان میں جا کر دیکھا ہے۔ 90ء کی دہائی

میں ہم انہیں پنجستان اور سندھ کے دور دراز علاقوں کے دورے پر لے کر گئے۔ پنجستان میں ہم انہیں تربت اور گوادریہ لے کر گئے۔ ہمارے میزبان ڈاکٹر مالک صاحب تھے جو کہ خود بھی ڈاکٹر صاحب کے بہت معتقد تھے۔ میں محمود ہادیج اور ہدایت حسین بس کے ذریعے تربت روانہ ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کو ہوئی جہاز کے ذریعے روانہ کیا۔ مجھے آج بھی کراچی سے تربت کا وہ سفر یاد ہے جب ہم 24 گھنٹوں میں تربت پہنچے تو میں تقریباً نیم رشتی حالت میں تھا۔ ساری رات بس نے جس طرح سڑک نہ ہونے کی وجہ سے جھٹکے کھائے وہ صرف ہو چکی عوامی برداشت کر سکتے تھے۔ سڑک نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور کئی دفعہ تو بس نے اتنے اونچے نیچے جھٹکے کھائے کہ میرا سر کبھی سامنے والی سیٹوں سے یا کبھی سیٹوں کے ساتھ لگنے کو ہے کے پائپ کے ساتھ لگ گیا۔ یہی حال باقی سواروں کا بھی تھا۔ شاید ہو چوں کو اس کی عادت ہو گئی تھی لیکن ہم جیسے پہلی دفعہ بس سے ہو چت نہ کر سکر کے دھوکے کی حالت میں تھے۔ میں رستے بھر سوچتا رہا کہ اس پاکستانی ریاست نے ہو چوں کو کیا دیا اور آج عیدگی کی تحریک چل رہی ہے اس کی اہم وجہ یہی ریاستی جبر ہے۔ میرے خیالات کو اس وقت تقویت ملی جب تربت سے گوادریہ جاتے ہوئے ایک چیک پوسٹ پر ایک سپاہی نے ہمیں روک لیا۔ تمام سواروں کو نیچے تار در سب کا جا رو دیا۔ ڈاکٹر مالک جو کہ دو تین دفعہ صوبوں وزیر رہ چکے تھے بالکل بے بس نظر آئے اور جب تک اس سپاہی نے اطمینان نہ کر لیا ہم وہاں سے ال نہ سکے۔ جب ہم نے چیک پوسٹ سے اس کی تو دوسری طرف دیکھا کہ بہت سی ہو چکی عورتیں بیٹھی ہیں پتہ چلا کہ وہ جس گاڑی میں آئی تھیں سیکورٹی والے اس گاڑی پر اوڈنگانے کے لئے گئے ہیں اور جب تک وہ وہاں نہیں آئے گی یہ عورتیں پوٹھی نہ کا نظر کرتی رہیں گی۔ ڈاکٹر مالک نے بتایا کہ اس سیکورٹی چیک پوسٹ پر تمام ہو چکی سپاہی ہیں جو کہ نظرت کا باعث بن رہے ہیں اور انہوں نے کئی بار اعلیٰ فوجی افسران سے کہا ہے کہ یہاں کم از کم ہو چکی سپاہی ہی قیامت کر دیں جو ہماری تہذیبی روایات سے واقف ہوں اور یوں شاید پاک فوج سے نظرت میں کمی آ سکے۔ لیکن ان کی تجویز پر کبھی توجہ نہیں دی گئی۔

مجھے تربت، گوادریہ اور اندرون سندھ ڈاکٹر صاحب کو سنے جانے پر اندازہ ہوا کہ وہاں نوجوانوں میں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوبے جو مرکز اور ریاست کے جبر کا شکار ہیں وہاں ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو بہت پذیرائی حاصل ہے۔ حالانکہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے کبھی بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی مخصوص علاقے یا لوگوں کیلئے لکھتے ہوں بلکہ وہ تو عوام میں تاریخی شعور کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے تربت کا ایک واقعہ یاد آ گیا جب لیچر ہنگے دور میں خفیہ ایجنسی کے

بہت سارے لوگ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے لکچر کے بعد جب ہم لوگ ایک کمرے میں چائے پی رہے تھے تو ہمیں ایک مقامی میڈر نے بتایا کہ ایجنسیوں کے اہلکار ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں پتہ چلا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ انہوں نے اس لکچر میں کیا کہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات پر تصورِ غصہ میں بھی آئے اور کہا کہ تم لوگ تو لکچر میں موجود تھے لیکن انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں یہ دو چیزیں "اف" مکتوا دیجئے تاکہ ہم اپنے اعلیٰ فرائض تک پہنچ سکیں کیونکہ یہ ہماری نوکری کا حصہ ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے اپنے لکچر کا خلاصہ ہو بہو بیان کر دیا۔ دراصل جس سے ایجنسیوں نے یہ پتہ چلا تھا کہ آپ وہم و گمہ راہ پر تھے۔

بہر حال مجھے تربت اور گواد کے نو جوانوں کے تجسس اور علمی پیاس نے بہت متاثر کیا، اور خاص طور پر جوانوں کا تجسس جن میں بشمل ازم جلدی شعور و ریاستی جذبہ کے نتیجہ میں انہماک پیدا ہو رہا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اعلیٰ جوانی سوچ اور فکر کے لحاظ سے روایتِ شمس ہیں ترقی پسند و قدامت پرستی کے عقیدے میں شمار ہوتے ہیں اس لئے وہ ناصب یہ کہ ریاست کے لئے قابل قبول نہیں بلکہ معاشرہ اور سوسائٹی بھی اپنی منزل پذیر روایت کی وجہ سے شرفِ قبولیت نہیں بخشتی۔ فرد کا ریاست سے لڑنا قدرے آسان ہوتا ہے لیکن جب معاشرہ آپ کا دشمن ہو جائے تو یہ بڑی دشواری کا انداز سے توڑ دیتی ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے دانشور ہیں جو روایت پرستی اور قدامت پسندی کو مختلف توجیہات کے ذریعے زندہ رکھے ہوئے ہیں اور وہی دانشور مقبول عام بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۶۰ کی دہائی میں ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک دفعہ ٹیلی فون پر بتایا کہ "فاخان فاؤنڈیشن کی مدد سے گلگت میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ ہے اور یہ تجویز دی گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فاؤنڈیشن کے لوگوں کو بتایا کہ مجھ جیسے ایک ریاست کے لئے قابل قبول نہیں ہیں اور میری شمولیت آپ کے قیمتی ادارے کے لئے نیک فال نہیں ہوگی" لیکن آغا خان والوں کا اصرار تھا کہ چونکہ اس ادارہ میں حکومت پاکستان کا نہیں بلکہ ان کا پیسہ لگ رہا ہے۔ اس لئے ریاست کو ہماری پسند کے لوگوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خدشات کے باوجود مجھے حکم دیا کہ اگر میں وہاں وائس چانسلر بنوں گا تو میرے ساتھ رہنے والے فرزند بھی دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس کے لئے تم کو اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دینا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کے حکم کے سامنے میں نے بھی رضا مندی کا اظہار کر دیا آج تک اس پرجیکٹ کا ہمیں کچھ پتہ نہ چلا۔

ڈاکٹر صاحب نے سماج میں حمدا و مدوں کے بارے میں نیا شعور پیدا کیا انہوں نے بتایا کہ یہ حمد اور چاہے کسی ملک قوم مذہب یا نسل سے ہوں وہ تاریخ میں مجرم کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے بغیر کسی وجہ کے مال و دولت کے لالچ یا اپنی سلطنت کو بڑھانے کے لئے دوسرے ملکوں پر حملہ کیا اور لوگوں کا قتل کیا۔ یہ صاحبِ سبکدوش عظیم و اعظم بننے پر شدید اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے مجرم سے حمد و در ہے اس کو عظیم لکھ کر عظمت نہیں دینی چاہیے۔ وہ سکندر، محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور محمد غوری کو بھی اس صف میں شامل کرتے ہیں۔

چاگیرداری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ کالونسل دور میں اس ادارے کو حیثیت ملی انگریز حکومت نے ان لوگوں کو مستقل چاگیرداریں دے کر ان کے سماجی رتبے کو استحکام دیا اور یوں انہوں نے عام رعایا کو کنٹرول کیا۔ موجودہ دور کے چاگیردار بھی انہی کی اولادیں ہیں اور برسرِ اقتدار جماعت کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان بننے کے بعد یہ چاگیردار طبقہ اور مضبوط ہوا۔ ریاست نے دیہی علاقوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جہاں یہ میں بچ و بڑ تحصیلدار اور میونسپلٹی کے ذریعے عوام پر مسلط ہیں۔ ریاست اور عوام میں تمام رشتے ختم ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے نصاب کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نصاب کے ذریعے قومی شعور اور قومی اتحاد کے احساسات کو بھرا کر عوام کے مابین تو کینٹرول کرنے کا تصور قومی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد سے شروع ہوا۔ یوں قومی ریاستیں نصابی کتابوں کے بارے میں بڑی حساس ہو گئیں۔ چونکہ پاکستان کو ایک نظریاتی ملک قرار دیا گیا ہند نصاب کی کتابوں کے ذریعے ان نظریات کا فروغ ہوا اور ہمارے طالب علموں میں تنگ نظری اور نفرت کے جذبات پیدا ہوئے جس کا اثر پورے معاشرے کے ماحول پر پڑ رہا ہے۔ جس کا شکار خاندانِ دہشت گردی کا فروغ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں طالب علموں کے لئے تاریخ کی نصابی کتابیں تہذیب کی کہانی لکھیں جو کہ "تہذیب" کے عنوان سے تین حصوں میں شائع ہوئیں۔ جی پتھر کا زمانہ، کانسی کا زمانہ اور لوہے کا زمانہ دوسری جلد میں قدیم ہندوستان، عہد وسطیٰ کا ہندوستان اور برطانوی ہندوستان ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ کتابیں سرکاری یا غیر سرکاری اسکولوں کے نصاب کا حصہ نہ بن سکیں۔ اگر ان کتابوں کو نصابی کتب میں شامل کیا جاتا اور عام طالب علموں تک ان کی رسائی ہوتی تو ان کے نتائج مختلف ہوتے۔ لیکن پاکستان کے نصاب پر ریاست کا قبضہ ہے اس لئے یہاں نفرت پر مبنی نصاب پڑھنا

جا رہا ہے جس کا منطقی انجام دہشت گردی کی شکل میں بھی ابھر کر سامنے آ رہا ہے اور یوں ہمارے معاشرے پر ن لوگوں کا قبضہ ہو گیا جو ہر طرح کی تہذیب کے دشمن ہیں۔ دہشت گردی کی فضا بنانے میں کتب کا حصہ ہے۔ جس کی سرپرستی ریاستی مشینری نے کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہمیں ہمیشہ ہیرو ورثہ سے متنع کرتے رہے بلکہ انہوں نے ہمیں کہا کہ بزرگوں کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ جب انہوں نے یہ بات تلہ گنگ کے ایک بکچر میں کی تو وہ لوگوں نے پہلے تو بہت برا منہ بنایا لیکن جب انہوں نے اس کے حدود خاں تارخ کی نسبت سے واضح کئے تو لوگوں میں کچھ اطمینان آیا۔ انہوں نے کہا ”روں ماؤل“ کا تصور تقلید پر مبنی ہے اور یہ تخلیق کے جذبات کو محدود کر دیتا ہے۔ بننے بنائے راستوں پر چلنا سہل اور سہل ہوتا ہے۔ مگر اپنے راستے کو تعمیر کرنا محنت طلب کام ہے اور ہیرو ورثہ لوگوں کے اپنے ندر لیزر شپ کی صدا جیتیں ختم کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ پاکستانی ریاست کے پاس دو ہیرو ہیں اقبال اور محمد علی جناح اور وہ بڑی محنت سے جناح صاحب کو مذہبی شخصیت بنانے پر تلی ہوئی ہے حالانکہ جناح صاحب ایک لبرل اور مذہب کے بارے میں غیر جانبداری کا رویہ رکھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ اقبال کی شاعری کو بھی نظر یہ پاکستان کو جان کر کرنے کے لئے ریاست نے استعمال کیا اور اس کی آڑ میں اپنے مفادات پورے کرتی ہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ ڈاکٹر مبارک علی خالد ملک اور حسین صدیقی کے ساتھ گزارا ہے جس کی بدولت مجھے اپنے اندر کے تضادات کو سمجھنے اور سمجھانے کا موقع ملا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ ہر مشکل وقت میں ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ کھڑا رہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے اپنے مخلص دوستوں کا تعاون بھی حاصل رہا جن میں خاص طور پر محمود باجوہ خالد محمود بیات ملک اور مجیب شیخ پروفیسر توصیف اور سرور جاوید قابل ذکر ہیں۔ یہاں میں خاص طور پر مرحوم حسین بن حامس و مرحوم مستحسن خاں کو یاد کروں گا جن کی بے وقت موت نے ہمارے ہر مخصوص دوستوں کے گروپ کو منتشر کر دیا۔

بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے دانشور سماج کا بہت بڑا اثاثہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے جن نظریات کی آدش میں زندگی گزاری ہے اس کے لئے قربانیاں ہی دینی پڑتی ہیں اور آج سے سو سال بعد جب ایک نیشنل مورخ پاکستانی سماج کی تاریخ لکھے گا تو اس میں ڈاکٹر مبارک علی کی سماجی تبدیلی کی کاوشوں کو سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ خالد بھٹی نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا



سکریل رائی سردار، عظیم اللہ خاں میو، اور ہمارے ساتھی



سکریل رائی، محبوب احمد خاں، اور ہمارے ساتھی



ہمارے شہر اہل میں تقریب سے خطاب کرتے ہوئے



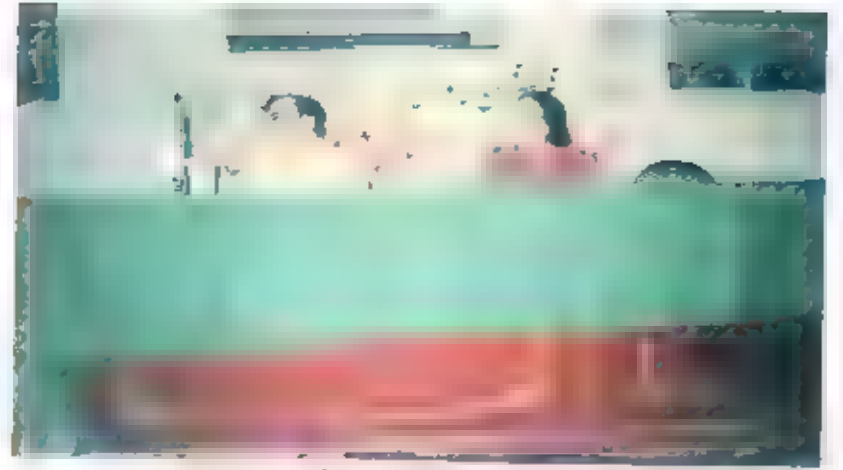
ڈاکٹر مبارک علی اور ان کا فن تاریخ نویسی

ایک طائرانہ جائزہ

فاروق بلوچ
کوئٹہ

پاکستان کے ترقی پسند حلقہ میں بے شمار ایسے نام ہیں کہ جن کی ادبی، سیاسی و سماجی خدمات قابل تعریف ہیں۔ خصوصاً ادب کے میدان میں کئی ایسے اعلیٰ اسمائے ستے ہیں کہ جن کی ادبی خدمات کے نتیجہ میں پاکستان میں ترقی پسند قوم دوست، وطن دوست اور سامراج دشمن سیاسی رجحانات کو کافی پذیرائی اور شہرت ملی۔ یوژ وازنی، لیوڈل اور سامراج دوست عناصر ہمیشہ پاکستان کی سیاسی گدیوں پر براجمان رہے اور ترقی پسند پر عتاب، مگر اس کے باوجود علم کی بیاس بچھانے والے یہ سرفراز اپنے کارِ عظیم سے نہ رکتے والے تھے اور نہ رکے۔ ادب کے ذریعے انقلابی اور ترقی پسند شعور کی سوچ پھیلانے میں ان مصنفین نے لازوال کردار ادا کیا۔ ایسے کئی نام ہیں کہ جنہوں نے اپنے زورِ قلم سے پاداشت اور حاکم طبقات کے ظلم، جبر، معاشرتی عدم مساوات و ترتم تراس و برسلطنت پر قبضہ کے خلاف آواز اٹھائی اور عام لوگوں میں ان مظالم اور عدم مساوات کے خلاف شعور کو بیدار کیا۔ ان بے شمار ادیبوں، مورخوں، مصنفوں، تنقید نگاروں اور شاعروں کی طرح ایک اہم ترین نام جناب ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا بھی ہے کہ جو جدید موثر ضمن کے بانسوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی سے راقم الحروف کی شناسائی عشروں پرانی ہے مگر حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ راقم الحروف کو کبھی بھی ڈاکٹر مبارک علی کا دیدار نصیب نہ ہوا ورنہ کبھی ان سے ملاقات ہوئی اور نہ ہی بالقابل کبھی ان کی قیمتی علمی گفتگو سننے کا موقع ملا مگر اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب سے ایک ایسا رشتہ قائم



نصرہ سٹی ن کتابت چائے دہلی و سامراج دشمنی و تخریب روٹھائی میں ڈاکٹر مبارک علی اور طاہرہ مظاہر علی



قصور پٹی سرور راقم قلم پر۔ ظہور احمد خان، راقم قلم سے سہ



ظہور پنچر، سندھ یونیورسٹی 1964-65ء

ہے کہ جس کی نسبت روح کے ساتھ ہوتی ہے اور جہاں روحانی تحقق کی بات ہوتی ہے تو وہاں ذاتی تخلقات اور طاقات کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے، اور یقیناً مجھ جیسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ ہوں گے۔ جو اس لحاظ سے کبھی ملے نہیں ورنہ ہی کبھی اس سے گفتگو کی فکر کا روحانی حلقہ انہیں ہمیشہ جدید دور کے ترقی پسند اور منفرد انداز تحریر رکھے واسے عظیم دانشور ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ جوڑے رکھتے ہیں۔ راقم اعروف کی رویداد کی سبب یقیناً کوئی ماحول نہیں ہے بلکہ ایک ایسے استاد کا مرتبہ ہے کہ جن کو دیکھتے بغیر اس سے توجہ نہ سیکھ کر حوا کہتے کے قابل نہ تو گمراہ شاہ فرما دے اور شاہ گمراہ ہونے کا شرف حاصل نہ رہتا تو شاید میرے روحانی حلقہ جنوں میں مد جسارتا۔ ان کی تحریریں ہی تھیں کہ جہوں نے راقم الحروف ناچیز کو نہ صرف تاریخ پڑھنے، لکھنے اور جدنے پر غیب کیا بلکہ وہی راستہ اختیار کر کے میں بھی راہنمائی کی کہ جو بدست خود ڈاکٹر مبارک علی کا راستہ ہے یعنی استاد ہونا، کہ جو انسانوں کے راقم میں فرشتے ہوتے ہیں کیونکہ دیا کا پہلا استاد بھی توجہ کیل تھا کہ جس نے عظیم ترین انسانوں کو علم کے زیور سے آراستہ کیا اور یقیناً ایک چھ استاد ہی کا راجہ بن گیا۔ راقم نے اس استاد اچھا ہی ہوتا ہے بشرطیکہ وہ استاد ہوا اور اپنے حاصل کردہ علوم سے دنیا کو ایسے روشناس و آشن کر دے، جیسا کہ ڈاکٹر مبارک علی نے کیا ہے یعنی اپنے علم کو صرف کارنامہ طور پر قلم کار پر نوشتہ کر کے اس سے پوری دنیا کو مستفید کرنا۔

راقم اعروف کی ذاتی، ہریری میں ڈاکٹر مبارک علی کی بیچت آتیاں ہیں جبکہ ان کی کتابوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ماضی میں تاریخ کا موضوع عموماً شاہی خاندان، بادشاہ، اس کے کارنامے، اس کی فوجی مہمات و فتوحات اور اس کے کردار و عمل پر مشتمل ہوتا تھا اور اسے ہی تاریخ کہا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ کو ماضی کی قصیدہ گوئی ہی کہا جاسکتا ہے کہ جس میں طاقتور اقلیت اور ان کی سرگرمیوں کا موضوع تحریر ہوتے تھے جبکہ اکثریت کا ذکر تاریخ سے یکسر غائب ہوتا۔ بابائے تاریخ ہیروڈوٹس کی کتاب بھی شاہان پر ان کے فوجی کارناموں اور سینکڑوں آزاد و خود مختار قوم پر ان کے غلبہ کی داستان بیان کرتا ہے۔ اسی طرح بابائے مسلم تاریخ نویسی اور بابائے عمرانیات عبدالرحمن ابن خلدون کی کئی حدود پر مشتمل تاریخ بھی صرف اور صرف مسلمان حکمرانوں کی فتوحات، جنگوں اور شاہی خاندانوں کی صفات و ثناء تک محدود ہے اور جن اقوام نے ان مسلمان خلفاء کے مظالم اور چارہ اندازت کے خلاف مزاحمت کی یا ان کی مخالفت کی تو وہ اقوام مردود، مجرور، خوار اور ذرہ اسلام سے خارج قرار پائے۔ مسلمان مورخین میں شاید ہی کوئی ایسا مورخ گذرا ہو کہ جس نے اپنی تاریخ کا موضوع

شہوں کی بجائے عام انسانوں کو بنایا ہو اور کبھی ان کے مسائل اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر کیا ہو۔ امام محمد بن جریر طبری، محمد بن قاسم یا قاسم بن دیگر مورخین و جغرافیہ نویسوں نے کبھی بھی مسلم معاشرے کی پس مندی اور دیگر کمزوریوں کی نشاندہی نہیں کی بلکہ صرف اور صرف خلفاء و مسلمانین کے مظالم اور جاہلانہ نظام کو اسطرح کے خوبصورت پیرائے میں ناکر ان کے عظیم کارنامے قرار دیا۔ لہذا آج کا قاری بھی یہی سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کا ماضی صرف اور صرف کارناموں سے بھرا ہوا ہے ورنہ شاہی طبقے میں ماحول نہ تھا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے ہر عمل میں عام انسانوں سے مختلف تھے یعنی وہی دیوانہ، ملی اور ساطیری دست نہیں کہ حوا ماضی قدیم کی عظیم تہذیبوں میسوپوٹیمیا، مصر، یونان، ہندوستان وغیرہ کی طرح کہ جہاں بادشاہ ہمیشہ خدا کا بیٹا تصور ہوتا تھا۔

مغربی مورخین نے بھی ترقی پسند تاریخ نویسی کے بجائے ماضی میں وہی قصیدہ گوئی والی روایت برقرار رکھی اور ان کے ماضی کی تاریخ بھی شہنشاہوں اور ان کے فوجی کارناموں کے گرا گھومتی ہے۔ وہ بھی اس حد تک سے چشم پوشی کرتے ہیں کہ جن کے نتیجے میں آزاد خود مختار اور انوکھے جغرافیہ کی حدود کھنکھانے والی اقوام حاکم و خون میں مونا دیئے گئے، ان کے گھر و تاشیں جد دیئے گئے اور انہیں غلامی و محبوس کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ ان کی عرقیں پامال کر کے ان کے خطوط پر قبضہ کیا گیا مگر اس کے باوجود مورخ کی نظر میں یہ تمام مذموم حرکات بادشاہ یا شہنشاہ کے عظیم کارنامے قرار ہوئے۔ یہی اسلوب تاریخ نویسی کچھلی صدی تک رہا اور جدید میں بھی تاریخ کو علی اور مقتدر طبقات کی مسروفتی اور غائب اکثریت پر اپنی مرضی کے فیصلے اور احکامات کی تحریر و قلم تک محدود رکھا گیا ہے۔

یہی سلسلہ برصغیر میں بھی نظر آتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ برصغیر کی تمام تر مسلم یا غیر مسلم تاریخ نویسی دراصل قصیدہ گوئی و رثاء خوانی کے زمرے میں آتی ہے تو بچانہ ہوگا کیونکہ مسلم دور کے بعد جو تاریخ نویسی کی گئی وہ بادشاہوں و مسلمانین کی ننگی شمشیروں کے سائے میں کی گئی اور جو تاریخ لکھی گئی وہ دراصل لکھی نہیں گئی بلکہ لکھوائی گئی اور ان میں مورخ نے کسی بھی طرح کی ریاستی کمزوریوں یا سلطان یا بادشاہ کی ذاتی کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ سلطان یا بادشاہ کی محض کمزوریوں کو بھی اس کی خوبیوں میں شمار کیا گیا۔ مورخ کو بادشاہ کا جھنڈے کے روز مسجد جانا اور اپنی رعایا کو گمراہ پڑھانا تو یہ دہوتا تھا مگر اس کا حرم سے کبھی نظر نہ آیا کہ جہاں بھارت بھارت کی پٹیلوں و دیشرائیں مسلمانوں کے حرم میں اس کو نفسانی سکون و راحت دیتی تھیں اور اس کی حیوانی جنسی خواہشات کی تکمیل کرتی تھیں۔ درباری مورخ نے بادشاہ کے اس فعل کو بھی شریعت کے عین مطابق قرار دیا اور اسی طرح ہند اور

س پاس کی دیگر آزاد و خود مختار خطوں کے حریت پسند حقیقی باشندوں کی مزاحمت قابلِ تحسین تھی۔
 اور اس کا قائل عام بھی شریعت کی نظر میں حرام سبکی مگر درباری مورخ اسے بھی بادشاہ کے مذہبی کارناموں
 میں شمار کرتا تھا اور ہندو کے خلاف لشکر کشی اور قتال و جہاد سب سے زیادہ کار ثواب ہوتا تھا۔ مورخ ایسے
 کارناموں کو خصوصی طور پر اپنی تحریروں میں جگہ دیتے تھے۔ بارشید سابقہ ادوار میں مذہبی جنگ نظری کی وجہ
 سے تاریخ نویسی کو ہمیشہ چانددار نہ انداز دیا گیا۔ اور حقیقت سے ہمیشہ انحراف کیا گیا۔ تاریخ نویسی میں یہ
 گھٹن صدیوں تک رہی۔ حتیٰ کہ صدیوں بیت گئیں اور ہر آنے وارا دن نئی امیدیں لے کر آتا مگر رست
 کی سیاسی ان امیدوں کو ایک بار پھر ناقابلِ تحسین خواہشات میں بدل دیتی تھیں۔

اس انتظار میں، کہ کوئی تولد کا شیب بن کر نکلے اور تاریخ نویسی حقیقت کا روپ دے اور اسے
 چاہی اور قصیدہ گوئی کے چنگل سے آزاد کرے، صدیوں بیت گئیں اور تاریخ نویسی پر پڑی
 صدیوں کی قصیدہ گوئی، چاہی و چانداری و جنگ نظری کے رانی جی ہوئی کہ نہ تہہ ہستی و مہم فایہ
 سب سے ہم ترین موضوع اور تمام تر سماجی علوم کی ماں یا خرد رست اور صحیح راستہ پر کاموں ہوئی اور
 یقیناً یہ اقرار کرنے میں کوئی قہر نہیں ہوئی چاہے کہ یہ کارِ عظیم سرانجام دیے، لے عظیم انسان دور
 جدید کے سب سے بڑے مورخ جناب ڈاکٹر مبارک علی ہیں کہ جن کے اسلوب تاریخ نویسی کی وجہ سے
 یہی روشنی چھوٹ پڑی کہ جس کی روشن کرنوں نے ہم تاریخ کے وسیع ترین علم سے وسیع و عریض جہان کو
 منور کر دیا۔ اور اسے شاہوں کے عداوت سے نکال کر عوامی گلی کو چوں تک پہنچا دیا اور بدشاہ یک عام انسان
 کہ جس کے لیے تاریخ ایک ناہمد سا مضمون تھا اور وہ کارِ ریاست اور کردارِ سیاست سے نا آشنا تھا اور نہ
 ہی اسے اس بات کا علم تھا کہ وہ جن کو اپنے زعم میں اپنا رکھوانا، حاکم و دربار و رہنما سمجھتا تھا۔ ورجن کی
 قصیدہ گوئی کرنا نہ فرض سمجھتا تھا وہی دراصل اس کے تمام تر انسانی حقوق کی پامالی اور غصب کرنے کے
 ذمہ دار ہیں، مگر جب ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی تاریخ نویسی کا آغاز کیا تو ایک عام انسان بھی ان تمام
 چارہ کیوں اور مکاریوں سے آشنا ہوا کہ جن کو تاریخ میں سیاست کا نام دیا گیا۔

ڈاکٹر مبارک علی نے دراصل تاریخ کو خیالات اور افسانوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت کا رخ دیا
 اور سے خاص طبقات کے تذکروں کے بجائے عوام کی چٹا بنادی اور یہ پیغام دیا کہ تاریخ تمام انسانوں
 کی ہوتی ہے اور سیاست و ریاست میں ہر شخص اور ہر گروہ حصہ دار ہوتا ہے، وفاداری یا قربانی خاص لوگ
 نہیں دیتے بلکہ ریاست کا دفاع ہمیشہ وہ لوگ کرتے ہیں کہ جو تاریخ میں گمناں ہیں۔ انہوں نے اپنی
 تاریخ نویسی میں یہ پیغام دیا ہے کہ ہر شخص معاشرے میں معتبر ہے اور ہر ایک میں اتنی صدائیں ہوتی

ہیں کہ وہ کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دے سکے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس عام آدمی کی
 صلاحیتوں سے با اختیار لوگ ریاست کے لیے استفادہ کر سکیں اور سے تاریخ میں جگہ بنانے کا موقع
 فراہم کر سکیں۔ انہوں نے تاریخ کو شاہی گراں سے نکال کر عوامی مجالس کی زینت بنادیا اور عام لوگوں
 کو بھی یہ پیغام دیا کہ وہ تاریخ میں اپنا کردار ادا کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع
 پیدا کریں اور ان مواقعوں سے استفادہ کریں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے ماضی میں لکھی گئی تاریخ کے بہت سے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے
 اور ہر دور میں تاریخ میں ان لوگوں کے کردار کو اجاگر کرنے پر زور دیا ہے کہ جو پس پردہ رہ کر تاریخ
 بناتے رہے۔ انہوں نے ان کرداروں کی مذمت کی ہے کہ جو گمنام تاریخ سازوں کے کارناموں پر اپنی
 کامیابیوں کے کل تعمیر کرتے ہیں اور تاریخ میں نام پیدا کرتے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں ہوتے ورنہ
 ہی ان سے کوئی کارنامہ ہوتے ہیں۔ دراصل ایسے شطرنج اور کاروگ کہ جو کچھ کیے بغیر تاریخ پر قابض
 ہوتے ہیں ڈاکٹر مبارک علی انہیں قابلِ تحسین سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ نویسی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تاریخ نویسی میں
 معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کے اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ ماضی کے مورخین
 چونکہ تاریخ کو صرف شاہی خاندانوں کے فوجی کارناموں اور فتوحات تک محدود کر دیتے ہیں اور ہر عمل
 کے روشن پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں لہذا ان کمزوریوں کی وجہ سے قاری کے سامنے یکطرفہ تاریخ
 آتی ہے اور ہمیشہ وہ شاہی خاندان ایک ماورائی درپا کیڑہ ترین روپ میں اس کے سامنے آتا ہے۔ اس
 کی ریاست مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے، بھٹے وہ چند سوئیل تک کے خطہ کا حکمران ہی
 کیوں نہ ہو، اس کا مصاف مشالی ہوتا ہے چاہے وہ دن بھر مظلوم و محکوم انسانوں کے خون کی ہولی
 کھیل رہا ہو، اس کے عدسے چہرے چار سو بھیجے ہوتے، بھٹے اس نے اپنے باپ کو ہی کیوں نہ قید کر لیا
 ہو، در ماضی کے مورخ کے لیے اس کا ہیرو دنیا کا مومن ترین و راہنما ہی پر ہیرو گارانت ہوتا تھا جبکہ اس
 پر ہیرو گار اور مومن بادشاہ کا حرم ہزاروں عورتوں سے بھرا ہوتا کہ جو سب بادشاہ کے لیے مذہباً و شرعاً
 جائز قرار دیے گئے تھے۔ ماضی کی اس یکطرفہ تاریخ نویسی نے تاریخ نویسی کو شدید نقصان پہنچا دیا
 بہت سارے حقائق مورخ کے تعصبات اور چانداری کی وجہ سے منظر عام پر نہ آ سکے یا پھر غلط طور پر پیش
 کیے گئے۔ یقیناً ایسے عمل اور تاریخ نویسی سے معاشرے کے ہرے میں زیادہ تر حقائق پوشیدہ رہے جس
 کی وجہ سے تاریخ کا مضمون مستقبل کے لیے نہ تو کارآمد رہا اور نہ ہی اس سے کوئی رہنمائی لی جاسکی۔ ہر

دور میں پرانے ادوار کی غلطیاں صرف اس لیے دھڑکی جاتی رہی ہیں کیونکہ ماضی کی تاریخ میں اکثر حقائق پوشیدہ رکھے گئے اور ان کے بیان کرنے میں جاہلاری کا مظاہرہ کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی غلطیاں مستقبل کے لیے کبھی کارآمد نہیں ہو سکتیں لہذا اسی وجہ سے مستقبل ہمیشہ زیادہ سے زیادہ پریشیاں لے کر آیا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے ماضی کی اس بکھرنے والی اور جاہلانہ تاریخ نویسی کے سلوب پر ایک سرچرہ بیٹھانے والی اور تاریخ نویسی کو اصل حقائق اور سچائیوں کے ساتھ تحریر کرنے کی نیا راہ دکھائی۔ انہوں نے شاہی خاندانوں کی لوہیت کے راز کی پردہ کشائی کی اور معاشرے کو یہ بتایا کہ دراصل یہ حکمران جو خدا کے بیٹے ہوتے ہیں اصل میں کس ہی ہیں اور طاقت کے شے میں پڑے، خدا بن بیٹے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی کے مکتومہ و مقبولہ نسخوں کو اپنی تحریروں سے اور اپنے اس انتہا پرانے دور انہیں اپنے مکتومہ سے دیکھتے ہیں اور نظام کے خلاف نے کا موصدہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ شاہی محل جو پائینگی اور شاہی عدالت سمجھے جاتے ہیں دراصل تاج کاہن شیعین ہیں۔ محلوں میں تکیا ہیں اور کڑھاپیں ہیں کہ جنہیں عوامی سیلاب ایک ہی ریلے میں بہا کرے جاسکتا ہے مگر حاکموں نے عیاری و مکاری، دھن دوت اور طاقت کے ڈر سے ان کا دفاع کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں یہ بات سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ حاکموں کی دھن دوت اور طاقت کا اصل ذریعہ بذات خود عوام ہیں کہ جو ہمیشہ تاریخ میں پردہ رہے ہیں اور ان کے کردار سے ہانا دست درصاحب قندار طبقات نے لادنا دھایا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کے ہر موضوع اور ہر کردار کو اپنا موضوع غن بنایا اور ان کے قلم نے ہر ایک موضوع کے ساتھ مکمل نصف کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جب تاریخ نویسی کو اپنے موضوع بنایا تو اس میں تاریخ نویسی کی تمام تر باریکتوں پر اختصار کے ساتھ کسی مگر جامع بحث کی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ صرف انفرادی کارناموں اور تحریف و ثناء کا نام ہی تاریخ نہیں بلکہ تاریخ میں وہ تمام حالات و واقعات رقم ہونے چاہئیں کہ جن کے اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ جو کردار صرف صاحب اقتدار ادا کرتے ہوں وہ تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں بلکہ محضوں کی تبدیلی ہمیشہ نیچے درمیان طبقات کی جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجے میں آتی ہے مگر ذکر صرف ہمارا دست طبقات کا ہی کیا جاتا ہے کہ جس سے تاریخ مکمل نہیں ہوتی اور نہ صرف ادھوری رہ جاتی ہے بلکہ ایسی تاریخ سے مستقبل کے لیے کوئی رہنمائی بھی نہیں لی جاسکتی۔ اسی طرح اگر ان کا موضوع شاہی دربار ہوتا تو انہوں نے اس کی چمک و دمک سے اپنی آنکھوں کو خیر نہ ہونے دیا اور نہ ہی

ماضی کے درباری اور سرکاری مورخ کی طرح ان کے قلم نے اس عمارت اور اس کے کینوں کے بارے میں تحریف و توصیف اور حمد و ثناء تحریر کی، بلکہ انہوں نے ان رازوں کی پردہ کشائی کی کہ جنہیں سابقہ روایتی مورخین نے یا تو چھپا رکھا تھا یا پھر خوبصورت لفاظی کے پردے میں ان کے اصل روپ کو پوشیدہ رکھا تھا۔ ان شاہی محلوں کے دن رات اور ان کے اندر ہونے والی سرگرمیوں کی خوب خوب ورسچہ پیرائوں میں تشریح کی۔

ڈاکٹر مبارک علی نے پوری دنیا کی تاریخ پر قلم اٹھایا ہے اور خصوصاً سندھ و ہند کے بارے میں ان کی تصنیف بارشمالی دنیا کے لیے کسی نمونہ قرار نہ سہ نہیں۔ یہ رہے کہ انہیں محققین کی رہنمائی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ سندھ و ہند کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں مثلاً "سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ"، "سندھ کی تاریخ" یا "ہندی" "سندھ حاشیوں کی" اور "سندھ کا ہندوستان"، "جہانگیر کا ہندوستان"، "عہد اور سیاست"، "آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان"، "تاریخ اور مذہبی تحریکیں" وغیرہ ایسے انہوں کی تاریخ پر لکھے گئے ہیں کہ جن کی قدر و قیمت یہ محقق ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ ان کتابوں نے کئی طرح کی علمی رہنمائی کی جاسکتی ہے۔ اور تو یہ کتابیں غیر جانبدارانہ تاریخ کے بہترین نمونے ہیں، اور انہیں یہ اس خطہ کے بارے میں معلومات کا میٹاں بہ خزانہ ہیں۔ جو ماضی کی بہت سے کھلی مختلف طرز پر تحریروں ہیں، اور ان کی تاریخ کے کسی بھی موضوع پر کام کرنے والے کسی عنوان پر تحقیق کرنے کے لیے یہ کتابیں بہتر رہنمائی کرتی ہیں اور ان کے مطالعہ کرنے سے طریقہ تحقیق سمجھ میں آسکتا ہے۔ عدواریہ ان کتابوں میں سندھ و ہند کے فچھے اور متوسط طبقات کے زندگی اور موجودہ مسائل پر بھی انتہائی محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے تاریخ سندھ و ہند کے کئی خفیہ گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں کہ جس سے بارے میں ماضی کے مورخین نے مکمل خاموشی اختیار کی یا پھر ان کو لفاظی و وقت قرار دے کر ٹالنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر مبارک علی نے ان تصنیفات میں نہ صرف سندھ و ہند کے ماضی اور حال کے تذکرہ کیے اور مسائل و مصائب بیان کیے بلکہ اصل کراں کرداروں کا بھی تعین کیا کہ جو ان خطوں کی تہذیبوں کی تباہی کے اصل ذمہ دار ہیں اور ساتھ ہی انہوں نے نیچے طبقات کو ہمارا دست درصاحب طبقات کے خلاف جدوجہد کا بھی درس دیا تاکہ وہ اپنے انسانی حقوق کے حصول میں کامیاب ہوں۔

ان کی تاریخ نویسی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے واقعات کا بغور مطالعہ کرنے، ایک واقعہ کی کڑی دوسرے واقعات سے ملنے کے لیے عیش و عشرت غور و خوض کرنے اور اصل محرکات کو تلاش کرنے کے بعد تاریخ رقم کی ہے اور سطحی انداز میں تاریخ لکھنے سے یکسر اجتناب کیا ہے۔

سب سے صرف وہ وقت نہیں دیکھ بلکہ ان کے اسباب و اثرات کا بھی بھٹی گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان طبقات کا تذکرہ کیا ہے کہ جو ان واقعات کی وجہ سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں جبکہ ماضی کے موزن میں چونکہ آزادانہ یا غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی سے اجتناب کرتے تھے اور کئی وجوہات کی بناء پر بہر حال تاریخ کو جانبداری کا بادہ پہناتے تھے اور تاریخ کو صرف واقعات کے تسلسل کا نام دے کر تحریر کرتے اور اسے ہی تاریخ کا نام دیتے تھے اور ان میں واقعات کے اسباب و اثرات کو یکسر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ لہذا تاریخ صرف ایک مخصوص طبقہ کی تعریف و توصیف تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور ماضی کی اس میں دیکھی تھی یہ ختم ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے طرزِ تحریر سے تاریخ کو ایک نئی جہت عطا کی اور اسے ایک نئے راستے پر گامزن کیا۔ انہوں نے تاریخی واقعات کا انتہائی خوردبینی کے ساتھ مطالعہ کیا اور ان واقعات کے تمام تر علل و اسباب پر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی ان واقعات کے اثرات کو بھی آشکارا کیا۔ انہوں نے ماضی کی تاریخ نویسی سے ہٹ کر کہ جس میں ہر واقعہ کو حاکم کے کارناموں کی فہرست میں شامل کیا گیا، واقعات کا صحیح ادراک کرینے کے بعد ان کے اصل کرداروں کو واضح کیا۔ انہوں نے ایسے واقعات کے اثرات کا بھی گہری نظروں کے ساتھ جائزہ لیا کہ جن سے متاثر تو ایک بڑی حققت ہوئی تھی مگر موزن میں نے ان کے اثرات کو بھی کہ جن سے بڑی بڑی تباہیاں آئی تھیں کو فاتح کے کارناموں کی فہرست میں شامل کیا۔ ڈاکٹر مبارک علی مثالوں سے ایسے واقعات کے حقائق کو بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے دوران کے نتیجے میں ہندوستانی عوام کی صدیوں تک برداری اور عدم استحکام کو بھی مسلمان موزن میں محمود کے کارناموں میں شامل کرتے ہیں جبکہ ایسے واقعات ڈاکٹر مبارک علی کی نظروں میں قابلِ گرفت ہیں کہ جن کی وجہ سے مگر ایک طرف ایک چھوٹی اقلیت مستفید ہوئی تو دوسری طرف ایک بڑی اکثریت ان واقعات کے بعد شدید تباہی سے دوچار ہوئی۔ اس طرح کے اعداد و واقعات کی مثالیں ان کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ جن سے واقعات کے اصل حقائق اور محرکات سمجھ میں آسانی آجاتے ہیں کہ جن پر ماضی میں کبھی بھی غور نہیں کیا گیا یہ پھر انہیں شدید تعصبات کی وجہ سے موضوع بحث ہی نہیں بنایا گیا۔

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ نویسی میں تنقیدی طریقہ کار واضح نظر آتا ہے۔ تنقیدی طریقہ تحقیق وہ ذریعہ ہے کہ جس سے حقائق کی پوری طرح چھان پھٹک کے بعد حالات و واقعات کو ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے اور یقینی امر ہے کہ تنقیدی طریقہ سے تاریخ کی اصلاح بہتر طور پر کی جاسکتی ہے اور اس طرح غلطیوں کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ اس طریقہ تحقیق سے اصل حقائق بھی سامنے آجاتے

ہیں اور مبالغہ آرائی کے ساتھ ساتھ جانبداری کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ نویسی کے لیے جو طریقہ کار منتخب کیا ہے وہ یقیناً حارت و واقعات و حقائق کے تجزیہ کرنے و ان کی پوری طرح غیر جانبداری سے جانچ پڑتال کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس طریقہ تحقیق سے معاشرے کا اصل چہرہ اور اس کو کامیاب یا ناکام کرنے والے کردار کھل کر سامنے آجاتے ہیں کہ جس سے مستقبل کے لیے رہنمائی لینا آسان ہو جاتا ہے اور ان مسائل کا مستقبل میں تذکرہ ممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی اس طریقہ تحقیق کو اختیار کرنے کی وجہ سے تاریخ نویسی میں نئے رجحانات نے جنم لیا اور سطحی طور پر تاریخ نویسی اور تاریخ پڑھنے کا رواج آہستہ آہستہ زوال پذیر ہونے لگا۔ دورِ جدید میں کئی لکھنے والوں نے اب اسی طریقہ کار کی پیروی شروع کی ہے کیونکہ اس طرح حقائق کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اپنے دماغ میں زیادہ وزن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی تصنیفات کو بہت زیادہ استفادہ حاصل ہو جاتا ہے اور چونکہ ڈاکٹر مبارک علی حوالہ جاتی انداز میں تاریخ نویسی کرتے ہیں اور ہر واقعہ کے لیے مستند اور غیر جانبدار کتب، اور دیگر تحریری مواد کا سہارا دیتے ہیں لہذا ایسی تحریر کہ جس میں مستند کتب اور تحریروں کے مواد شامل ہوں اور بعد ازاں ان کی اصل حقیقت پر طویل اور مدلل بحث مباحثے ہوں تو ایسی تحریر کے مستند ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

انہوں نے تہذیبی زوال اور معاشرتی مسائل کا جائزہ اندرونی اور بیرونی عوامل کو مد نظر رکھ کر کیا اور تنقید کے داخلی اور خارجی اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے واقعات کا جائزہ لیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کسی بھی تاریخی واقعہ کے اصل حقائق کو سمجھنے اور پرکھنے میں آسانی ہوئی اگر نہ حالات و واقعات کو سطحی طور پر بیان کرنا تاریخ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی تاریخ نویسی میں تاریخ کے قوانین و اصولوں کو مد نظر رکھ کر تحقیق کرتے ہیں تاکہ تاریخی واقعات غلط یا یکطرفہ طور پر بیان نہ ہوں اور نہ ہی ان میں جانبداری ابھرتی جائے۔ کیونکہ ایسی تاریخ پھر قصیدہ گوئی و تعصبات کے زمرے میں آتی ہے۔ ایسی تاریخ نویسی کہ جس میں تاریخ کے بنیادی قوانین اور اصولوں کو نظر انداز کیا جائے اور واقعات یا اقدامات پر تنقید کے دوران داخلی اور خارجی حوالہ کو ہالائے طاق رکھا جائے تو اس سے تاریخ میں بڑی پیچیدگیاں اور کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور تاریخ کبھی بھی صحیح سمت اختیار نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس سے کوئی رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنی تحریروں کے انداز سے ہی یہ ثابت کرتے ہیں کہ موصوف کو تاریخ نویسی کے تمام تر قوانین و قواعد پر عبور حاصل ہے اور وہ اپنی تحریروں سے معاشرے میں ارتعاش پیدا کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر مبارک علی تاریخ نویسی میں تاریخ کے امدادی اور ذیلی علوم کی مدد بھی دیتے ہیں کہ تاریخ نویسی کے لیے سب سے زیادہ اہم طریقہ تحقیق ہے کہ جس میں دیگر ممالک جن میں بعض تاریخ نویسی میں امدادی علوم کے طور پر معاون ہوتے ہیں جبکہ ذیلی علوم علم تاریخ کا کسی نہ کسی طرح حصہ بن جاتے ہیں اور ان کی مدد حاصل کیے اور انہیں مثل تحقیق کیے بغیر تاریخ نویسی بے مقصد اور بے نتیجہ ہوتی ہے۔ ہذا ڈاکٹر مبارک علی نے خصوصی طور پر اپنی تحریروں میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ تاریخ کے علمی اور ادبی حوالہ دہوں پر بھی نظر انداز نہ ہوں تاکہ ان کی تحریر جو اہمیت کا حامل ہے فقیر نے اسے اسی طرح سوں سے واقعات و احداثیت کی چھان بین سے تاریخ کے علمی اور ادبی حوالہ دہوں کی مدد سے تاریخ میں استعمال کیا ہے اور تمام مستند مواد سے خوب سے ساتھ استفادہ کیا ہے ورنہ ہی ذرائع کی مدد سے تاریخ اور تجزیے پیش کیے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریریں بہت سی تحریروں کے جن میں تاریخی اصول و قوانین اور طریقہ کے مطابق تحقیق نہیں کی گئی، بہت زیادہ مستند رکھتے ہیں و تحقیق کے لیے مشکل راہ ثابت ہوتی ہیں۔

موصوف ماضی کے روایتی مورخین کی طرح اس مباحثہ میں نہیں پڑتے کہ فلاں واقعہ کب پیش آیا، جیسا کہ کلمہ مورخین کسی بھی اہم اور ہر شے واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے وقت کے بارے میں باوجود مباحثہ میں پڑ جاتے ہیں اور موضوع کو طوالت دیتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر مبارک علی اس چیز کو اہمیت نہیں دیتے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا بلکہ موصوف اس واقعہ کے محرکات، اسباب اور اثرات کا جائزہ لیتے ہیں اور تنقید کی انداز سے اصل معادلات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کا طریقہ کار تحقیقی ہے اور تمام تر واقعات کا ہر ایک پہلو سے مطالعہ کرتے ہیں اور بعد ازاں انہیں منبہ تحریر میں لاتے ہیں۔ اس طرح واقعہ کا نہ صرف وقت کا صحیح تعین ہو جاتا ہے بلکہ اس کے محرکات، اسباب اور اثرات بھی سمجھ میں آ جاتے ہیں جو کہ مستقبل میں معاشری سداور تاریخ سے سبق حاصل کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔

انہوں نے اپنی تحریروں میں دور قدیم کے ساتھ ساتھ جدید دور کی بھی تاریخ لکھی ہے اور ماضی و حال کا انتہائی گہرائی اور مکمل سچائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد اسباب و علل کا جائزہ دیا ہے کہ جس کی وجہ سے مشرق میں رنقائی عمل یا تو مفقود ہو یا سست روی کا شکار ہوا۔ خصوصاً برصغیر کے حوالے سے ان کے تاریخی معاشری کا جائزہ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور ان سے اس قدیم تہذیب کے پورے دور کو نہ صرف سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس تہذیب کے ارتقاء سے نوالہ تک کی پوری کہانی اصل حقائق کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ان کی تحریروں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ماضی کو حال کے ساتھ

مشابہہ کر کے ان کا جائزہ لیتے ہیں اور دنیا کی کے ساتھ ان ذمہ داروں کا تعین بھی کرتے ہیں کہ جو اس تہذیبی بدحالی و زوال کے اصل ذمہ دار تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ڈاکٹر مبارک علی تاریخ میں معاشروں کی کمزوریاں بیان کرتے ہیں اور ان کمزوریوں پر تنقید کرتے ہیں بلکہ جہاں تہذیبوں اور خصوصاً سندھ و ہند کی قدیم تہذیب یا ستاروں جدید تاریخ و مدنی تنقید لگاتار ہیں اور ان میں پائی جانے والی کمزوریوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو دوسری جانب موصوف ان کے حل کے لیے تہاویز و طریقہ کار بھی بتاتے ہیں تاکہ ان کی تاریخ نویسی اپنے اصل مقصد پر رے کر سکے اور مستقبل کے لیے رہنما بن سکے اس سے معاشری صحت منس ہو سکے و ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر مستقبل میں ایسا اقدامات کیے جائیں کہ جن کی وجہ سے معاشری ترقی کر سکے اور زوال سے بچ سکے۔

انہوں نے پاکستان میں معاشری مسائل کو اچھا کر کرنے میں اہم کردار ادا کیا و اپنی تحریروں میں ان مسائل پر طویل و در پڑ اثر تحریریں لکھیں۔ انہوں نے پاکستانی معاشرے کے مسائل کا بھی تنقیدی انداز میں جائزہ لیا کہ ان میں بعض مسائل کا تذکرہ موجود نہیں ہے اور پاکستانی معاشرے کے زواں کے کچھ اسباب بیان نہیں ہوئے مگر جتنے اسباب پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے وہ تمام تر حقائق پر مبنی ہیں اور ان سے انکار کسی طور نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے سندھ و ہند و بعض دیگر تہذیبوں کے بارے میں انتہائی گراؤ قدر تصنیفات رقم کی ہیں کہ جن سے ایک تشذیب کی ساری تشذیب دور ہو سکتی ہے و ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں و تحقیق و تاریخ کا دور یہ ہیں کہ جس سے ایک بڑی خلقت کی بنیاد سمجھ سکتی ہے۔ ان کا ترقی پسندانہ، ان کی نقطہ نظر جہتی تاریخ کو سمجھنے اور طبقاتی جدوجہد میں حصہ و رشتہ پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ان کا پیغام یقیناً مفہوم و مقہور اور مجبور و محکوم قوام اور طبقات کے لیے مشعل رہا ہیں۔ ان کا تنقیدی نقطہ نگاہ صدیقی ہے۔ ان کا معاشروں کے عروج و زوال کے اسباب و علل کے بیانات حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان کے جائزے قابل غور اور تجویز و عمل ہیں۔ ان کا تحقیقی طریقہ کار قابل تقلید ہے و ان کی معصومات و اشارہ قابل ثناء ہیں اور ان کا ہم یک بحر کی مانند وسیع ہے اور مطالعہ قابل توصیف ہے۔ مگر ایک کی جو شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سوں نے دریائے سندھ کے مشرق کی تاریخ و تہذیب پر تو بہت تحقیق کی اور جامع معصومات فراہم کیں مگر انہوں نے دریائے سندھ کے مغرب کو نیکر نظر انداز کیا حالانکہ جہاں ہڈس کے مشرق میں میوہ (سندھ) کی عظیم تہذیب موجود تھی تو اس کے مشرق میں قدیم بلوچستان کی قبل از تاریخ اور جدید بحری دور کی ایک وسیع دیہات سسٹم کے آثار پائے جاتے ہیں و رہا اس خطہ

کی تہذیب دنیا کے قدیم ترین ثقافتوں میں شمار ہوتی ہے۔ بعد ازاں سب تک اس خطہ میں ایک قدیم نظام
'پن حویوں اور خامیوں کے ساتھ موجود ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا اگلا موضوع
ہو چستان کی تہذیب و ثقافت ہوگی کہ جس سے ہو چستان میں موجود ڈاکٹر مبارک علی کے روحانی شاگرد
اپنے خطہ کے بارے میں اپنے روحانی استاذ کے قلم سے مستفید ہو سکیں گے۔ یقیناً اہل ہو چستان اور
ہو چستان کی تہذیب و ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے یہ ایک گرانقدر تحفہ ہوگا۔

یقیناً ڈاکٹر مبارک علی کی تصنیفات 70 سے زائد ہیں اور ہر کتاب ایک شاہکار کتاب ہے کہ
جہیں علم کے تمام تر اصولوں اور ضروریات کو مد نظر رکھ کر ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ یہ تصنیفات سائنس
وے محققین کے لیے بہت بڑا سہارا ہیں کہ جن سے کافی حد تک مستفید ہو جاسکتا ہے۔ یقیناً ڈاکٹر مبارک
علی کی کتابوں پر تبصرہ کرنا اس کا جائزہ لینا اور ان پر بحث کرنا ان چند سطور یا اوراق میں ممکن نہیں۔ ان
کی علمی کاوشیں اتنی زیادہ ہیں کہ تحریریں اتنی جامع ہیں کہ راقم الحروف ناچیز اپنے نونے پھونے اور
ناکمل افغانوں میں اس کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ یہ تحریریں یقیناً اہم و قیمتی ہیں اور یہ امید کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک
علی کا حقیقت پسند قلم قرطاس ایضاً پر ہمیشہ سنہرے الفاظ میں سجائی بکھیرتا جائے گا۔

ڈاکٹر مبارک علی: ایک عہد ساز شخصیت

ڈاکٹر خدا شرف

دہلی یونیورسٹی انڈیا

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ذہن نے اپنے اطراف اور اپنے ماحول سے الگ تھلگ ہوتے
ہیں لیکن الگ ہوتے ہوئے بھی اپنے اطراف و دراپے ماحول کو متاثر کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔
یہ کامیابی ان کو کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ یہ دراصل ان بڑے ذہنوں کی وسعت ذہنی اور ذاتی دیانت
دری ہوتی ہے جو اپنے آس پاس کے لوگوں پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔

پروفیسر مبارک علی ایک ایسی ہی نایاب شخصیت ہیں جو ذہن کی حرص و ہوس اور جزوقداری
مست سے دور گوشہ نشینی میں مغمی کام کرتے رہے ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے
معاشرے، اپنے سماج اور اپنے لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مبارک علی صاحب اصلاً و سلاً روہیل کھنڈ کے پٹھان ہیں اور پٹھانوں والی خودداری اور راست
گوئی ان کے کردار کا بنیادی وصف ہے۔ اس کی پیدائش 21 اپریل 1941ء کو راجستھان کے تاریخی
تھبہ ٹونک میں ہوئی تھی۔ ریاست ٹونک کے بانی امیر جاں تھے جنہوں نے کرائے کے سپاہی منظم کر کے
بوٹ مار کا پیشہ اپنایا تھا۔ بعد میں انگریزوں نے ان سے مصالحت کر لی اور ٹونک کی زمین دے کر ان کو
آباد کر دیا۔ مبارک علی صاحب کا خاندان پٹھان سے آیا تھا اور ان کے قبیلے کا نام طور ترین تھا۔ ان کے
دادا سنبھل سے ٹونک آکر آباد ہوئے تھے۔ 1952ء میں جب مبارک علی صاحب کے دادا کا انتقال ہوا
تو ان کے والد مسعود علی خاں پاکستان چلے آئے جہاں ان کے دو بھائی قبل ہی سے موجود تھے۔

ٹونک کا، حوں نیم جاگیردارانہ اور نیم کاشت کارانہ تھا۔ پیاس دریا کے کنارے پیدا ہونے
والے خربورے نہایت پیچھے ہوتے تھے اور ہر خاص و عام کو دستیاب تھے۔ پٹنگ بازی اور شکار لوگوں

کے خاص مشغے تھے۔ لیکن ہندو عقائد میں شکار کی ممانعت تھی۔ ایک بار جب علاقے میں قحط پڑا تو اس کے سہاگی اثرات کو بیان کرتے ہوئے ڈکنز مہارک علی لکھتے ہیں

”عام لوگوں کی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ انہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر اپنے بچوں تک کو فروخت کر دیا تھا۔ امراء اور پیسے والوں نے ہمیشہ کی طرح غریبوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کے بچوں کو خرید کر انہیں بطور غلام یا کنیر پٹی ملکیت بنایا۔ میری والدہ کا کہنا تھا کہ ان کی دادی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چند لڑکیوں کو خرید لیا تھا، جنہیں وہ نیلے رنگ کے مولے کپڑے پہنایا کرتی تھیں۔ یہ غریب لڑکیاں گھر کا سارا کام کاج کیا کرتی تھیں۔ یہ اسی گھر میں جوان ہوئیں اور پھر یوڈھی ہو کر مر گئیں۔ نہ ان کی شادی ہوئی، نہ وہ ہی اپنے بچھڑے ماں باپ سے ملیں۔“

یہ اس زمانے کی کہانی ہے جب عورتوں کو کوئی جمہوری حق حاصل نہ تھا اور گھر کی عورتوں کی حالت بھی مددگار سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی تھی۔ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ قرآن شریف پڑھایا جاتا تھا اور گھر پر ہی تعلیم کو عورتوں کے کمرے کے سنے خط ناک تصور کیا جاتا تھا۔ نوٹک میں حسب عورتیں نہیں جاتی تھیں تو بیل گاڑی کے چاروں طرف چار دروازے کرپڑے تھے۔ نوٹک میں عید مسیحا، منی کے موقع پر بڑا جشن منایا جاتا تھا جو قصبے کی خاموش اور بے کیف زندگی میں چھوٹے چپ اور رونق پیدا کرتا تھا۔ یہ عید بارہ دن تک لگتا تھا۔

ریاست کا نوبلی کتب خانہ تھا، جہاں سے مہارک علی صاحب کے والد طہسم ہوش ربا اور داستان میر تہزہ وغیرہ کلاسیکی تصانیف ملتے تھے اور ان کو مہارک صاحب بھی پڑھ کر حفظ کرتے تھے۔ بکل اسی کتب خانے کو حکومت ہندوستان نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنادیا ہے۔

نوٹک میں عید کے دن ریاست کی طرف سے شاندار جلوس لگانا جاتا تھا جس میں سپاہی ہندو قس اورنگی تلواریں بے کر عید گاہ تک مارچ کیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں مہارک علی صاحب اپنی سوانح حیات ”دردِ شوکر کھائے“ میں تبصرہ کرتے ہیں

”اب اندازہ ہوا کہ کیوں بادشاہوں اور حکمرانوں کو جلوسوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کے ذریعے وہ اپنی طاقت و قوت، دوست اور شان و شوکت کو ظاہر کرتے تھے تاکہ دیکھنے والے ان سے مرعوب ہو جائیں۔ لیکن جہاں

لوگوں میں حکمران کی طاقت کا ڈر اور خوف بیٹھتا تھا، ان میں فقر و مہابت کے احساسات بھی پیدا ہوتے تھے کہ ان کا حکمران کس قدر عظیم و طاقت ور اور دوست مند ہے۔“

ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہارک علی صاحب نوابوں، امیروں اور چاکر داروں کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ کمزور عقول کا استعمال کرتے تھے۔ ان کو نوٹک میں مشاعرے اکثر ہوا کرتے تھے اور چھ شاعر قلم سے دم بھی ”حلی شاعری“ کیا کرتے تھے لیکن یہاں گانے کا خاص طریقہ ”چار بیت“ میں مروج تھا جو پچھو قوی کے نزدیک ہے اور پارٹیاں دف، بج کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ گایا کرتی ہیں۔ یہ صنف افغانستان سے بنی ہوئی ہے، ذریعے رانگل کھنڈ میں متعارف ہوئی اور آج بھی راج پور، بھوپال، امرتسر، مردآباد، پٹنجاویں، چاند پور وغیرہ شہروں میں جاری ہے، لیکن چار بیت کا بڑا مرکز نوٹک ہے۔ مہارک علی کے چچا زاد بھائی چار بیت لکھتے تھے جو مولے کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔

مہارک صاحب کچھ عرصہ مدرسے میں پڑھے جہاں مولوی حضرات طلباء کو ڈنڈے سے پٹینا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے اور جن و سہل یا دنہوں کا کھانا بند کرنا اور ان کے پیروں میں زنجیریں باندھنا بھی مروج تھا۔ اس لئے مدرسے کا تصور عقوبت خانے یا جیل جیسا تھا۔ ویسے بھی ان مدرسوں میں علم گھر گھر چاکر کھانا لگتے تھے جو باعزت طریقہ نہیں تھا۔

نوٹک میں نوابین کی حکومت 1947ء تک جاری رہی، جب کہ دیسی ریاستوں کو ظہین یا یمن یا پاکستان میں ضم کر دیا گیا تھا۔ نواب کے بیٹے ”صاحبزادے“ کہلاتے تھے، جو اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ مہارک علی لکھتے ہیں:

”نواب کے خاندان کے مرد حضرات صاحبزادے کہلاتے تھے۔ یہ لفظ بھی اپنے اصل معنی کھو چکا تھا اور اب اس سے ناکارہ، نکلے اور عیاش مراد لی جاتی تھی۔ معاشرے میں ان صاحبزادوں کی کوئی عزت بھی نہیں رہی تھی۔ ان کا گزراہ اپنی جائیدادوں کی آمدن پر ہوتا تھا جو کم ہو کر بڑھتے ہوئے خاندانوں کے لئے ناکافی ہو رہی تھی۔ اس لئے ان کی حویلیوں ان ہی کی طرح اندر باہر سے خستہ اور بوسیدہ ہو کر ”سیب زدہ ہو گئی تھیں۔ حالت کی تبدیلی نے ان صاحبزادوں کو اس طرح سے اپنے بہاؤ میں لیا کہ یہ اس کے دھارے میں گم ہو گئے۔“

دیئے گئے تو آہستہ آہستہ انہوں نے تشدد کو اپنایا۔ آج جو تعلیمی اداروں میں طالب علموں کا تشدد اقلیت رکھتا ہے، اس کی ابتداء یوب خاں سے ہوئی تھی۔ انہوں نے درحقیقت طالب علموں کو غیر سیاسی بنا کر جمہوری روایت پر کاری ضرب لگائی۔ اسید یہ ہے کہ بعد میں آنے والی حکومتوں نے بھی چاہے وہ آمرانہ ہوں یا جمہوری، اس کو اپنے حق میں پایا، اسی لئے آج تک تعلیمی اداروں میں انتخاب نہیں ہوتے۔“

اس علم و فن، حوال میں سنی کالج حیدر آباد (ایونٹ) کے استاد تفضل داؤد جیسے اسکالر بھی تھے جو بجلی جانے کی صورت میں گھر سے لڑکی ہوئی موسم بتی کی روشنی میں کلاسز پڑھاتے تھے۔ داؤد صاحب نے جو دو تاحہ سرکاری فرقہ پرستانہ کتاب "شیواجی دی گریٹ" کے جواب میں "ریٹل شیواجی" لکھی اور اس کا نسخہ جہ دو تاحہ سرکار کو دینے کھلتے گئے تو تعریف ہونے پر سرکار صاحب اٹھ کر گھر کے دروازے پر ہو گئے تھے۔ اس وقت اسے باوقوم پرستانہ تاریخ نویسی کا گڑھ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ فرقہ پرستی نے تاریخ کو بھی زہر توڑ کر دیا، در نتیجہ تقسیم کی شکل میں سامنے آیا۔ داؤد صاحب نے کئی کتابیں لکھیں جو مسودات ہی میں ختم ہو گئیں، وہ کہہ کرتے تھے

”مبارک علی خاں! ہم نے زندگی میں ایک بڑی غلطی کی اور وہ یہ کہ شہرت کی کبھی خواہش نہیں کی۔“

اس سے مبارک علی لکھتے ہیں کہ خاکساری پی جگہ مگر پی صدحیت کو منوانے کے لئے شہرت بھی ضروری ہے۔ داؤد صاحب ہی کی طرح کے طلباء، نواز پرپلس مرزا عابد عباس تھے جو طلباء کی ضروریات کے لئے جیب سے خرچ کیا کرتے تھے۔ سنی کالج میں مباحثوں اور مشعوں میں مبارک علی صاحب سرگرمی سے حصہ دیتے تھے اور ایک بار ”دلی کا“ خری یا دگار مشعرہ کے شو میں انہوں نے مصطفیٰ کا کردار بھی ادا کیا تھا۔

1961ء میں ایس کے رحیم ہائی اسکول میں مبارک علی کا تقرر بطور استاد ہوا، لیکن چھٹیوں میں انہیں ملازمت سے نکال دیا گیا تو وکیل کے ذریعے انہوں نے چھٹیوں کی تنخواہ وصول کی۔ اس کے بعد سندھ یونیورسٹی سے انہوں نے جزل ہنری میں ایم۔ اے کیا، جہاں لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی احمد بشیر جیسے کشادہ ذہن استاد تھے۔ انہوں نے زندگی میں کبھی گھر نہیں بنایا اور رات دن مطالعہ و تدریس میں غرق رہتے تھے۔ بہن مشروں کے استحصال کو برداشت نہیں کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کے

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبارک علی نوابوں، جاگیرداروں اور ان کے مفت خور خاندانوں کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ یہ طبقہ دوسروں کی محنت پر پلتا ہے۔ مبارک علی اور ان کے بزرگ 1952ء میں کھ کھ پاد کے ذریعے سندھ پہنچے تو یہاں انہوں نے کئی پرانی روایت کو وقت کے تقاضوں کے تحت نئے نئے کھرتے دیکھے، ان میں سے ایک پڑے کی روایت تھی۔ یہ وقت پرانی اور مصنوعی عظمتوں کے نوٹے کھرتے کا وقت تھا۔ سندھ کے ریگزار میں جب انہوں نے بطور مہاجر جموں میں وقت گزارا اور پھر ماں گاریوں کے: ب میں موشی کی طرح یہ پور خاص پہنچے تو چھڑ گئی ”ارتدیب کے آثار نظر آئے۔ حیدر آباد میں کسی طرح مرچپانے کی جگہ ملی تو نظر آیا کہ یہ گھر اکثر ہندو حضرات کے تھے اور بڑے منقش و صاف تھے، لیکن ان کو تقسیم کر کے Slum میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن باثراور رشتہ دہندگان نے بڑے عالی شان مکانات اور دوکانیں، کٹ کر دی تھیں۔ تعلیم یافتہ عامل سندھیوں کے مکانوں میں بے قصائیوں کی پھینکیں بندھی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ حیدر آباد کے صاف ستھرے پارک، باغ اور کلچرل ادارے ختم ہوئے اور ہر طرف مکان، دوکان اور دفتر بننے لگے۔ آہستہ آہستہ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں دیوں، شاعروں کی نشیں جمنے لگیں۔ اختر نصاری، اکبر آبادی کا رسامہ ”نئی قدیں“ ایک ہوٹل سے ہی شائع ہوتا تھا۔ گھروں کی تنگی کو شہر کے ہوٹلوں نے دور کیا تو فضا میں کچھ خوشگوار پیدا ہوئی۔ حیدر آباد کے مشعوں میں جگر، جوش، فراق، جذبی و سرور بارہ بنگلوی جیسے شاعرانہ پائے تھے اور دادو جھین پاتے تھے۔

مبارک علی غریبی اور پسندگی کے حالات میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ جماعت اسلامی کے دفتر میں ان کو فیس سکریٹری کی ملازمت مل گئی، لیکن تین ماہ تک بیگار کرنے اور تنخواہ کا مطالبہ کرنے پر ملازمت سے نکال دیئے گئے۔ یہ پاکستان میں استحصال کا ناپسندیدہ تجربہ تھا۔ انہوں نے کالج میں مباحثوں Debates میں شرکت شروع کی تو ان کی شخصیت میں اپنی بات لوگوں کے سامنے کہنے کی صداہیت بڑھی۔ ابتدائی پاکستان میں مباحثے سیاسی و سماجی موضوعات پر ہوتے تھے لیکن یوب خاں کے مارشل لاء میں جب خوف کا حوال پیدا ہوا تو مباحثے بھی بے جان اور موضوع بھی محدود ہونے لگے۔ پھر جب فوجی حکومت نے طلباء یونین پر پابندی لگائی تو جمہوریت کا ایک اور ادارہ ختم ہو گیا۔ مبارک علی اپنی سوانح میں لکھتے ہیں:

”طالب علموں کی مخالفت کی وجہ سے یوب خاں نے تعلیمی اداروں سے یونین کا خاتمہ کر دیا۔ جب طالب علموں کے لئے جمہوری راستے بند کر

مسودے کتابی شکل حاصل نہ کر سکے۔ بشیر صاحب نے عہدِ واجد علی شاہ کی بی جان طوائف پر ایک ناول لکھ کر ایک مورخانے جو کتابت کرتے تھے، یہ کہہ کر کتابت کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اتنی فحش کتابت نہیں کر سکتے ایوب خاں کے نام سے شائع شدہ کتاب Friends Not Master منظر عام پر آئی تو بہت سے پروفیسروں نے خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ریڈیو پر اس کتاب کی ”ادبی فلسفیانہ“ سیاسی اور تاریخی توضیحات“ شروع کر دیں لیکن بشیر صاحب اس موقع پرستی سے دور رہے۔ اس ماحول کے مضراثرات پر مبارک علی لکھتے ہیں

”لوگ ایوب خاں نہ امریت سے ڈر گئے اور اس کی خوشامد و چالپوسی میں مصروف ہو گئے۔ اس کا فائدہ آنے والے آمروں کو ہوا کہ جنہوں نے معاشرے کی اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خوشامدیوں کی ایک فوج تیار کر لی۔ اس سے معاشرے میں افراد کا کردار بدلتا چلا گیا۔ لوگوں میں مزاحمت کے جذبات کم ہوتے چلے گئے اور خوشامد کے عوض اپنی قیمت بگا کر خود کو فروخت کیا جانے لگا۔ مزاحمت کی جگہ سمجھوتے نے لے لی۔“

مبارک علی دیکھ رہے تھے کہ ملک میں آہستہ آہستہ ذہنی وسعت اور لکری کشمگی کے نئے ماحول خائف ہوتا جا رہا تھا اور اسی نئے سڑکوں، بازاروں اور دینی ادروں میں بھی تشدد کی کارفرمائی نظر آنے لگی تھی۔ اسی ٹھٹھن کا نتیجہ یہ ہوا کہ حمد بشیر صاحب جمہوری حکومت کے زمانے میں مذمت سے نکال گئے اور خراب و خستہ اپنے وطن قسور میں موت سے ہمتا رہ گئے۔ دوسری طرف ڈاکٹر یار محمد جیسے استاد تھے جو ترقی حاصل کرتے کرتے ڈین فیکلٹی تک ہی گئے، نہ معلوم کیوں وائس چانسلر بن گئے، حالانکہ خاصے تیز طرز آدمی تھے۔ معاشرے اور شعبہ تعلیم کی بد نصیبی یہ کہ پاکستان میں داؤد صاحب اور بشیر صاحبان کم ہوتے گئے اور ڈاکٹر یار محمد کی اکثریت ہو گئی۔

مبارک علی نے 1963ء میں فرسٹ ڈویژن میں ایم۔ اے کیا۔ وائس چانسلر نے اس شرط پر ان کو جو نیرین پکھر مقرر کیا کہ

”ایک تو کینٹین میں بیٹھنا چھوڑ دو، دوسرے، طالب علموں کو میرے خلاف مت بھڑکانا۔“

شعبے کے سینئر استاد رہے جاؤ اخیل رکھتے، دو نواداران کو دور دور ہی رکھتے تھے۔ وائس چانسلر بھی پروفیسروں سے پورے ہاتھ کا ریڈروں سے آدھے ہاتھ کا درجو نیرین پکھر سے دور کا مصافحہ کرتے تھے

اور اس تازہ سے انتظار کرنا کہ جی ماکرتے تھے۔ ایک سرکاران کے دفتر سے جاری ہوا کہ سارا دن ترقی کے وقت اس تازہ ان کے سامنے پیش ہوں، جس پر سندھی کے پروفیسر جوتی نے شعر لکھ کر واپس کر دیا۔

اے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

چونکہ زمانہ ایوب خان کی آمریت کا تھا اس لئے یونیورسٹیوں میں بیوروکریسی کا عمل دخل بڑھنے لگا اور فوج کا کنٹرول بھی۔ نتیجتاً مجھے سکالر ملک کے باہر نکل گئے یا گناہی میں سر کرنے لگے۔ مبارک علی کے ذہن کی تشکیل و تربیت جبر کے اسی ماحول میں ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں۔

”اس دوران میں نے نہ صرف تاریخ پڑھی، بلکہ ادب کا بھی مطالعہ کیا۔

تاریخ اور ادب کے اس مطالعے سے ہی مجھ میں تاریخ کا شعور پیدا ہوا۔

آج بھی، جب رات کی خاموشی میں لیٹا ہوں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو

ان لمحات کی خوشی و مسرت کو آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ

میں نے ٹاسٹ ٹی کی ”War and Peace“ سر دیوں میں پڑھی تھی۔

رات کی خاموشی اور چاند کی ٹھنڈی روشنی کے ماحول میں اس ناول کو پڑھتے

ہوئے میرے تخیلات مجھے کہیں کہیں سے جاتے تھے۔ دوستوفسکی کی

”Crime and Punishment“ اور ”برادر کرنا زوف“ نے ذہن پر

گہرے اثر ڈالے۔ ان ناولوں کے ذریعے مجھے انسان کے دکھ کا احساس

ہوا۔ اس لئے جب بھی میں نے ”تاریخ پڑھی تو اس میں مجھے ان ناول

نگاروں کے احساسات و جذبات کی گہرائی ”نظر آئی۔“

مبارک علی کو کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا، اس زمانے کے پاکستان

میں یورپ، امریکہ، روس اور بھارت سے کتابیں بغیر روک ٹوک آتی تھیں۔ اردو کے اسکالر

احسن قادری کے ساتھ یہ بے اصدافی ہوئی کہ سندھ یونیورسٹی سے نکالے گئے، پھر کچی جامع میں

ملازمت کی جہاں حکام سے نہ بنی تو دوبارہ سندھ یونیورسٹی میں پیکچر کے عہدے پر تقرر ہو

جبکہ ان کے شاگرد پروفیسر بن چکے تھے۔ اس ذلت سے مفر حاصل کرنے کے لئے دو روز ایک

السنہ یا احباب کے خا کے لکھا کرتے اور انہیں سنایا کرتے تھے۔

1963-70ء کے سات سال مبارک علی صاحب سندھ یونیورسٹی میں رہے۔ بی ایچ ڈی کے

لئے اسپین کا وظیفہ ملا مگر وائس چانسلر نے اجازت نہ دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پولیس اور ریجرز آئے دن طلبہ اور ساتھ کے ہاسٹلوں کی تلاشی دیتے رہتے تھے، تاکہ نئی نسل اور اس کے معماروں کو خوف زدہ کر کے احتجاج کے جذبے کو مٹا دیا جائے۔ خدام مصطفیٰ شاہ وائس چانسلر بنے تو انہوں نے سندھی اور مہاجر ساتھ کی انگلنگ سینٹیکس بلا کر ملاقات کو بڑھا دیا۔ ان سے ملاقات کا ایک منظر ”مجھے یاد ہے کہ میں ظفر حسن شاہ کے ساتھ وائس چانسلر سے ملنے گیا تاکہ ان سے درخواست کی جائے کہ وہ میری ٹریپس گرانٹ کے کاغذات بھجوا دیں۔ جب ان کے سامنے پیش ہوئے تو میں نے دیکھا کہ بڑی بڑی مونچھوں والی شخصیت میرے سامنے ہے، یہ وہی سی سے زیادہ مجھے تعنیدار لگے۔ میں نے بڑے ادب سے اپنی بات کہی تو کڑک کر انگریزی میں ارشاد ہوا کہ ”اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔“

بعد میں یہی شاہ صاحب وزیر تعلیم بنے، اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وزارت میں انہوں نے کتنوں کو بے عزت و بے روزگار روپے وقار کیا ہوگا۔ شاہ صاحب جیسے متعصب افسران کی رکاوٹوں کے باوجود مبارک علی کسی طرح اکتوبر 1970ء میں لندن کے کوئین میری کانجنگ گئے۔ یہاں تعلیم کا معیار درموقع بہت بہتر تھے، نسلی تعصب بھی تھا، لیکن دنیا بھر کے مخلص دوست بھی۔ بی بی سی (اردو سرویس) پر کچھ پروگرام سننے لگے تو آمدنی کا سہارا تھا آیا۔ ذیل روٹی کی ٹیب فیکٹری میں بھی دیکھ ایڈ پر کام ملا، پھر کرسکس کے موقع پر بڑے سنوروں پر کام کیا، سیل لگتی تھی جو دراصل گھنیاں ہوتا تھا۔ یہاں خود محنت کرتے اور اپنے دوستوں کو محنت کرتے دیکھ کر مبارک علی کے دل میں محنت کا وقار اور محنت کش کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔

یہ زمانے نیگی خاں کی آمریت کا تھا اور پاکستان (مغربی) کے باشندوں میں بنگالیوں کے بارے میں ناپسندیدگی بلکہ نفرت پائی جاتی تھی، اسی نفرت کا نتیجہ، 1971ء کے قتل عام اور بنگلہ دیش کی آزادی کی شکل میں ہوا، جس پر فیض نے کہا تھا۔

ہم کہ گھبرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے ڈھلیں گے کتنی برسوں کے بعد

لندن میں علمی فضا بڑی موافق تھی لیکن فیس کا بوجھ برداشت نہ کر پانے کی بناء پر مبارک صاحب کو جرمنی کی Rohr یونیورسٹی میں داخلہ دینا پڑا اور برطانیہ کا مزید ساہ قیام ختم ہوا۔ یہ فروری 1972ء تھی جب وہ جرمنی پہنچے اور ایک نوجوان سے دلچسپ مکالمہ ہوا

”کہنے لگا کہ تم جرمنوں کو کیسا سمجھتے ہو؟“ میں نے کہا، ”وہاں تو جرمنی کے بارے میں ایک ہی بات معلوم ہے اور وہ یہ کہ ہٹلر یہاں کا تھا اور ہمارے ایک شاعر جوٹس نے تو اسے ”ہٹلر اعظم“ کا خطاب دے دیا تھا۔“ اُس نے چلتے چلتے سر پکڑ لیا اور کہنے لگا ”کیا کوئی ہٹھوون، گوٹے اور ہٹلر کو نہیں جانتا؟“ میں نے کہا جانتے ہوں گے مگر مشہور نہیں ہیں، جرمنی کی پہچان تو اب صرف ہٹلر رہ گیا ہے۔“

بہر حال پارت نام کام اور چھوٹی موٹی نوکریوں کے مبارک علی یونیم شہر میں پڑھتے رہے اور 1974ء میں ویدین سے ملنے پاکستان گئے تو ذکیہ پات سے شادی بھی کر لی۔ وہاں جرمنی گئے تو شادی شدگان کا ہشل ملا۔ جرمنی اور یورپ ان دنوں بامیں بازو کی تحریک کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ یہی زم، ادیت نام، ٹیسل ہاؤس، ایوب خاں کازرل ور ہیر بنگلہ دیش ایسٹنگ رہا تھا کہ کہ دنیا سرمایہ داری سے کٹ چکی ہے اور نوجوان اب پرانے نظام کو تبدیل کرنے والے ہیں۔

کون پابند جنوں فصل بہاراں میں نہ تھا،

اس برس ٹکبہ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

مبارک علی اور تیکم کو تو ہشل یونین نے کمرہ ہی اس شرط پر دیا تھا کہ وہ یونین کی ہڑتاؤں اور جیسے جیسے میں شامل رہیں گے اور یہی مبارک علی چاہتے بھی تھے۔ یہاں ڈکریٹ کرنے والے کو احترام کی نظر سے دیکھ جاتا ہے اور مگر کو ”ڈکٹر فائزینی ڈاکٹر ہاپ“ کہا جاتا ہے وروہ سلوک بھی شفقانہ ہی کرتے ہیں، جیسے اپنی ادا اداں سے۔ جرمنی کی روایت ہے کہ جب یہ فیئر کسی دوسری یونیورسٹی جاتا ہے تو اپنے ریسرچ اسکالروں و اسٹنٹ کو ساتھ رکھتا ہے تاکہ وہ بھی نئی مصنوعات و تجربات سے بہرہ ور ہو سکیں، ہمارے یہاں تو زیادہ تر استاد اپنے شاگردوں سے فاصلے رکھتے ہیں مگر اپنی ناپاکی اولادوں کے لئے دس طرح کی بے یارمی اور حکام کی چا پوسی کرتے ہیں۔ بقول مبارک علی جرمن سس پرست Racist تو ہیں لیکن کام کے وطن اور ایمان دار بھی ہیں۔ اسی لئے لیٹن نے کہا تھا کہ اگر جرمن کسی ریلوے اسٹیشن پر حملہ بھی کریں گے تو پلیٹ فارم ٹکٹ ضرور خریدیں گے!

1976ء میں مبارک صاحب جب ڈاکٹریت کر کے وطن لوٹے تو دو بیٹیوں عطیہ اور شہلا کا اضافہ ہو چکا تھا، دونوں آجکل امریکہ میں وائس کین کا نام روشن کر رہی ہیں۔

(2)

نمبر 1976ء _____ وطن عزیز واپسی، پہلے کراچی انٹر پورٹ، پھر حیدرآباد، سڑکوں پر ڈھول، بجلی ناقابلِ غبار، شور شرابہ اور سندھ کی گرمی لیکن گھر تو گھر ہوتا ہے۔
گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن
در بدر تھے تو یاد آتا تھا

اگلے دن جہانگیر دینور کی پہنچے یہ سوچ کر کہ یونیورسٹی اور شہر کے ساتھ مبارک صاحب باوریں گے، استقبال کریں گے اور طالب علم پی۔ ایچ۔ ڈی (جرمنی) کا احترام کریں گے۔ بھوشانی کا زمانہ تھا۔ اس چانسلر شاعر دانش ور شیخ ای۔ تھے جو دربار سجانے کے شوقین تھے، صدر شعبہ حمیدہ صوڑو، جنہوں نے مبارک علی کو معصوم کس کزور سے میں دوہرا جوئے کر یہ ورنہ بہت سے قوم پرست توں کو برداشت نہیں کر پار ہے تھے۔ شیخ یا زے ملاقات کا منظر

”ہم سب حاضرین دم بخود خاموشی سے ان کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب شیخ صاحب نہادھو کر آئے تو سب نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ احمد سلیم نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے ادب کے ساتھ اپنے تھیس کی ایک کاپی، جو چھپ چکی تھی، ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس کو پٹ کر ادھر ادھر سے دیکھا، پھر پوچھنے لگے۔ ”آپ نے تاج محل دیکھا ہے؟“ میں نے کہا ”جی نہیں۔“

بولے۔ ”پھر مضمون پر تاج محل دیکھے بغیر کتاب کیسے لکھ دی؟“

سوچا، کہوں کہ غلطی ہوئی، لیکن اب تو ایسا ہو چکا۔ اس کے بعد ان کی توجہ دوسرے امور پر ہو گئی۔ میں مصر جنوں کے درمیان آدھا گھنٹہ باادب بیٹھ رہا، پھر جازت چاہی۔“

دسمبر تک تنخواہ نہ ملی، پھر جاگیر دار دانش ور شاعر وائس چانسلر نے معطل ہی کر دیا۔ الزام تھا کہ مبارک علی نے ان سے بدکلائی کی ہے، جرم یہ تھا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کھس کرنے میں زیادہ عرصہ کیوں

لگایا؟ پھر ایک وزیر کی مہربانی سے بھلی کے آثار پیدا ہوئے

”تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ ایک معافی نامہ لکھ دو۔ باقی میں سنڈیکیٹ سے کرا لوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”کیسا معافی نامہ؟“

بولے۔ ”یہی کہ تم نے میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔“

مگر میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔

”بھئی ٹھیک ہے مگر یہ معافی نامہ نہیں ہوگا تو بات مجھ پر آئے گی کہ تمہیں کیوں معطل کیا؟“

میں نے کہا۔ ”یہ آپ کا درد ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق؟ اور اگر معافی نامہ دینا ہوتا تو یہ شروع ہی میں دے دیتا۔“

مبارک علی نے معافی نامہ نہ دیا، اس تمام صورتحال کھڑی۔ شیخ یا زے سنڈیکیٹ میں تھوٹ بولی دیا کہ مبارک علی نے ان سے معافی مانگ لی ہے اور ملازمت بحال کر دی گئی مگر بقایا جات ضبط کرے گئے۔ تاریخ کے ساتھ یک طرفہ قرعہ یہ ہوا کہ اسے ”مسم تاریخ“ اور ”جنس تاریخ“ میں تقسیم کر دیا گیا ورنہ ساری دنیا میں تاریخ کو قدیم، عہد وسطیٰ اور جدید کے زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

مبارک علی ملازمت کی بھان سے نہر آزا ہوئے تو اپنے کمرے میں گوشہ نشین ہو کر کام کرنے لگے۔ اس دوران ڈاکٹر محمد بشیر در دوسرے اہم سائنس دان بھی معطل ہو چکے تھے۔ پھر جب ضیاء الحق کی آمریت آئی تو نصف مصطفیٰ بھی اپنے جلو میں رہی۔ پاکستانی ہیرل ویکوئرز دانش وروں، وریسی ویکوئرز کے لئے یہ دور ابتلا اور عذاب کی سیاہ رات کی طرح تھا۔ اس دفعہ مبارک علی پر نرم گنا کہ نبیوں نے مذہبی کتابیں جدائی دیں۔ مبارک علی نے جو ب دیا کہ تاریخ گواہ ہے کہ کتابیں جانے کا کام ہمیشہ ور ہر ملک میں پابند مذہب دگول نے کیا ہے۔ لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی اور کمرہ چھین لیا گیا۔ شیخ یا ز نے رنگ بدلا اور اپنے کمرے کے باہر باجماعت نمازیں پڑھنے لگے۔

روٹی تو کسی طور ک کھائے سمجھند

لیکن نہ کچھ شوخی چلی باوصہ کی۔ ساتھ اور طلباء نے ان کے خلاف محاذ بنایا اور ہر ممکن الزام لگایا ورجیدر آباور بچن کے رائل و حاکم کے سامنے شیخ صاحب کو بے عزت کیا گیا۔

منصور کے پردے میں ’خدا‘ بول رہا تھا

نے وائس چانسلر بڑوصاحب بے تو مبارک علی بمشکل صدر شعبہ بنے ورجیدر کھوڑو جو کہ یونیورسٹی کم آتی تھیں، مہینے میں صرف چھ دن حاضری کی تنخواہ پانے لگیں۔

جرمنی سے واپس آ کر مبارک علی نے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر "علی وادبی کلب" کی تجدید اور ایک شاعری ادارہ "گنی شروع کیا۔ اس کی اولین کتاب "تاریخ کیا ہے" اسی ادارے سے شائع کی لیکن فروخت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ یہ وہ تر بک سیر نادہندہ تھے۔ کتابت میں اغلاط دکھائی دیں تو مبارک صاحب نے خود کتابت شروع کر دی اور چار کتابیں: "تاریخ اور شعور"، "آخری عہد مقلد کا سندھستان"، "سندھ کی تاریخ کیسے لکھنی چاہئے" اور "تاریخ کے نظریات" اپنی کتابت سے شائع کیں۔ کتابت کا مرحلہ تو طے کیا لیکن بک سٹروں سے ہر نئی پڑی۔ اپنی کتابوں کے حوالے سے مبارک علی لکھتے ہیں کہ: "غالب میں ان کی کتابوں کو زیادہ پسند نہیں کیا گیا سین سندھ کے چھوٹے شہروں اور دیہات میں ان کی تحریروں کی پذیرائی زیادہ ہوئی اور ان کو یکپارہ کے لئے جایا جاسکے۔ لیکن جب 1986ء سے ایم کیو ایم کا اثر بڑھا تو سندھ کی ترقی پسند سیاست بھی سندھی مہاجرین سے مل کر تقسیم ہو گئی۔

سندھ یونیورسٹی میں مبارک صاحب کو ملازمت تو ملی لیکن کسی اہم کمیشن میں شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان کے ساتھ کوئی ایسا رابطہ۔ ایچ۔ ڈی کر سکا کیونکہ جو موضوع مبارک علی ریسرچ کے لئے تجویز کرتے تھے، یونیورسٹی ان کو مسترد کر دیتی تھی۔

فروری 1985ء میں ایک ٹیکہ کی حکومت پر مبارک علی لاہور گئے تو نگارشات پبشرز نے ان کی کتابیں شائع کرنے کی آفر دی۔ یہ رشتہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور ان کی سول پر قطع تعلق ہو گیا۔ یونیورسٹی میں تحفوں اور تصعب کی فضا تو پسند ہی سے تھی، ایک دن حاضری کے سوال پر ایک سیاسی کارند نے مبارک علی کے ساتھ بدکلی کی۔ پھر حیدر آباد میں، ٹرنگ، قتل، کرپشن اور جرائم کے واقعات بھی بڑھنے لگے تھے۔ چنانچہ تادمہ ہو پانے پر انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا اور لاہور آ گئے۔ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی پانچ سالہ مدت کو سروس سے منہا کر دیا اور ان کو پنشن میں نقصان ٹھہرا دیا۔ بجائے اس کے کہ ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تحسین کی جاتی، یہ ڈگری مبارک علی کے لئے سزا کی وجہ بنا دی گئی۔ لاہور میں اشاعتی ادارے "مشعل" کے لئے کام کر رہے تھے کہ جرمن سفارت خانے کے "گوئے انسٹی ٹیوٹ" کی لاہور شاخ کے ڈائریکٹر بن گئے، کیونکہ جرمن زبان اچھی جانتے ہیں۔ یہاں بھی ماحول سازگار نہ تھا۔ مبارک علی اس عجیب و غریب چویشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہمارے معاشرے میں اب تک گورے لوگوں کا بڑا رعب ہے اور ان کا شکار عام طور پر ہمارا طبقہ و امرا اور اس کی خواتین ہیں۔ کیونکہ میں جب بھی

جرمنوں کے ساتھ کسی محفل میں گیا، لوگوں کی ساری توجہ انہی کی طرف ہوتی تھی اور ان کی خوشامد میں سب پیش پیش رہتے تھے۔ اس لئے مجھے یہاں دو قسم کے تعصبات سے واسطہ پڑا ایک، اپنے لوگوں سے اور دوسرا، جرمنوں سے، جو مجھے اپنے برابر کا درجہ دینے پر تیار نہ تھے۔"

مبارک صاحب گوئے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے بھارت گئے لیکن 1992ء میں انٹرین کونسل فار ہسٹریکل ریسرچ I.C.H.R کی دعوت پر اکبر سیمینار میں انہیں بطور تاریخ داں دہلی میں مدعو کیا گیا تو ہندوستان میں بھی ان کی شناخت قائم ہونے لگی۔ 1995ء میں وہ دونوں ملک کی دوستی کے فروغ کے سلسلے میں ایک گروپ کے ساتھ پھر ہندوستان آئے اور یہاں بہت سے لوگوں سے مراسم قائم ہوئے۔ دہلی میں ان کو بہت سے لوگ ملے جو 1947ء میں ہجرت کر کے مغرب سے آئے تھے اور اپنے وطن اور اپنی زمین کے دیدار کو ترستے تھے، لیکن ویزا کی پابندیاں آڑے آتی ہیں۔ یہی حال مبارک علی صاحب کا بھی تھا جو ہندوستان تو کئی دفعہ آچکے تھے، لیکن اپنی بانی سرزمین نوک چانے کے لئے قریب رہے تھے۔

پھر مئی 1996ء میں یہ موقع بھی نصیب ہوا کہ نوک واپس جاسکے۔ یہاں ان کی حالت انتظار حسین کے کرداروں کی طرح ہوئی جو ہر کے شہر میں رہ کر یو۔ پی کے آم کے باغوں، ٹوکلی کی آواز اور خاموش دیر سکون گلیوں و قصبہاتی بازاروں کو یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔ بے نی یادوں کا ایک خوشگوار منظر مبارک علی کی زبان پر۔

"میں بس میں جیسے ہی بیٹھا اچانک میرے ذہن میں آیا کہ جن بزرگ خاتون سے بات ہوئی تھی، وہ تو بچپن کی تھیں۔ ایک دم ماضی کی تصویر ذہن میں آ گئی۔ میں چھوٹا سا تھا، اُس وقت بھی کتابوں سے دلچسپی تھی، ہم نے ان کے گھر کے ایک کمرے میں لاہوری بنائی تھی۔ ایک دن میں سر جھکائے کتابیں اٹھائے جا رہا تھا، یہ چہوتے پر کھڑی تھیں، ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا، خوبصورت اور حسین۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"اے اڈا نظریں اٹھا کر ہمیں بھی تو دیکھ لیا کرو۔"

میں نے چاہا کہ میں بس سے اتر کر فوراً ان کے پاس جاؤں اور کہوں کہ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی اور بس ٹرنت بے پور کی

طرف چاہی تھی۔“

ٹونک کے آبائی مکان اور بچپن کی گلیوں میں چالیس سال بعد جا کر جو حالت مبارک علی کی ہوئی، اس پر جوشِ شمع آبادی نے کیا خوب کہا تھا۔

پنے کسکی کے رنگ محل میں جو ہم گئے
آنسو نکل پڑے در و دیوار دیکھ کر

(3)

ڈاکٹر مبارک علی اور ان کی اہلیہ ڈکیہ آپامیچ تین صابزادیوں کے 1989ء سے لاہور شہر میں مقیم ہیں۔ درِ برصغیر کے تمام شہروں کی طرح یہ مغل شیرینی پرانی شناخت کو فراموش کر کے نئی پیچیں قائم کر رہا ہے اور شاید یہی تاریخ کا بہاؤ بھی ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا۔

جو تھ نہیں ہے جو ہے نہ ہو گا یہی ہے اک حرفِ مہرمانہ
قریب تر ہے نوید جس کی اسی کا مشاق ہے زمانہ
مری صراحی میں قطرہ قطرہ نئے حوادث فیک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

مبارک علی گوئے انسٹی ٹیوٹ کی رہنمائی ایجنسی ڈھنگ سے کر رہے تھے کہ جرمنی سے نیا ڈائریکٹر آگیا اور مبارک علی کو تو درخواست کیا ہی گیا، انسٹی ٹیوٹ بھی بند کر دیا گیا۔ یہ تمام واقعات انہوں نے اپنی خودنوشت ”دردِ ٹھوکر کھائے“ میں لکھے ہیں اور بڑی ایمان داری و حوصلے سے لکھے ہیں۔ پچھلے سال اس سوانح کا ”حصہ میری“ یا ”(کلاشن ہاؤس لاہور) کے عنوان سے چھوٹی بیٹی نین تارا کی فرمائش پر کتب و رشتہ سوانح سے۔ بیٹی بیٹی عطیہ مرید میں بیٹی۔ بیٹی کی کر رہی ہیں، ان کا داخلہ مشہور گاندھینی خاتون مرحومہ نزد دیش پانڈے نے اہلی کی جو ہر حال سہو و بیوشی میں وزیراعظم اندر کر۔ گجرات کے حاصل حکم سے کرایا تھا۔ شہد نے وکالت کا امتحان کیا تھا۔ درودنی لیس امریکہ ہی میں وکالت کر رہی ہیں۔ چھوٹی بیٹی نین تارا نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کیا ہے اور وہ لاہور میں دامین کے ساتھ رہ کر ہی کام کر رہی ہے۔

”دردِ ٹھوکر کھائے“ میں اگر واقعات زیادہ تھے تو ”میری دنیا“ میں خیالات و تجربات کی تفصیل

دیا ہے۔

مبارک علی لکھتے ہیں کہ ملازم اور ملازم میں زیادہ فرق نہیں ہے اور ملازمت کرنا ایسا ہی ہے جیسے غلامی کی زندگی گزرنا۔ گوئے انسٹی ٹیوٹ کے آخری دنوں میں پاکستان حکومت کا اشتہار سامنے آیا کہ ہائیڈل برگ (جرمنی) میں پاکستان اسٹڈی جیسٹر کے لئے ایکسپریٹ کی ضرورت ہے۔ مبارک صاحب نے غماز کہ جرمنی سے ڈاکٹر بیٹ یافتہ اور جرمن زبان سے واقف۔ لیکن تقرر کسی اور صاحب کا ہوا۔

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قد

گوئے انسٹی ٹیوٹ سے برطانیہ کے بعد بے روزگاری کے عفریت سے جدالِ ن کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ کچھ دن C S S کے کورس پڑھائے، پھر ”عورت فاؤنڈیشن“ کا ”فرما کہ ڈائریکٹر کے عہدے پر نصاب تشکیل دیں۔ چھ ماہ کام کر کے ایک سیمینار میں بھارت گئے تو واپسی پر عہدہ چھن چکا تھا۔ پھر جرمنی کے Henrich Beol Foundation میں ملازمت ملی اور تیسری بار جرمنی جانا ہوا، جو پہلے ہی کی طرح صاف سترا اور خوبصورت تھا۔ 1996ء کے اس دورے میں پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر 1998ء میں جرمنی جانا ہوا جہاں اسلام پرائیک کانفرنس کا اہتمام فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔ اس دفعہ انہوں نے دیوار برلن کے انہدام کے بعد کے جرمنی کے دونوں حصوں کا تھوڑا دیکھا جہاں دوست کی تقسیم نے ہنوز ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے کہ مشرقی جرمنی میں دولت اور چمک دک نہیں ہے۔ یہ ملازمت بھی زیادہ نہ چل سکی کیونکہ جرمنوں کی نسل پرستی مبارک علی کی انانیت کو برداشت نہ کر سکی۔

ایک نیا سلسلہ یہ لنگ کہ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کی پرنسپل ساجدہ وندل نے تاریخ کا ایک کورس پڑھانے کی پیشکش دی۔ مبارک علی نے پڑھانا شروع کیا تو واندین کی مخالفتیں ہونے لگیں کہ یہ صاحبِ نظر یہ پاکستان ہی کے خلاف ہیں، لیکن ساجدہ وندل سخت محکمہ ہیں اور راولپنڈی کیسپس میں بھی مبارک علی سے ہی کورس پڑھوائی رہیں۔ نئی پرنسپل ”میں تو مطلع کیا کہ راولپنڈی میں کسی صاحبِ حق کا انتظام کر لیا ہے، مبارک علی نے کہا کہ NCA لاہور کے لئے بھی کسی دور کا تلاش کریں۔ پھر بارہی انسٹی ٹیوٹ میں ایڈو نر مقرر ہوئے تو ایک دن مالکن دوبار لگانے آگئیں، چنانچہ یہاں سے بھی رخصت ہوئے۔ اس صورتحال پر تیسرا ہنر مبارک علی

”دراصل فنی اداروں کو ان کے مالک اپنی چاہ گیر سمجھتے ہیں اور کام کرنے والوں کو مزارع۔ ان کے نزدیک کسی کے علم و فضل کی کوئی عزت نہیں ہے۔

جب چاہیں کسی کا تقرر کر دیں اور جب چاہیں اسے فارغ کر دیں۔ ملازم اس ذمت کو اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ یہ ان کے روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے۔ نجی اداروں میں تو یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کے اداروں میں لوگ اس لئے کام نہیں کرتے کہ ان کی ملازمت پگھلی ہوتی ہے اور نکالے جانے کا خطرہ نہیں ہوتا ہے، لہذا ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔“

مدرسوں سے تقریباً ایک جن بار نکالے جائے کے باوجود مبارک علی نے نہ کبھی کسی کی خوشامد کی ورنہ نہ کسی کا ختم برداشت کیا۔

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر اسے عیب جاننے یا کہ ہنر دینی بات سن رہا تھا جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی

اب لکھنا مبارک علی کا شوق بھی تھا اور محبوبی بھی بن گیا تھا۔ انہوں نے روزنامہ ”جنگ“ میں چھوڑ دیں مصداق شائع کرائے لیکن موضوع مصر۔ پھر خاندان احمد کی وارت میں ”The Frontier Post“ کے لئے ہفتہ وار کالم لکھے جو کافی مقبول ہوئے پھر خاندان احمد نے اخبار چھوڑا تو مبارک علی نے بھی کام لکھنا چھوڑ دیا۔ پھر کچھ دن روزنامہ ”آجکل“ اردو میں کالم لکھے۔ انگریزی کالم کتابی شکل میں ”Historian's Dispute“ اور ”In the Shadow of History“ کے عنوان سے شائع ہوئے۔ آجکل ”ڈیلی ڈان“ کے لئے کالم لکھ رہے ہیں۔

پاکستان کے ٹیلی ویژن چینل بھی مفت امداد یعنی پروگرام میں یقین رکھتے ہیں سوائے سرکاری PTV کے۔ اشاریہ چینل کے لئے اقبال سندھو نے چار ہزار روپے فی پروگرام کے حساب سے تیرہ پروگرام کرائے اور ایک پیسہ نہ دیا۔ ایک تجربہ PTV کارہا کہ وزیر اطلاعات قمران کاٹروہ ملے آئے اور پروگراموں کی آفر کی۔ دیر یہ شرط بھی مان لی کہ پروگرام سفر نہیں کئے جائیں گے۔ ”تاریخ اور آج کی دنیا“ کے عنوان سے پروگرام شروع کیا مگر دہرائی تو اندر ہی اندر دو پکتا رہا، آئے دن مبارک علی کے پروگرام کے ٹائم بدلے جانے لگے، پھر نہ دیر ہی رہا اور نہ مبارک علی کا پروگرام ہی۔ مبارک علی لکھتے ہیں

”اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے لئے روزگار کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لیکن حالات ان کو زندہ رہنا سکھاتے ہیں۔ یونان کے فلسفی اپی کیورس (Epicurus) نے کہا تھا کہ انسان کو اپنی ضروریات کم کرنی چاہئیں اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر مطمئن ہو کر خوشی و مسرت کے

ساتھ زندگی بسر کرنی چاہئے۔“

مبارک علی اسی اصول پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ذکیہ آپا اور ان کی تین بیٹیاں ان کا بڑا سہارا ہیں۔ باہر کی دنیا میں تشدد و نفرت اور جنون ہے لیکن ان کا گھر گوارہ امن ہے۔

(4)

ڈاکٹر مبارک علی کے ذہن و فکر کو سمجھنے کے لئے ان کی کتابوں اور لیکچروں کا تجزیہ و تشریح ایک مناسب طریق کار ہو سکتا ہے۔ ان کی اہم کتابوں کی فہرست اس طرح ہے

تاریخ کی باتیں، پاکستانی معاشرہ، تاریخ کے نئے زاویے، تاریخ کی آگہی، گمشدہ تاریخ، تاریخ اور آج کی دنیا، تاریخ تحقیق کے نئے رجحانات، سندھ کی تاریخ کیا ہے، تاریخ کی آواز، تاریخ کی تلاش، انٹرویو اور تاثرات، سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ، تاریخ و تحقیق، تاریخ اور مورخ، جدید تاریخ، یورپ کا عروج، برطانوی راج، بدلتی ہوئی تاریخ، جاگیر داری، مغل دربار، تاریخ و سیاست، نجی زندگی کی تاریخ، تاریخ اور معاشرہ، تاریخ اور دانش ور، سندھ خاموشی کی آواز، آخری عہد مغیہ کا ہندوستان، برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ، علماء اور سیاست، تاریخ اور عورت، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، تاریخ کی روشنی، امید تاریخ، اچھوت و گلوں کا ادب، تاریخ کے بدلنے نظریات، مذہبی و نسل پرستی، تاریخ کیا کہتی ہے، اکبر کا ہندوستان، جہانگیر کا ہندوستان، تاریخ و مذہبی تحریکیں، مطلق اللہ کی آپ جنتی، شاہی محل، تاریخ شناسی، تاریخ ٹھگ ورڈا کو، تاریخ کھانا کھانے کے ادب، کیتھو ریٹا بوم کی کھوئی ہوئی عزت، طحہ کا اور کوٹ، قائد اعظم۔ اس طویل فہرست میں دو اردو کتابوں ”دور در ٹھو کر کھائے (سورخ)، اور میری دنیا“ کے علاوہ ان کی انگریزی کتابوں What History Tells Us اور Dimensions of History - Pakistan In search of Identity کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جائے تو مبارک علی صاحب کی وسعت ذاتی اور فکری تنوع اور ذاتی ڈسپن کا اندازہ ہوتا ہے۔

مبارک علی تاریخ نویسی کے ترقی پسند ہستان سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان و پاکستان و بنگلہ دیش کی تہذیب و ثقافت کو ایک بڑی سیکولر وحدت قرار دیتے ہیں اور برصغیر میں اسلم کی دوز اور سرحدی تنازعات کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ ایک سیکولر تاریخ دان ہیں اس لئے ان کی وارت میں نکلنے والا سہ ماہی جریدہ ”تاریخ“ پاکستان و ہندوستان کے علمی اداروں اور کشادہ ذہن

دانش وروں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

مبارک علی نے اپنا بھی سفر شر اور صادق سر و صوفی اور نسیم جی ڈی سے گزر کر پرل ایس بک، تیرتھ رام فیروز پوری، رائڈر بکرڈ، نڈیر احمد، دستوئی، گوگول، چیخوف، ترسکیف، ٹالٹائی، گورکی، سولسن، وٹس پیوگول، ٹراک، پلوپیر، براؤن، جوکس، برائن، سنسز، مارش اور ہارڈی تک پہنچے۔ پھر بریخت، کپٹنگ، جوزف کونراڈ وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ تاریخ تو ان کا موضوع ہی تھا، کالونیل تاریخ بھی پڑھی تو پرستانہ تاریخ بھی، پاکستان پرستانہ تاریخ بھی، ہندوستان کے ترقی پسند تاریخ نویسوں کوکسی، چن چندرا، روسیدھا پر، عرفان حبیب، کورنر شرف، مشیر الحسن، بی بی کشیا، گیان پاندے اور شاہد امین کا مطالعہ کیا۔ بیگل، مارکس، اینڈرو سید، ہرڈر، ورہن، غلدون سے انہوں نے گہرے اثرات قبول کئے۔ مبارک علی، خلیق محمد نظامی، ورائی بیج قریشی کے نظریات سے کبھی متفق نہ ہو سکے۔ اردو میں میر، غائب، اقبال، پریم چند اور قراچین حیدر تک کی تخلیقات کا خاص مطالعہ کیا اور ایک ڈرامے میں مصحفی کا کردار بھی انہوں نے ادا کیا تھا۔ مغل تاریخ کے علاوہ مبارک علی نے سندھ کی تاریخ اور کچھر پر بھی کافی کام کیا ہے، اسی لئے سندھ کے قصبوں اور گاؤں تک میں ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں

”بیچ نامہ، بیچ نامہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ عربوں کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں شکست خوردہ دہر اور اس کے ساتھی غائب ہیں۔ یہ بیچ نامہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جب بھی فاتح اپنی تاریخ تحریر کراتے تھے تو اس میں شکست خوردہ غائب ہو جاتے تھے یا ان کا تذکرہ منفی طور پر آتا ہے کہ وہ ظالم، عیاش اور اپنی رعایا میں غیر مقبول تھے، اس لئے ان کی شکست پر عوام نے سکوں کا سانس لیا اور فاتحین کو خوش آمدید کہا۔ عربوں کے حملوں کے تاریخی ثبوت یہ بات ثابت ہے کہ ان کے حملے اسلام کے ابتدائی زمانے سے شروع ہو گئے تھے جو اُسے حکومت میں جا کر کامیاب ہوئے۔ اس لئے یہ حملے اور سندھ پر قبضہ، یہ امیر ازم کا حصہ تھے جب وسط ایشیا اور چین میں بھی اسی دور میں قبضے کئے گئے۔ لہذا میں نے تاریخ کو مذہب سے نکال کر اس کو سیاسی تناظر میں دیکھا۔“

یہاں مبارک علی کا نقطہ نظر صاف نظر آتا ہے کہ وہ تاریخ کو مذہب کے جد

(Clash of Religions) کے بجائے سماج کی توسیع کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ اکبر کے عہد میں صرف چار برس فعال رہے اور جماعت نے اپنی نزاکت میں لکھ ہے کہ ان کے خطوط، مکاتیب سے مسلمانوں اور مذہبی حلقوں میں سخت غصہ تھا۔ ان کی تنگ نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندوؤں اور شیعہ فرقے کو کافر اور واجب قتل قرار دیتے تھے۔ مبارک علی مزید لکھتے ہیں کہ شیخ احمد ہندو مسلم شترک کے سخت مخالف تھے اور شریعت کے علم کے حصول کے لئے جدید علوم کو بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ان کے خیالات دو قومی نظریے کو مستحکم کرتے ہیں، اس لئے پاکستان کے نصاب میں ان کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

ہندوستان و پاکستان کے سکولر حلقے اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ صوفیاء کی تعلیم معاشرے میں فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کا سدباب کر سکتی ہے۔ لیکن مبارک علی کا خیال ہے کہ تاریخ میں تحریکوں کی پیدائش و ران کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس عہد کی سیاسی و معاشی اور سماجی قوتوں پر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صوفیاء کے سلسلے اس لئے مقبول ہوئے کہ یہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور حکمرانوں کو اس کی ضرورت تھی کہ کشمکش و تصدعات کو ابھارنے کے بجائے رعایا میں ہم آہنگی و اشتراک ہو۔ اس لئے انہوں نے بھی سلسلوں کی حمایت کی، صوفیاء کو خفا میں نہ کرا دیں اور ان کے گزراے کے لئے عطیات دیئے۔ صوفیاء نے کبھی حکمرانوں کے خلاف حرمت اور بغاوت کی تعلیم نہیں دی۔ مبارک علی کی دلیل یہ ہے کہ جب صوفیاء اپنے مریدوں کو صبر، قناعت و رشتہ کرنے کی تلقین کریں گے تو اس صورت میں حکومت کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائے گا۔

پاکستان کی سرکاری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو حلقہ کو تنگ نظری اور فرقہ بندی کی طرف لے جاتی ہیں۔ وہ ہندوستان کے روشن خیال تاریخ نویسوں کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ تاریخ مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن آمدورفت کی رکاوٹوں کی بنا پر یہ منصوبہ پروں نہ چڑھ سکا۔ ان کی کبھی ہوئی متوزنی تواریخ پاکستان میں کافی مقبول ہیں لیکن حکومتی سطح پر ان کو راندہ درگاہ ہی رکھا جاتا رہا ہے، چاہے جمہوریت ہو یا مارشل لا۔

خواتین کی آزادی کے متعلق سے مبارک علی نے کہا ہے کہ آج کے بدلتے ہوئے معاشرے جب کہ ہر شعبے اور ہر پہلو میں تبدیلی آرہی ہے، عورت کو بھی روایتی زنجیروں سے آزاد ہونا ہے اور یہ کام حالات کر رہے ہیں۔ تحریک نسواں، جو یورپ سے چلی تھی اور وہاں تبدیلی کا باعث ہوئی تھی، اب ہمارے معاشرے میں بھی اس کے اثرات آرہے ہیں۔ مبارک علی صرف آزادی نسواں

کے عہدی چہرہ کا نہیں، عملی طور پر بھی انہوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو بھی مکمل آزادی دے کر تعظیم و تربیت دی ہے، اسی لئے وہ آج اپنے والدین کا نام روشن کر رہی ہیں اور اپنی زندگی کے فیصلے از خود کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

مبارک علی نے ایک کتاب پاکستانی معاشرے پر لکھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے سماج کی بے بسی مٹائی جائے۔ اس کا ایک دلچسپ مگر منطقی تجزیہ مدِ حفظ ہو

”مثلاً اب عام گفتگو میں کہا جانے لگا ہے کہ دعاؤں میں یاد رکھنا! اگر آپ کسی کی کامیابی پر مبارکباد دیں تو اس کا جواب ہوگا۔ ”خدا کا فضل یا خدا کا کرم ہے۔“ اگر کسی نے رشوت اور بدعنوانی سے دوستی اکٹھی کی ہے تو وہ بھی اسے خدا کا فضل ٹھہرا کر اسے پاک صاف کر لیتا ہے۔ اب ہر بات کو خدا سے منسوب کر کے فرد و تمام ذمہ داریوں سے بری اندازہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً دشمن کے دانت کھنکھنے کر دیں گے، تو مسیحا پدائی ہوئی دیوار بن جائے، قومی مفاد کے لئے جان دے دیں گے، ہم محبت وطن پاکستانی ہیں، ہمیں اپنے ملک سے محبت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اب لوگ ان جملوں کو، ان کے مفہوم کو سمجھ بغیر بولتے ہیں اور یہ سلسلہ رسوا ہو گیا ہے اور یہ رکی جیسے اب ہماری زبان اور کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔“

مبارک علی صرف سنجیدہ تاریخ دان ہی نہیں، ایک مہذب قسم کی حس مزاح Sense of Humour بھی رکھتے ہیں۔ مغل تاریخ کا ایک دلچسپ قصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کبر نے چار سے زیادہ شادیاں کرنی تھیں اور دن کو شرعی طور پر جائز کرنا چاہتا تھا جبکہ عام تصور یہ ہے کہ اسلام میں (صرف) چار شادیوں تک اجازت ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ ایک رات اکبر نے عشاء اور احرام کے سامنے اپنا کلی مقدمہ بیان کیا۔ اس پر کسی حاکم نے تاویل کی کہ شرع میں ”دو دو۔ تین تین۔ چار چار“ شادیاں جائز ہیں جو کل ۱۸ (18) ہو جاتی ہیں ایک دوسرے عالم نے حساب لگا کر یہ تعداد ۱۸ (9) قرار دی۔ بدایونی نے کہا کہ مالکی فقہ میں منع جائز ہے۔ اس نے اسی وقت مالکی فقہ کے قاضی سے فتویٰ طلب کیا۔ اس نے آنا فانا فتویٰ دے کر اکبر کی شادیاں جائز قرار دے دیں۔ مگر اکبر نے احسان مند ہونے کے بجائے اس قاضی کو عہدے سے برطرف کر دیا تاکہ دوسرے لوگ قاضی کی عہدہ کردہ رعایت سے فیض یاب نہ ہوسکیں

(5)

ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں اور سوانح (اول) کے عنوان ”دردِ شوکر کھائے“ سے شاید کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک تنہا آدمی ہیں، تاہم سند یہ اور رائے رکھتے ہیں۔ انسان میں۔ یہ ان سے تعارف شاید 1997ء میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، دہلی کے پارٹیشن سیمینار میں ہوا تھا۔ میں ان کی سوانح پڑھ چکا تھا۔ ان کے لئے پسندیدگی اور عقیدت کا جذبہ دل میں پیدا ہو چکا تھا کیونکہ میں سے دانشوروں کو پسند کرتا ہوں جو Non-Conformist اور روایت شکن ہوں۔ خود میرے استاد ڈاکٹر قمر رئیس اسی طرح کے ایک عالم تھے۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں سیمینار کا نفرنس ہوا اور ان سے شرفِ ملاقات حاصل نہ ہوا۔ یہ ناممکن ہے۔ مجھے مرزا حامد بیگ کا ایک جملہ ہمیشہ یاد رہتا ہے جو انہوں نے میرے کالج میں ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”اب ہمارے پاس ایک ہی تاریخ داں ہے اور وہ ہیں مبارک علی۔“

مبارک صاحب ہم جیسے خوردوں سے اس درجہ شفقت اور محبت رکھتے ہیں کہ 2010ء میں جب عالمی صوفی کانفرنس میں اسلام آباد گیا تو وہ اپنی میں لاہور ایئر پورٹ پر مجھ سے ملنے آئے، کیونکہ میرے پاس لاہور کا ویزا نہیں تھا۔ اسی تعلق سے وہ خالد علوی، غلام عباس، ظہور خاں (فلسفہ ہاؤس، لاہور) اور ان کے بچوں سے بھی محبت اور انسیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں احباب کے نام اگر مکتوبوں نے شروع کروں تو فہرست ماقناعات ہو جائے گی۔ پھر بھی مبارک علی صاحب کے احباب کے کچھ نام لکھتا ہوں: ظفر حسن شاہ، نایاب حسین، زبیر فردوس، شکیل پٹھان، سبط حسن، زاہد حنا، اصغر علی انجینئر، اقبال خاں، حامد ریدی، مظہر علی خاں، طاہرہ مظہر علی، قاضی جاوید، علی عباس جلال پوری، اسلم گورداس پوری، نصیر اسحاق، عہد لعل ملک، عزیز سندھی، ڈاکٹر کمال حسین، جگرہ علوی، پروفیسر سریش کھیا، ڈاکٹر عرفان حبیب، پروفیسر امتیاز احمد، پروفیسر امریک سنگھ، خافرشہزاد، پروفیسر احسن رضا خاں، پروفیسر حشیش بکھر وال، پروفیسر گیٹ پانڈے، رومیہ، تھپر، کے این پانیکر، پروفیسر پٹن چندرا، شمس لاہور، ڈاکٹر اہل سیٹھی وغیرہ وہ لوگ ہیں جو مبارک صاحب کے دوست اور عقیدت مند تھے یا ہیں۔ ان میں دو مرحومین۔۔۔ نرمل دیش پانڈے (دیہی) اور ڈاکٹر امریک سنگھ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں مبارک علی صاحب کے سرپرست اور بزرگ تھے، نرمل دیہی تو ان کی بیٹی عطیہ کی بھی سرپرست تھیں کیونکہ انہی کی کوششوں سے عطیہ کا داخلہ اور پھر بڑا کامیاب ہوا۔ اس کا تھا وہ وہ جو برلن، ہنرہ یونیورسٹی

میں تعلیم حاصل نہ کر پائی۔

مبارک علی صاحب کے معتقدین میں میرے علاوہ عبدالعزیز، ڈاکٹر علی احمد فاطمی (اب آہار) اور ڈاکٹر خالد علوی بھی شامل ہیں۔ مبارک علی صاحب ہم پر اس درجہ مہربان ہیں کہ ہماری فرمائش پر ماہور سے ہماری بھر کم کتابیں لانے میں بھی تکلف نہیں کرتے ہیں۔

اور اب آخری سوال۔۔۔ کیا مبارک علی ایک کامیاب انسان ہیں؟ اس مشکل سوال کے دو جوابات ہو سکتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک ناکام، تلخ مزاج و رقوقعی انسان ہیں، بلکہ کچھ لوگ تو ان کو سوویت روس اور ہندوستان کا ایجنٹ تک قرار دے ڈالتے ہیں۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مبارک علی کو ایک بے پاک، پھر مصمت پسند اور راست گو، انشور سمجھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے سچ بول کر بڑے قصصات لکھنے ہیں اور آج بھی انھیں رہے ہیں۔ مبارک علی خود اپنی زندگی کے سو دویزیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی سوانح ”میری دنیا“ کے ”خری صفحات میں لکھتے ہیں۔

”حبیب صاحب کہہ کرتے تھے کہ شاعروں نے انہیں موچی دروازے پر اکید چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس سے ان کی حیثیت متاثر نہیں ہوئی بلکہ جنہوں نے انہیں اکیلا چھوڑا تھا، وہ آج کہیں نظر نہیں آتے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ کیا میں نے کتابیں لکھ کر اپنی عمر کا بڑا حصہ ضائع کیا؟ ہمارے دوست اسم گورداس پوری کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ تحریر کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ وہ حوصلہ دیتے ہیں تو سوچتا ہوں کہ لکھتے رہنا چاہئے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ میں بالکل تنہا ہوں۔ دوست اور احباب ساتھ ہی ہیں، چاہے ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، ان کے سہارے زندگی گزر رہی ہے۔“

مبارک علی صاحب کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ کتنے لوگ، جن سے ان کا تعلق ممکن ہی نہیں ہے، ان کی تحریریں پڑھ کر ظلم و استحقاق کے خلاف آواز اٹھانے کی تحریک حاصل کرتے ہیں، نئے لوگ ہیں جو مبارک علی کے خیالات سے قوت حاصل کر کے مستقبل کے بہتر بنانے کے خواب دیکھتے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو سماج کو بگیرہ ری کے اندھیروں میں دھسے چاہتے ہیں مگر مبارک علی کی پھیلائی ہوئی روشن خیالی سے خوف زدہ ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی، صرف ڈکٹیڈ آپا، عطیہ، شہلا اور نبی علی آپ کے ساتھ نہیں ہیں، مجھ جیسے

سیکڑوں عقیدت مند اور آپ کی تحریروں کے لاکھوں قارئین آپ کے ساتھ ہیں اور آپ نے اپنے عزت و احترام کی جو جائیداد تعمیر کی ہے وہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

جب برصغیر کی روشن خیال دانشوری کی تاریخ مرتب ہوگی تو آپ کا نام فیض احمد فیض، حبیب جاس، نرگیش یادو، مریم شمس، سردار جعفری، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، مزمل حنیف، قمر میں احمد، پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر ہریش کھیا اور پروفیسر امتیاز احمد کے ساتھ سنہری حروف میں شائع کیا جائے گا۔

ربع صدی کا قصہ

ڈاکٹر ناظم محمود

کوئی پچیس برس پہلے کی بات ہے ایک دن راحت بھٹی (راحت سعید) کا فون "یک ڈاکٹر مبارک علی" سے رابطہ کر دیا وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں حیران کہ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریریں پڑھ پڑھ کر تو ہم نے تاریخ کو ایک نئے روئے سے دیکھنا شروع کیا ہے مگر میری ذاتی طور پر نہ تھی نہ سے جان نہ پہچان آخر یہ چٹک محض سے کیوں بات کرنا چاہتے ہیں۔ عقدہ کھلا تو معلوم ہوا کہ ان دنوں ڈاکٹر مبارک علی لاہور میں ایک اشاعتی دورے مشعل فاؤنڈیشن کے مدیر تھے وہ انہوں نے ارتقاء کتبلی سسٹم میں میرا کیا ہو ایک ترجمہ پڑھا تھا جو مشہور سائنس دان سٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) کی کتاب کا پہلا باب تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ ترجمہ خاص پسند آیا تھا وہ وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے اس سلسلے میں بات کریں۔ میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے مجھے فوراً اس بات پر آمادہ کر لیا کہ میں اسٹیفن ہاکنگ کی کتاب "A Brief History of Time" کا ترجمہ مشعل فاؤنڈیشن کے لئے کروں اور مجھے اس کا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ اُس وقت میں اردو اخبارات میں فی سبیل اللہ مضامین لکھا کرتا تھا اور جیسا کہ ہمارے اکثر اخبارات کی رویت ہے کہ لکھنے والوں کو مکمل ہی پچھو معاوضہ دیا جاتا ہے۔ میں نے یہ پیش کش فوری قبول کر دی اور پھر وہ کتاب "وقت کا سفر" نے نام سے نہ صرف شائع ہوئی بلکہ اس کے کئی ایڈیشن بھی آتے رہے اور مجھے معقول معاوضہ بھی ملا جو میری حلاوت کے علاوہ میری کسی تحریر کا پہلا معاوضہ تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر مبارک علی میرے سنے مبارک بھائی ہو گئے جنہوں نے نہ صرف مجھ سے کئی کتابوں کے تراجم کرائے مجھے مسلسل لکھنے پر مائل کرتے رہے۔

مبارک بھائی بہت کم گو ہونے کے باوجود اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ اُن کے پاس بیٹھے تو

انہیں بولنے پر اکسانا پڑتا ہے۔ بہت وسیع المعادہ ہونے کے باوجود میں نے کبھی انہیں اپنی علمیت کا رعب جھڑکتے نہیں دیکھا۔ جب مشعل فاؤنڈیشن کے مدیر بنے تو بہترین کتابیں ترجمہ کر کے چھپو میں۔ جب گوئے نئی ٹیوٹا لاہور کے ڈائریکٹر بنے تو ان ادارے علم و فن کی سرگرمیوں کا مرکز بنا یا مگر کی صاف گوئی سے اکثر انہیں نقصان پہنچا۔ یہ جگہ جی رکھے کے قائل نہیں جو صحیح سمجھتے ہیں ہوسکتے ہیں۔ جو سوچ درست پاتے ہیں اُسے قلم بند کر دیتے ہیں اور پاکستانی معاشرے میں نہ پھینے دیں۔ تمہیں ہیں۔ اسی سے اکثر معاشی پریشانی کا شکار رہے لیکن انصاف پر سمجھوتہ کرنا انہوں نے نہیں سیکھا اور نہ ہی لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے خاموش رہنا۔

ایسے تو سنا خاموش رہتے ہیں نیکس جہ بولنے پہ تہ میں تو تاریخ، ادب، فلسفے اور سماجیات کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی کم کا سید بے بہہ لکھتا ہے۔ اس کا قلم بے شکانت چلتا ہے اور تاریخ و تراث کی دہائی کے منت نے پہنچا کر کرنا رہتا ہے۔ ہوں۔ برصغیر کی تاریخ کو پاکستان کے ریاستی عقدہ، نظر سے ہٹ کر دیکھا اور لکھا یہ ہے۔ سید سبط حسن کے بعد ان کی تاریخ کو اتنے بھر پور انداز میں ہر کسی عقدہ، نظر کے ساتھ اردو میں لکھا تو وہ ڈاکٹر مبارک علی ہی ہیں۔ آپ تو علی عباس جدلی پوری اور ابن حنیف۔ ص ۱۰۰ میں تاریخ و سماج لکھا ہے۔ یہ نیکس مبارک بھائی کا پناہ انداز ہے جس نے سیاسی کارکنوں اور سماجی شعور رکھنے والوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔

مبارک بھائی جب سندھ یونیورسٹی چھوڑ کر لاہور منتقل ہوئے تو میرا اور میرے گھر والوں کا لاہور میں ٹھکانہ مبارک بھائی کا گھر ہی بن گیا۔ جب بھی لاہور میں ہوتا تو کسی بھی ہونے پر اُن کے گھر کو ترجیح دینا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مبارک بھائی ہمیشہ کتابیں بائٹ کر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں سے نہ تھکے کا گلہ بھی کرتے رہتے ہیں لیکن میں نے کبھی بھی انہیں اپنی سوچ یا خیالات یا زندگی گزارنے کے انداز دوسروں پر مسلط کرتے نہیں دیکھا۔ مبارک بھائی نے اپنی بیٹیوں کو علی ترین تعلیم دوان اور انہیں اپنے فیصلوں میں آزاد رکھا۔ جب میں 1992ء میں اپنی شادی کے بعد صنوبر (میری بیٹی) کے ساتھ پہلی بار لاہور گیا اور سمس کے گھر ٹھہرے تو اُن کی تین بیٹیوں سے میری اور صنوبر کی انہیں دوستی ہو گئی اور پھر اگلے دس سال میں ہم خود بھی تین بیٹیوں کے والدین بن گئے۔ ہمیں قدم قدم پر اپنی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت میں مبارک بھائی اور ذکیہ بھائی کی مثال ملتی پڑی۔

مبارک بھائی نے پچھلے پچیس تیس سال میں جو بچپاس ساتھ کتہا ہیں انہیں میں اُن میں ذکیہ بھائی کی معاونت ہمارے سامنے ہے۔ ماں پریشانیوں کے باوجود ذکیہ بھائی اور اُن کی بیٹیوں سے جس

طرح مبارک بھائی کو موقع فراہم کئے کہ وہ سکون سے کتاہیں لکھ سکیں اس کی دوند دینا زیادتی ہوگی۔ ایک فلیٹ اور ایک گاڑی پر پچیسے پچیس سال سے گزارہ ہو رہا ہے۔ پچیسے دس برس میں مبارک بھائی کی چھوٹی بیٹی بی بی ان کے ساتھ رہی ہے جبکہ بڑی دونوں بیٹیاں امریکا منتقل ہو گئی ہیں۔ نین تار (نئی) بی مبارک بھائی کے سنے آؤ کو کتاہیں ڈون ڈون کرتی ہے۔ ان کی کی میڈو دیکھتی ہے۔ ان کے لئے فون پر نمبر ملاتی ہے اور اپنے پاپا کے لئے ہر دم تیار رہتی ہے۔

یہ ہمارے تعلیمی اداروں کی بد قسمتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے عام و نادر تارن دان سے پاکستان کا کوئی تعلیمی ادارہ استفادہ نہیں کر رہا۔ جب سے انہوں نے سندھ یونیورسٹی چھوڑی پاکستان نے کسی سرکاری، نیم سرکاری یا نجی تعلیمی ورے سے مبارک بھائی کو مستقل بنیادوں پر اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ پروفیسر ساجدہ وندس جب تک نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کی سربراہ رہیں انہوں نے ضرور مبارک بھائی کو اپنے ادارے میں نیچر اپنے پر لگائے رکھا مگر یہ سلسلہ بھی ان کی سربراہی ختم ہونے کے بعد منقطع ہو گیا۔

مبارک بھائی کی زندگی کا شاید سب سے پریشان کن دور وہ تھا جب ان پر مختلف مقدمات قائم کر دیئے گئے وہ انہیں بد و بد کنی سال تک پیشیاں جھٹکتی پڑیں۔ پھر ان مقدموں سے بڑی مشکلوں سے چھٹکارا ملا۔ اس دوران مبارک بھائی کو بہت سے لوگوں کو پرکھنے کا موقع ملا جس پر وہ اپنی پہلی سب بیٹی "دردِ فکرو کرکھے" میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس دوران وہ کورٹ کچہری کے چٹروں میں واقعی دردِ فکرو کرکھے میں کھاتے رہے وہ ان مقدموں سے نکلنے کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ تو بھلا ہونٹم پیٹھی کا جو اس وقت ذیلی ناٹس کے مدیر تھے اور انہوں نے ایک ادارہ مبارک بھائی پر قائم مقدمات کے بارے میں لکھ کر انیسویں کا خیر کیا جسے اس وقت کے پنجاب کے گورنر خدایہ مقبول نے پڑھا اور پھر ذاتی دلچسپی لے کر پولیس کے ذریعے وہ مقدمات ختم کروائے۔

مبارک بھائی کی ایک اور خاص بات ان کا کسی کی مدد کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا ہے۔ ایک بار میں ہندوستان جا رہا تھا تو اس وقت مبارک بھائی کی بڑی بیٹی عطیہ دہلی کی جواہر لال نہرو انسٹی ٹیوٹ میں ایم فل کر رہی تھی۔ جب مبارک بھائی کو پتا چلا کہ میں دتی جا رہا ہوں تو انہوں نے جھٹ ایک پرچہ بے بی بی میں عنایت کے پروفیسر امتیاز احمد کے نام اور ایک پرچہ جیہ سہا کی رکن نرمدیش پانڈے کے نام لکھ دیا کہ ان سے مل لینا۔ ویسے تو میرے بھی دتی میں ڈائی جاننے والے اچھے خاصے تھے لیکن پھر بھی ان دو پرچوں نے میرے قیام کو سر پُر لطف اور معنوی بنا دیا۔

پنی تقریباً پانچ صدی کی رفاقت میں میں سے کبھی مبارک بھائی یا ذکیہ بھائی کو دوپنچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا۔ گو کہ مبارک بھائی زور دیتے ہیں اور لوگوں سے بہت حد تا راض ہو جاتے ہیں لیکن کبھی بھی کسی سے تلخ کلامی یا حاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک مرتبہ انہیں غصے میں دیکھا تھا۔ دایوں کے ذرا حاد رہا تھا۔ میں تھا۔ ہاں۔ گھر سے نکلتے ہوئے مبارک بھائی نے اپنے سے کہا میں تمہاری رحمت صاحب سے فون پر بات کر دیتا ہوں تاکہ تم پتا سمجھو۔ ڈر سہارے کہا۔ پتا میں ہاں ہے وہاں تین سرفروں کر میں گے گروٹوری ہوئی تو۔ اب جب اس حد تک میں پہنچے تو وہاں مل کر ہی نہ رہا۔ وہ حاد رحمت رحمت کا فون مسلسل "ابھی جو اب موصول نہیں ہو رہا" کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ اس پتھر میں جب غاصی ابرہہ گئی تو مبارک بھائی کا معذہ اکیسے دیا تھا۔ خدا خدا کر کے مکان تو مل گیا مگر ان کا ڈر سہار مبارک بھائی کے غصے کو آج تک نہیں بھولا ہو گا کیونکہ اسے بے وقوف، احمق، حسدی اور اس طرح کے کئی القابات بڑے جوش سے عطا کئے گئے تھے۔ ہم سب اب بھی اس واقعے کو یاد کر کے اکڑ جتے ہیں۔

مبارک بھائی قائد اعظم کو ہمیشہ جناح صاحب کہتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کے تحت ناقد ہیں خاص طور پر قہار کے ان اشعار کے جن میں وہ "نگاہِ مرد مومن" اور "ششیر و سن اول" جیسے خیالات کی ترویج کرتے ہیں۔ مبارک بھائی کے خیال میں قہار نے پاکستانیوں کا دماغ خراب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے وہ انہیں چٹلوں پر گھونسے بنانے اور خودی کو بلند کرنے میں لگائے رکھا ہے جس کی وجہ سے پاکستانی قوم سوچنے سمجھنے کی صداہیت سے محروم ہوتی گئی ہے وراہِ نوبت یہاں تک سمجھتی ہے کہ یہ "مرد مومن" خود کش دھماکے کرے لگے ہیں اور ہر خطہ کی شان و شہرہ ان کے ساتھ تباہیاں پھیل رہی ہیں۔

مبارک بھائی کو اپنی کتاہوں کی شاعت میں بھی کوئی خاص مانی فائدہ نہیں ہوا اور یہ کام وہ کم و بیش خدمتِ خلق کے طور پر ہی کرتے رہے ہیں۔ پہلے تو جب 1980ء کے عشرے میں انہوں نے کتاہیں لکھنی شروع کیں تو ان کی کتاہت تک خود ہی کرتے رہے پھر جب چند ناشرین نے ان کی کتاہیں چھاپنی شروع کیں تو رائٹنگ کے نام پر کوئی معاوضہ ملنا کا روادار تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ ان کی درجنوں کتاہیں چھپ کر ہزاروں کی تعداد میں بکتی رہیں مگر ان کے ہاتھ میں بمشکل چند ہزار روپے ہی آتے رہے لیکن انہوں نے علم کی ترویج کے سنے کام کا خیر سمجھ کر ہی کیا ہے ورنہ وہ سندھ یونیورسٹی کی لگی بندھی نوکری چھوڑتے اور نہ مشعل فاؤنڈیشن یا گوگلے انسٹی ٹیوٹ کی نوکری سے ہاتھ دھوتے۔

مبارک بھٹی اور اُن کی فیملی کا بڑا وصف اُن کی قناعت پسندی اور ہر حال میں خوش باشی ہے۔ گوکہ اب مبارک بھٹی کی بینائی خاصی متاثر ہو چکی ہے مگر پھر بھی وہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ روزنامہ ڈان میں اُن کے کام باقاعدگی سے آتے ہیں جس میں ہر ہفتے ایک نئے اور اہم تاریخی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اور پھر اس تاریخی موضوع کے ذریعے پاکستان کے موجودہ حالات کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ انہوں نے ویسے تو کئی اخبارات کے لئے لکھا مگر زیادہ اخبارات نے اُن کے پیسے دبائے سوائے ڈان خبر کے اور جس کا کریڈٹ وہ اخبار کی انتظامیہ کو ضرور دیتے ہیں۔ سہ ماہی ”تاریخ“ سمجھنے کی سال سے مبارک بھٹی کی داریت میں نکل رہا ہے جس سے آمدنی تو کچھ نہیں بلکہ کچھ اپنے پاس سے ہی لگانا پڑتا ہے۔ اہستہ تاریخ جیسے موضوع پر ایک دوسرا باقاعدگی سے لکھنا بذات خود پاکستان جیسے معاشرے میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔

مبارک بھٹی ایک باغی ذہن کے مالک شروع ہی سے رہے ہیں۔ اپنے خاندان کے پہلے فرد بنے جس نے اپنی بیوی سے برقع چھڑیا۔ تعلیم کے لئے یسے شجے کا انتخاب یا جسے پاکستان جیسے معاشروں میں کوئی مالی طور پر منافع بخش شعبہ نہیں سمجھا جاتا لیکن انہوں نے اس میں ڈوب کر کسب کماں حاصل کیا۔ سندھ یونیورسٹی میں عقاب کا شکار ہوئے تو کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ معافی تلافی کر کے بحال ہو جاؤ مگر مبارک علی جان کہاں اور معافی کہاں۔ اڑے رہے اور پھر کئی برس بعد بحال ہوئے۔ بچیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر جانا تھا تو مجھ بھر تو وقف نہ کیا۔ گوسنے انشٹی ٹیوٹ میں اس بات پر ڈٹ گئے کہ کسی کانفرنس میں معاوضہ پاکستانیوں کو کم اور جرمنوں کو زیادہ کیوں ملے گا۔ کھڑے کھڑے نوکری چھوڑ دی مگر نہ چھوڑ تو ان کا لکھنا لکھنا جس کے سنے می درے میں تبدیلی کرتے ہوئے مبارک بھٹی کے ہاتھ دھو کر پینا چاہئیں۔

نظریہ تاریخ:

گڑھے مردوں سے زندہ انسانوں تک

ڈاکٹر روچینہ سہگل

ڈاکٹر مبارک علی سے میری ملاقات سب سے پہلے 1986ء میں ہوئی جب میں امریکہ میں زیر تعلیم تھی اور گرمیوں کی تعطیلات کے لئے لاہور آئی تھی۔ چند دوست احباب مجھے ایک لیکچر سننے کے لئے کسی کے فحی گھر میں لے گئے اور بتایا کہ سندھ میں مقیم یک دستور لاہور آیا ہو ہے اور وہ تاریخ کے موضوع پر مقدمہ پڑھے گا۔ میرا تجسس جاگا اور میں دوستوں کے ہمراہ ایک فحی بنگلے کے باغ میں گئی جہاں یہ لیکچر ہونا تھا۔

جب مبارک علی سے مجھے متعارف کروایا گیا تو وہ مجھے ایک سادہ لوح شخص لگے۔ اُن میں نہ تو کوئی گھنڈ تھا، نہ غرور بلکہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ عاجزی اور انکساری سے بھرپور تھے اور بے حد خلوص سے ملے۔ چند اور دانشور بھی وہاں موجود تھے، ورنہ سب سے ملاقات کر کے خوشی محسوس ہوئی۔

اُس کے بعد مبارک علی نے تاریخ کے موضوع پر اپنی بات کہی۔ اپنی سادہ زبان اور عام الفاظ میں انہوں نے ایک گھنڈ بات کی اور جیسے جیسے وہ بتاتے رہے مجھے لگا جیسے میں ایک دردناک چلی گئی ہوں کیونکہ وہ یہی باتیں تھیں جو اُس دن سے قتل میں نے کبھی نہیں سنی تھیں۔ مبارک علی تاریخ کا بالکل ایک انک اور منفرد نظریہ پیش کر رہے تھے۔ یہ نقطہ نظر اُس تاریخ سے مکمل طور پر مختلف تھا جو میں نے سکول اور کالج کے زمانے میں پڑھی تھی۔ میں نے ماسی میں کبھی دیسے سوچ ہی نہیں تھی جیسے مبارک علی بتا رہے تھے۔ میرے لئے تاریخ سیاسی اور شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کا ریکارڈ تھی۔ لوگ کہتے تھے ”تاریخ پڑھ کر کیا ملتا ہے۔ یہ تو گڑھے مردے ہوتے ہیں۔ ان سے کیا فائدہ۔“

لیکن جس نقطہ نگاہ سے مبارک علی تاریخ کے مضمون پر بات کر رہے تھے وہ تو بالکل ہی ایک نیا اور علیحدہ انداز تھا۔ مبارک علی تمام ان مفروضوں اور نظریات کو ذکر کر رہے تھے جو میرے ذہن میں تاریخ کے موضوع سے وابستہ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تاریخ صرف شاہی خاندانوں اور امراء کے کارناموں کا ریکارڈ نہیں ہوتی بلکہ تاریخ کے معمار عام لوگ ہوتے ہیں۔ تاریخ لکھنے اور سمجھنے کے بہت سے انداز ہیں مثلاً کے طور پر تاریخ سیاسی بھی ہو سکتی ہے لیکن سے ثقافتی، تہذیبی، سماجی پہلوؤں سے بھی لکھا جاسکتا ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کیونکہ تاریخ عموماً قوم پرستی اور مذہبی زاویے سے لکھی جاتی ہے اس لئے یہ محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور اس میں لوگوں کی عدم دلچسپی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ تاریخ پڑھانے کے نئے دلچسپ اور تخلیقی طریقوں کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

مبارک علی کے پیچھے کے بعد تمام لوگوں پر سحر طاری تھا۔ لوگوں نے بہت سے سوالات کئے اور مبارک علی نے عقل اور صبر سے ہمارے سوالات کا جواب دیا۔ ان کی باتیں ہمارے لئے نئی تھیں اور انہوں نے ہمیں جھنجھوڑے رکھ دیا جیسے کسی خواب سے کوئی یک دم آپ کو جگا دے اور آپ خود کو یک نئی اور غیر مانوس جگہ پر پائیں۔ پر سنے مفروضے ٹوٹ گئے۔ اندیشہ فکر کی بنیادیں ہل گئیں۔ روایتی طرز سوچ ٹوٹنے لگی۔ میر تجسس دور جاگا اور میں نے ان کی کتاب ”تاریخ اور آگہی“ حاصل کی اور اپنے ساتھ امریکہ گئی جہاں میں نے وہ کتاب پڑھی۔

میں اس کتاب سے بے حد لطف اندوز ہوئی کیونکہ اس کی سادہ زبان سے صاف ظاہر تھا کہ عام لوگوں کے لئے لکھی گئی تھی تاکہ جو شخص تاریخ کے مضمون کا طالب علم نہ بھی ہو وہ بھی اسے آسانی سمجھ پائے۔ ظاہر ہے مبارک علی کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ کے مضمون کو گڑھے مردے والی سوچ سے علیحدہ کر کے اسے زندہ انسانوں کی کہانی کے طور پر پیش کیا جائے۔ مبارک علی تاریخ کے مضمون کو مقبول بنانا چاہتے تھے۔ تاکہ لوگ تاریخ سے بور نہ ہوں اور ان میں تاریخی شعور پیدا ہو جو کہ سیاسی شعور کی بنیاد ہوتا ہے۔ اس کتاب سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور 1989ء میں پاکستان واپسی پر میں نے مبارک علی کی دیگر کتابوں کو پڑھنا شروع کر دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ میرے غیر رسمی تعلیمی رہنما یعنی (Thesis Advisor) بن جائیں۔

مبارک علی نے خوشی سے یہ رول قبول کیا اور پھر اگلی دو دہائیوں میں انہوں نے ہر طرح سے میری تعلیمی رہنمائی کی اور ہر مرحلے پر میری مدد کی خاص طور پر جب میں حوصلہ شکنی کا شکار ہو جاتی یا کسی وجہ سے مایوس ہو جاتی تو وہ ہمیشہ میری ڈھارس بڑھاتے اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ مبارک علی کے

ساتھ دوستی اور خصوص کار شدہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ میں ان کے بے پناہ علم و دانش سے مستفید ہوئی بلکہ ان کے حسن سلوک اور مروت سے بھی میں نے بہت پایا۔ ان کی اہلیہ ذکیہ آپا اور ان کی بیٹیاں عطیہ، شہزاد اور عتیقی میرے گھر کے افراد جیسے ہیں۔

بعد ازاں میں نے ان کی بہت سی مختلف کتابیں پڑھیں مثلاً کے طور پر ”تاریخ اور آج کی دنیا“، ”تاریخ اور عورت“ اور ”تاریخ کے بدلتے نظریات“۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں اور مقالے لکھے مثلاً برطانوی راج، فاشزم، غذائی کا دور، جاگیرداری، صوفیاء کی روحانی سلطنت درکھانے پینے کے بدلتے ادب۔ تمام کتابیں اور مقالے مقبول انداز میں لکھے گئے تھے تاکہ عام لوگ مستفید ہو پائیں اور معاشرے میں تاریخی وسیع شعور بڑھے۔

یہاں ضروری ہے کہ میں چند ان نظریات کی بات کروں جو مبارک علی نے متعارف کروائے اور جو کہ روایتی تاریخ سے ہٹ کر تھے۔ انہوں نے اس تصور کو عام کیا کہ تاریخ صرف حکمرانوں، بادشاہوں اور شاہی خاندانوں کے کارناموں کا نام نہیں ہے بلکہ تاریخ عام لوگوں کی رد مرہ زندگی میں تبدیلیوں کا ذکر کرتی ہے اور ان تبدیلیوں کی وجوہات کا تجزیہ کرتی ہے۔

مبارک علی کا کہنا تھا کہ تاریخ عام لوگ بناتے ہیں، وہ مزدور جنہوں نے تاج محل بنایا نہ کہ شاہ جہان جس نے محل بنانے کا حکم دیا۔ تاریخ وہ عورتیں بناتی ہیں جنہوں نے زراعت کی ایجاد کی اور معاشروں کے نئے شیعے خورد و نوش کا ایجاد کیا اور مردوں کی پشت پناہی کی تاکہ وہ بڑے بڑے اور عظیم کارنامے سرانجام دے سکیں۔ تاریخ وہ کسان رقم کرتے ہیں جو ہر ایک کا پیٹ بھرتے ہیں اگرچہ خود اکثر بھوکے رہتے ہیں۔ تاریخ ذرائع پیداوار میں تبدیلیوں کا نام ہے اور ایک ارتقائی عمل کا نام ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ انسان نے مار کے زمانے سے کیسے اپنے سفر کا آغاز کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ طرز زندگی کیسے بدلتے گئے۔ نئی ایجادات نے کیسے لوگوں کی زندگی بدل دی اور ہر طرح کی نئی دریافت نے کس طرح انسانوں اور معاشروں میں تبدیلی پیدا کی۔ تاریخ کا مطالعہ اگر اس نقطہ نظر سے کیا جائے تو ایک تاریخی اور سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے کیونکہ پھر انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ تاریخ صرف حکمران طبقوں کی شان و شوکت کا نام نہیں ہے۔ ان کی شان و شوکت کی بنیاد عام لوگوں کی محنت و مشقت ہے جس نے یہ شان و شوکت ممکن بنائی۔ اس قسم کی تاریخ پڑھ کر ایک عام شخص کو احساس قوت ہوتا ہے اور وہ خود کو بے بس نہیں قرار دیتا۔ اس میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ وہ اشتراکی اور اجتماعی عمل سے اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ جہاں روایتی تاریخ مایوسی در بے بسی پیدا کرتی ہے، وہاں متبادل نظریہ تاریخ انسان کو اس کے

اعمال کی افادیت سے آگاہ کرتا ہے۔

مبارک علی قوم پرستی اور مذہبی جنونیت کے تحت لکھی گئی تاریخ کو بے حد تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوم پرستی کے جذبات کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی تاریخ جذبات کو ابھارتی ہے اور منطقی سوچ اور عقل کو مقفل کرتی ہے۔ قوم پرستی کے تحت قلمبند کی گئی تاریخ جنگ و جدل کو فروغ دیتی ہے۔ کیونکہ قومیں اور ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل میں مصروف رہتی ہیں، لہذا ایسی تاریخ چارہیت و رشتہ کے جذبات ابھارتی ہے۔ اس قسم کی تاریخ میں خون حراہ، مہارنا، قتل و غارت سب چھبے سمجھے جاتے ہیں اور انسان کے اعلیٰ اور نفیس جذبات کم کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسی تاریخ میں خون بہانے کو سراہا جاتا ہے ورموت کی پرستش کی جاتی ہے۔ قوم پرستی و مذہبی جذبات کے تحت لکھی گئی تاریخ زندگی کو غیر اہم قرار دیتی ہے اور موت کو ترجیح دیتی ہے۔ اس جہان کو ایک ماضی جگہ قرار دیتی ہے اور صرف اگلے جہان کو دائمی اور ہم سمجھ جاتا ہے۔ اس قسم کی تاریخ ایک ایسی سوچ پیدا کرتی ہے کہ جس میں انسان اس دنیا میں اپنی زندگی میں ایسی کچھ بینتہ سے اور صرف موت کے بعد کی نامعلوم زندگی پر توجہ دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کسی بھی تعمیراتی، تخلیقی عمل پر یقین نہیں رکھتا اور ہر وقت عاقبت سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔ لہذا معاشرے میں ایک جنود پیدا ہوتا ہے جو غور و فکر و عمل، ہر چیز کو اور تخلیقی صلاحیت کو سب کر دیتا ہے۔

مبارک علی کے مطابق قوم پرستی اور مذہبی جذبات کے تحت تحریر شدہ تاریخ افراد کو ہمیت دیتی ہے نہ کہ اجتماعی سماجی قوتوں کو۔ اس قسم کی تاریخ میں ایک شخص اہم ہو جاتا ہے ورنہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ یک فرد بناتا ہے۔ نتیجتاً عظمت کا تصور جسم لیتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے کون ایک شخص دوسروں کی نسبت عظیم ہے اور عام افراد اس کے مقابلے میں ذلتی ہیں۔ مبارک علی فرادی پرستش کی مخالفت کرتے ہیں اور اجتماعی سماجی عوامل کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ایسے جموں سے متفق نہیں ہوں گے کہ شاہ جہان نے تاج محل بنایا، قائد اعظم نے پاکستان بنایا، سکندر اعظم بہت عظیم تھے۔ ان کے قتل و غارتگری عظمت نہیں ہے بلکہ پستی کی نشانی ہے۔ پاکستان کا وجود میں نہانا عجیبہ تاریخی عوامل کا نتیجہ تھا اور قائد اعظم نے تاریخ کو نہیں بلکہ تاریخ نے محمد علی جناح کو جنم دیا۔ تاریخی عمل مخصوص افراد کو منظر عام پر لے جاتا ہے۔ مبارک علی شخص پرستش کو رد کرتے ہیں اور اشتراکی اور اجتماعی عوامل کو اہم قرار دیتے ہیں۔

شخص پرستش کا ایک عنصر جو کہ قوم پرستی پر مبنی تاریخ کا نمایاں جزو ہے، یہ ہے کہ لوگ تاریخ میں

بہرہ ور اور لوٹن کی تلاش کرتے ہیں۔ ایک طرف غازی اور شہید بنائے جاتے ہیں تو دوسری طرف غدار اور دشمن۔ قوم پرستی کے جذبے سے سرشار تاریخ معروضی نہیں رہتی بلکہ قتل و غارتگری کرنے والوں کو بہرہ و ملاکتی ہے۔ مثال کے طور پر محمد بن قاسم و محمود بن قاسم کی چارہیت و قتل و غارتگری کو خوب سراہا جاتا ہے۔ ان کے جہان کو ہم سمجھ جاتا ہے۔ اس قسم کی استعماری قوتوں کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس میں جنگ و جدل کے جذبات ابھارے جاتے ہیں۔ اس طرح انسان و انسان کے جذبات محدود ہو جاتے ہیں۔

قوم پرستی پر مبنی تاریخ جہاں ایک طرف بہرہ کی تلاش میں رہتی ہے وہاں دوسری طرف دشمن اور غداروں کی بھی کیسی ہوتی۔ مثال کے طور پر پاکستانی مورخ، خصوصاً وہ جو کہ دہلی کتب تحریر کرتے ہیں، میر جعفر اور میر قاسم کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق میر جعفر نے سراج اندور سے بے وفائی کی اور میر قاسم نے شیخو سلطان کو دھوکہ دیا۔ سراج اندولہ اور شیخو سلطان مسلمانوں کے بڑے بہرہ دانے جاتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ خوف پیدا کیا جاتا ہے کہ قوم کے دشمن و غدار چاروں طرف موجود ہیں، لہذا قوم سے ہر دم وفاداری ہونی چاہئے، خواہ حکمران طبقے آپ کو کچھ نہ فراہم کریں۔ اس وفاداری کی سب سے بڑی نشانی فوج قرار دے دی جاتی ہے ورنہ ایک کے دل میں قوم کی خاطر لڑنے اور مرنے کے جذبات پیدا کئے جاتے ہیں۔ فوج کو وفاداری کا پیکر اور سیاسی رہنماؤں کو غدار کی علامت بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ لہذا یہ تاثر ابھرتا ہے کہ فوج ہمیشہ ملک و قوم کو بچاتی ہے جبکہ جمہوری قوتیں توڑنے پر تگی ہیں۔ چنانچہ بہرہ ور اور غدار کا موازنہ کر کے لوگوں کے دلوں میں نہ صرف خوف پیدا کیا جاتا ہے تاکہ وہ قربانیوں کے لئے تیار رہیں، بلکہ دشمن کی سادست بھی اس طرح سے کر دی جاتی ہے کہ یوں لگے جیسے وہ انسان ہی نہیں ہے۔ اُسے مارنا نیکی کا کام ہے۔ اس بات کو قطعی طور پر بھڑا دیا جاتا ہے کہ کوئی بھی شخص خواہ کس بھی قوم، ملک، مذہب یا گروہ سے تعلق رکھتا ہو پوری طرح اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص میں خوبیاں اور اچھائیاں دونوں ہوتی ہیں۔

اگرچہ مبارک علی مذہبی یا قوم پرستی سے متاثر تاریخ کے مخالف ہیں، ان کے خیال میں تاریخ حتمی طور پر یا مکمل طور پر معروضی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر شخص جب تاریخ قلم کرتا ہے تو مکمل طور پر اپنے قصص کو عین حقیقت نہیں کر سکتا۔ وہ حقائق کے وسیع سمندر میں سے کون سے حقائق کا انتخاب کرے گا اور کون سے نظر انداز کر دے گا، اس بات کا انھیں اس کے نقطہ نظر پر ہے۔ مثلاً مارکی سوچ رکھنے والا مورخ مخصوص حقائق کو چن کر ان کا تجزیہ کرتا ہے، خواتین کے حقوق کی سمیر و تحقیق، ان حقائق کا انتخاب کرتی ہیں

جن سے اُن کا نقطہ نگاہ فروغ پائے اور مزدوروں یا کسٹومرز کی تحریک سے منسلک مورخ ایسے حقائق کی تلاش کرتا ہے جو اُس کے نظریے کی تائید کریں۔ مکمل طور پر معروضی ہونا تو کسی بھی مضمون میں ممکن نہیں ہوتا، تاہم مہارک علی کا نظریہ یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو اپنے تجزیے کو جذبات اور تعصبات سے پاک رکھ کر منطقی سوچ کے مطابق کرنا چاہئے۔

مہارک علی کا نظریہ تاریخ یہ ہے کہ ماضی اور حال کو ایسے قلمبند کیا جائے کہ لوگوں میں سیاسی و سماجی شعور بیدار ہو، اُن کے اندر امن و امان کے جذبات پیدا ہوں، اُن کے نفس اور خوبصورت جذبات کو ابھارا جائے۔ مثال کے طور پر اگر انسان کے کارناموں کا ذکر کرنا ہو تو عسکریت پسندی کی بجائے انسانی تخلیق کے کارنامے چنے جائیں۔ نس کی فنونِ لطیفہ اور علم کی ترقی کو سراہا جائے مثلاً مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی کے نمایاں کارناموں کو سراہا جائے تاکہ جنگ و جدل کے جذبات کم ہوں اور حسن و دلکشی کو داد دی جائے۔

مہارک علی کے ہمراہ سینکڑوں ہٹکنوں کے دوران میں نے اُن سے بے پناہ علم حاصل کیا۔ وہ ہر چیز کو تاریخ کے زاویے سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ ہر واقعہ اور قصہ کو تاریخ کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔ موجودہ دور و حال کے واقعات اور عوامل کو تاریخ کے تناظر میں سمجھنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اُن کے پاس بیٹھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر شے تاریخی ہے اور کسی بھی سماجی عمل کی تاریخ سمجھنے بغیر اُسے پرکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اُن کے ساتھ دوستی نے مجھے یہ سکھایا کہ تاریخی شعور ہر انسان کے لئے بے حد ضروری ہے۔

مجھے مہارک علی کے ہمراہ آگرہ میں تاج محل اور بعد ازاں فتح پور سکری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ 1996ء میں مم نے آگرہ اور جے پور کا سفر اکٹھے کیا۔ اگر میں تاج محل و فتح پور سکری خود دیکھنے جاتی تو خوبصورت عمرات سے طیف اندوز ہو کر روٹ آتی۔ مگر مہارک علی نے ان تاریخی مقامات کو زندہ کر دیا۔ انہوں نے ان عمارات کے چپے چپے سے جڑے واقعات بیان کر کے میرے لئے ایک جیتی جاگتی حقیقت کا گمان پیدا کیا۔ مجھے لگا جیسے میں اپنی نظروں کے سامنے وہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ تاریخی مقامات کسی مورخ کے ہمراہ ہی دیکھنے چاہیں ورنہ وہ ماضی کے گڑھے فردے ہی لگتے ہیں اور ان میں زندگی اور جان نظر نہیں آتی۔ مہارک علی کے تھرے نے ان مقامات کو زندہ کر دیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ان کی کتابوں سے احساس ہوتا ہے کہ تاریخ گڑھے فردوں کی بھوت کہانیوں کا مرقع نہیں ہوتی بلکہ زندہ انسانوں کی جیتی جاگتی داستان کا نام ہے۔ مصوری،

فنونِ لطیفہ، سائنس، علم و دانش، دلکش مجسمے جو پوری دنیا میں نظر آتے ہیں سب بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسان کی زندگی کی کہانی ہوتی ہے۔ اتنی خوبصورتی و حسن و جمال گڑھے فردے نہیں تخلیق کر سکتے۔ تاریخ انسان کے ان اصل کارناموں کا ہیٹھا جگتا ثبوت ہے۔

میں مہارک علی کی شکر گز رہوں کہ انہوں نے مجھے سوچنے کا یہ نیا انداز دیا اور روایتی تاریخ پر مبنی سوچ کو گڑھا مردہ بنا دیا۔

ایک ٹیڑھے خان صاحب کی کہانی

دعوت اللہ خان

خان صاحب بڑے نام والے تھے، قراۃ عین حیدر ایک ادیب تھیں، جو مندر
تاتھ منڈاں ایک قانون دان سیاست دان تھے لہذا انہوں نے جدید تازیانہ کی مستقبل کیس ہے۔ ہمارے
ڈاکٹر مبارک علی صاحب کو بھی فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ نظر تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔ مگر وہ یہ
اندازہ ہوتے ہی حوصلہ ہارنے کے بجائے سحر کا ڈب کو سحر صادق سے بدلنے کے مرض میں مبتلا
ہو گئے۔ چونکہ ٹونک کے پٹھان ہیں لہذا جوش صاحب کی طرح طبیعت کی خاصیت بھی ناگنی۔ درد بھوک
کھانے کے بعد ستر (70) کے پینے میں بھی بائکین کی خوداری کا یہ عام کہ خود پت قیامت بھی مندر
جائے تو منہ سے سی ناٹکے۔ جسم مصلح سی مگر یہ کاری کے مدبیرے کو قلمی تلوار سے کاٹنے کی دھم
اب بھی چپ کی طرح جوان و سوار ہے۔

ہو سکتا ہے یہ کوئی اہم بات ہو کہ ڈاکٹر صاحب نے عرق ریز تصنیفات کی نصف پختی مکمل کر دی
ہے۔ مگر پچاس سے زائد کتابیں تو کئی لوگ لکھ چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب بہت اچھے نیچر ہوں۔
مگر بہت اچھے نیچر تو بہت سے مندرے میں۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب اعلیٰ پائے کے محقق ہوں۔ مگر اعلیٰ
پائے کے محقق تو دنیا میں کئی ہیں۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب بہت مفسر، ضیق اور اعلیٰ انسان ہوں لیکن یہ
بھی کوئی ایک بات نہیں۔ دراصل کوشش سے یہ اوصاف تو اب بھی مل جاتے ہیں۔ تو پھر سوال یہ ہے
کہ ڈاکٹر صاحب میں ایسا خاص اگر کچھ بھی نہیں تو میں ان پر کیوں لکھنا چاہتا ہوں؟

شاید اس لئے کہ کم از کم پاکستان میں ڈاکٹر مبارک علی اس وقت واحد مورخ ہیں جنہوں نے تاریخ
کے مضمون کو اوق مباحثوں، نیم دانشورانہ ڈرائنگ روم، کرم خوردہ سرکاری لائبریریوں کے جھانسی پسند
تھکیے عیسے، رد بوئی مزاج سادہ، ٹکریٹس کے توتہ میں تحقیقی مقالے چھپوانے پر مجبور تدریسی

تخلیق، ریڈ ٹیڑھے جرنیل و نوکر شاہی پس منظر والے جزوقتی واعظ ہزاروں، دس ہائی چودہ کی سکرین کے اندر
بند ذہنوں کے ساتھ بر جھان، ٹکریٹوں، ٹکریٹوں، ٹکریٹوں سے کہ اعظم تک ہر موضوع پر سائیکوٹل ٹکریٹوں
کی گروہی تیار رکھنے والے علمی پورچیوں، درباری سجادت کی بیاد پر تباہی ٹکریٹوں کوٹنے والوں اور
تاریخی میزائل کے کٹ پیسوں سے ہر سر کے ریڈی میڈ سپورسٹل ٹکریٹوں سے سینے والے ہزاروں
سے پٹنگل سے ٹکریٹوں سے قابل نہیں، زہر، مضمون، مضمون انداز میں ایسے کتابی ساشوں میں پیک کر دیا
کہ تاریخ کا مضمون بڈا سا بھی شغف رکھنے والے عام آدمی کی دسترس میں آ گیا ہے۔

دعوت اللہ خان نے ہر جرت کے بعد چار شور و غوغا کی زمین میں سائنٹیفک عوام دوست تحقیق کا
مندیہ پڑا۔ اس میں راجہ نے والی خود رو خاوار ساشی جھانریوں سے بچنے کی خاطر
ناہور کی برج کالونی کے ایک عام سے فلیٹ میں رہائش پذیر ڈاکٹر صاحب ساج میں چھپنے کے لئے
درکار ضروری علمی ٹکریٹ اور نخت تک سے جاری ہیں۔ یوں مروجہ بادی پیا لوں کے اعتبار سے وہ ایک
ناگامی ہیں۔ یہاں کی کنفرسٹ دانش گاہوں میں ان کے لئے حتمی ضرور پیا جاتا ہے۔ بلکہ یوں
بہنا چاہتے کہ اصل ان کے منفرد کام سے ہر کیمر کا فقیر حزانہ ٹکریٹا ہے تاکہ ان سے ہر جہاں استفادہ
نہ کرنا پڑے۔ اس کے باوجود خاصاتی طبیعت کے امیر ڈاکٹر صاحب بیرونی جماعت سے آنے والی
چیش کشوں کو ٹکریٹ کر دیا ہی لطف کشید کرتے ہیں جیسے سارتر نے وینل نعم ٹکریٹ کر کشید کیا ہوگا۔

اب سے ہی ذہن پر جن جن اصی ب و صی بیات سے، ادب شجاعت دی ن میں سے اکٹرنے کی ناکسی
دور حکمرانی میں اس شجاعت کی داد و سود وصول کر لی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب چونکہ تعلیم میں تھاق کی
خیانت کی وہاء کے عجیبہ مرض سے برسر پیکار ہیں لہذا فوجی دور ہو کہ سولین، آمریت ہو کہ آمرانہ
جمہوریت۔ وہ کسی حکمران اور کسی دور کے کام کے نہیں۔ ایک دور میں انہیں جانے کس خطہ فہمی میں
سنی کیشن میں شامل کر یا گیا۔ وہ تو ٹکریٹ ہے کہ شامل کرنے والوں کو جلد ہی غلطی کا احساس ہو گیا اور
ڈاکٹر صاحب پھر سے اپنے مانوس کمرے میں لوٹ آئے۔

پھر بھی ایک ایسے زمانے میں جب اعلیٰ تعلیمی اداروں میں درست تاریخ کو کبھی نسخہ تاریخ پڑھانے
اور پڑھنے والے بھی نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ناکامی سے کام لیتے ہوئے
کچھ ایسے محققین پیدا کر دیئے ہیں جن کے سبب ڈاکٹر صاحب کی مٹی برحق سچائی کی تلاش کا کام ویسا
پھل در درخت ضرور بن جائے گا جس کی جڑیں دور تک پتی ہی زمین میں پھیلی ہوئی ہوں گی اور اس
کے سارے تلے مستحق کے تحقیقی مسافر دم سے سکیں گے اور اس درخت کے کچھ بیج اپنے سامان میں

باندھ کر آگے بھی بڑھ سکیں گے۔

دراصل یہی سافران تلاشِ حقیقت تاریخ کے مضمون کو ایک بت بنا کر جہل کا چڑھاوا دھونے کرنے والے پروہتوں اور عقیدے و تاریخ کو غلط مصلط کرنے والے تحفل باز مداروں سے ہماری آپ کی جان چھڑائیں گے اور اگر ہم نہیں تو ہمارے بچے یہ ٹھونک کے کہہ سکیں گے کہ

کوئی قاتل نہیں گذرا اب
جس کو تاریخ بچا کرے جائے

(عظیم)

کاش ڈاکٹر صاحب ایسے نہ ہوتے۔ ذرا سی دنیا دار روایتی شخصیت ہوتے۔ آئین نو سے ڈرتے طرزِ گہن پہ اڑتے۔ خسارے کو منافع نہ جانتے۔ افسروں کی چھوٹی موٹی فرمائشوں کو بھی بے مانے میں کیا حرج تھا۔ خود در دھوکہ کھائے کے بجائے جس تحقیق کو بہر کی طرح گلی گلی، ایوان در یون، دفتر در دفتر نچا کر داد و تحسین و مال بٹورنے والے کرتی بننے میں کیا قہر تھی۔

کاش وہ بھی اہلِ ملاقات اور ان کے مصاحبین کے ناز اٹھاتے اور ہر آکر اپنی جڑ ستہ دندانہ کے افسانوی قصے بنا کر ہم جیسوں کو مرعوب کرتے اور نائی کی ناٹ درست کرتے کرتے کار کی کچھلی نشست پر بیٹھتے بیٹھتے ہم سے ایک کاروباری سی مسکرتی معذرت کرتے کہ معاف کیجئے مجھے گورر صاحب یا وزیر اعلیٰ صاحب یا سیکرٹری ایجوکیشن صاحب یا یو ایس ایڈ صاحب سے بچو کیشن ریفارمز پرائیڈ واکس کے سنے نہ بنایا ہوتا تو آپ سے مزید گپ شپ رہتی۔

اگر اب کچھ ہو جاتا تو اس سے فوری فائدہ تو یہ ہوتا کہ میں یہ مضمون لکھنے سے بچ جاتا کیونکہ مجھ دنیا دار کے دماغ کو اس کائنات کے منصور، سردار و مبارک وغیرہ بالکل سمجھ میں نہیں آتے۔

پھر بھی دل یہ کہنے پر جانے کیوں بضد ہے۔

تھینک یو ڈاکٹر مبارک علی صاحب۔۔۔!

ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں

قاضی جاوید

ڈاکٹر مبارک علی کے مداح ہزاروں ہیں اور میں اپنا شمار ان میں کرتا ہوں۔ اُن سے نیاز مندی کی ایک تہائی صدی بیت چکی ہے۔ وہ 1970ء کی دہائی کے آخری سال تھے جب مجھے ڈاکٹر صاحب کی دو پہلی کتابوں "المیہ تاریخ" اور "برصغیر کے مسلم معاشرے کا المیہ" کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ انہی دنوں جتنے جتنے موضوعات پر میری ایک دو کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ وہ میرے سنے کچھ سہانے دن نہ تھے کہ کئی بھنوں نے گھیر رکھا تھا۔ چنانچہ ایک ہم خیال دوست تک رسائی پائے کی خواہش سے مغلوب ہو کر میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط بھیجا۔ اُس زمانے میں وہ سندھ یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد تھے۔ خط اُن تک نہ پہنچا اور میں جواب سے محروم رہا۔

ڈاکٹر مبارک علی سے میری پہلی ملاقات 1985ء میں ہوئی جب وہ لاہور آئے تھے اور معروف صنعت کار نصیر اے شیخ صاحب مرحوم کے دوست گدہ پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پروفیسر وارث میر مرحوم نے مجھے اس بارے میں اطلاع دی اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے۔ وہ خوش بختی کا کوئی لمحہ تھا کہ ایک ملاقات نے دو دوست بخش دیئے۔ ایک ڈاکٹر مبارک علی اور دوسرے نصیر اے شیخ۔ بعد میں کئی برسوں تک ڈاکٹر صاحب لاہور آتے رہے اور چھاؤنی میں شیخ صاحب کی رہائش گاہ پر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب نے سندھ یونیورسٹی سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی اور لاہور منتقل ہو گئے۔

میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو گزرے ہوئے برسوں کی درجنوں ملاقاتیں یاد آ رہی ہیں۔ خیر یہ ایک الگ داستان ہے جو شاید کبھی کاغذ پر آ جائے۔ یہاں ابت میں چند باتیں ڈاکٹر صاحب کی نگارشات کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ اُن کی تحریروں کی جن خوبیوں نے ہم سب کو متوجہ کیا ہے، اُن

میں سے دو تین تو بالکل عیاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان میں تاریخ کے جدید انداز نگارش کو متعارف کروایا ہے۔ ہمارے موزعین عام طور پر تاریخ کو الہیات قوم پرستی اور دوسرے قومی، مذہبی اور اصلاحی جذبوں سے گنڈھ کرتے رہے ہیں۔ ان جذبوں کے غیر ضروری بوجھ سے تاریخ کو آزاد کرنا سہل نہ تھا۔ اس کے لئے ایک موثر اور بڑے موزع کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں نے ہمارے ہاں تاریخ کو نیکو اور جدید طریقہ احساس کے حوالے سے مرتب کرنے کا فرض خوبی سے ادا کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں تاریخ کو ایک با معنی انسانی عمل کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتابیں محض معصومات مہیا نہیں کرتیں بلکہ نیا شعور بھی عطا کرتی ہیں۔ وہ ماضی کے حوالے سے حال کے فہم کا راستہ بناتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موٹی موٹی کتابیں نہیں لکھتے۔ اچھے کتب لکھتے ہیں۔ درپیش اور قابل فہم زبان پر وہ کاربائے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قارئین سے محبت کرتے ہیں۔ دوسرا کتب لکھتے ہیں۔ آگے کی طرف جتے ہیں۔

یہ دو میں تین باتیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے حسابی کتب لکھی ہیں اور نہ ہی وہ محض تاریخ میں دیکھی رکھے۔ وہ علماء و فضلاء کے لئے لکھتے ہیں۔ وہ عاصم یا فتنہ و گوس سے مخاطب ہوتے ہیں۔ تحریری عمل کے دور میں ان کے پیش نظر جو مکانی قارئین رہتے ہیں، وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے ذہین اور تعلیم یافتہ افراد ہیں جو اپنے سماج کو اور اپنی دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں اور مدد لئے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ ان میں مثال کے طور پر طب علم، استاد، ادیب، صحافی اور دانش ور شامل ہیں۔ یہ سب وہ صاحبان میں جو سماجی تبدیلی کے عامل بن سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ وہ قنادگان خاک کے لئے لکھتے ہیں۔ سب انہوں نے یہ بتایا ہے کہ جب عوام کو تاریخ میں جگہ نہ ملے تو ان کی شناخت گم ہو جاتی ہے۔ ان کی زندگیوں بے معنویت کی زد میں آ جاتی ہیں۔

یہ ایک نیا نقطہ نظر ہے۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے عوام کے زویر نگاہ سے تاریخ نہ لکھی گئی تھی۔ خیر، مجھے احساس ہے کہ بعض لوگ مجھ کو کہتے ہوئے، مارکی موزعین کا حوالہ دینا چاہیں گے۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ بے شک ہمارے مارکی دانش ور عوام کے حوالے سے تاریخ کو سمجھنے کے مدد ہیں۔ مگر انہوں نے تاریخ نگاری پر زیادہ توجہ دی نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی اور مارکی دانش وروں میں مطالعتیں تلاش کر لی جائیں تو بھی دونوں کے فکٹ ہائے نگاہ میں ایک نازک سا فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخی مادیت کے اثرات قبول تو کئے ہیں، لیکن وہ مارکی نہیں ہیں۔ وہ کچھ کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ فلسفہ تاریخ کی تشکیل کے دوران کارب، مارکی کا رویہ ضرورت سے زیادہ یورپ پرست رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مارکی نے تاریخ کا جو تصور دیا ہے، اس میں بنیادی طور پر یورپی ماٹریز پیش نظر رکھا گیا ہے۔ وہ یورپی تاریخ کی سس پر نظر یہ ساری کرتا ہے اور اس سے حد ہونے والے نتائج کا اطلاق غیر یورپی دنیا پر کرتا ہے۔ اصل میں بنیٹل بھی اسی انداز نظر کا شکار تھا اور اس نے یورپ کو توجہ کا مرکز بناتے ہوئے مشرقی دنیا اور خصوصاً ہندوستان کو تاریخ سے خارج کر دیا تھا۔ مارکی بھی کسی قدر ہنگامہ پٹ کے ساتھ یہ کہنے پر آمادہ ہو جاتا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس خطے کی کوئی تاریخ نہیں ہے یا یہ کہ اس خطے کی تاریخ لکھی نہیں گئی۔ ہاں، اس کا مطلب یہ ضرور ہے کہ تاریخ کے انیسویں صدی کے جرمن کلاسیکی فلسفہ کے زاویہ سے تاریخ سازی اور تاریخی عمل کو دواں دواں رکھنے والے جو عوامل ہوتے ہیں، وہ ہندوستان میں غنقا تھے۔

کئی تحریروں میں ڈاکٹر مبارک علی نے اس موقف پر فکٹ قیام کرتے ہوئے اس کو مفاد آمیز ضہر یا ہے۔ تاہم وہ مانتے ہیں کہ تاریخی عمل کو سمجھنے کے لئے، مارکی کے کئی نظریات بہت اہم ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہندوستان یا مشرق کی دوسری تہذیبوں کا مطالعہ یورپی ماٹریز بنیاد پر یا یورپی فریم آف ریفرنس میں نہیں کیا جانا چاہئے۔ تہذیبوں کا تاریخی عمل و اس کے مقدمات یورپی تاریخ سے بہت مختلف ہیں۔ لہذا ان کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا جانا چاہئے۔ مارکی اور مارکی تاریخ نگاروں سے یہ اختلاف جہاں ڈاکٹر صاحب کے مخصوص انفرادی نقطہ نظر کی نشاندہی کرتا ہے، وہیں اس سے یہ بھی معوم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نظریے کے حوالے سے تاریخی حقائق کو دیکھنے کے بجائے حقائق کو اویٹ دیتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ میری اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ ڈاکٹر مبارک علی مغربی دنیا کی فکٹ اور مقبول تجربی رسائی (Empirical approach) کی جانب مائل ہیں۔ تاریخ کو لکھنے کا یہ رویہ دنیا کی اکثر یورپیوسنیوں و علمی حلقوں میں معتبر مانا جانے لگا ہے، اور ہمارے تاریخ دان اور دانش ور حلقوں میں اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ عقل عامہ بھی اس کی تائید کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ بقدر اس تصور کی فکٹ کرنے والے دواں کو تلاش کرنا محال ہوتا ہے کہ مورخ کا کام بس یہ ہے کہ ماضی میں جو کچھ پیش آیا ہے، وہ اس کو جوں کا توں ریکارڈ میں لے آئے۔

کاش یہ ممکن ہوتا۔ لیکن یہ محال ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعات بے شمار ہوتے ہیں اور ان سب کو اکٹھا کرنا اور محفوظ کرنا ممکن نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک واقعہ کو بیان

میں سے دو تین تو بالکل عیاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے رد و زبان میں تاریخ کے جدید انداز نگارش کو متعارف کروایا ہے۔ ہمارے مؤرخین عام طور پر تاریخ کو لہیت، قوم پرستی اور دوسرے قومی، مذہبی اور اصلاحی جذبوں سے گھنڈ کرتے رہے ہیں۔ ان جذبوں کے غیر ضروری بوجھ سے تاریخ کو آزاد کرنا سہل نہ تھا۔ اس کے لئے ایک موثر اور بڑے مؤرخ کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں نے ہمارے ہاں تاریخ کو سہول اور جدید طرز احسن کے حوالے سے مرتب کرنے کا فرض نہی سے ادا کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں تاریخ کو ایک با معنی انسانی عمل کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتابیں محض معلومات مہیا نہیں کرتیں بلکہ نیا شعور بھی عطا کرتی ہیں۔ وہ ماضی کے حوالے سے حال کے فہم کا راستہ بناتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موٹی موٹی کتابیں نہیں لکھتے۔ وہ مختصر کتاب لکھتے ہیں اور سلیس و قابل فہم زبان بروئے کار لاتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قارئین سے محبت کرتے ہیں اور ان کو ساتھ لیتے ہوئے آگے کی طرف چلتے ہیں۔

یہ وہ میں تین باتیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نہایت سبب بھی میں اور نہ ہی وہ محض تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے علماء و فضلا کے سے لکھتے ہیں۔ وہ عام قارئین یا قاریوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ تحریری عمل کے دوروں اس کے پیش نظر جو امکاں قاری میں رہتے ہیں، وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے ذہن اور تعلیم یافتہ افراد میں جو اپنے سماج کو درپانی دینا کو سمجھتا چاہتے ہیں، وہ بدینے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ ان میں مثال کے طور پر طب علم، استاد، ادیب، صحافی اور دانش ور شامل ہیں۔ یہ سب وہ صاحبان ہیں جو سماجی تبدیلی کے عامل بن سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ وہ قاریوں کا حکم کے لئے لکھتے ہیں۔ سب انہوں نے یہ بتایا ہے کہ جب عوام کو تاریخ میں جگہ نہ ملے تو ان کی شناخت گم ہو جاتی ہے۔ ان کی زندگیوں بے معنویت کی زد میں آ جاتی ہیں۔

یہ ایک نیا نقطہ نظر ہے۔ ہمارے ہاں، اس سے پہلے عوام کے زاویہ نگاہ سے تاریخ نہ لکھی گئی تھی۔ خیر، مجھے حس ہے کہ بعض لوگ مجھ کو نوکتے ہوئے، مارکی مؤرخین کا حوالہ دینا چاہیں گے۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ بے شک ہمارے مارکی دانش ور عوام کے حوالے سے تاریخ کو سمجھنے کے مددگار ہیں۔ مگر انہوں نے تاریخ نگاری پر زیادہ توجہ دی نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی علی اور کسی دانش وروں میں مطالعتیں تلاش کر لی جائیں تو بھی دونوں کے تکتے ہائے نگاہ میں ایک نازک سا فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخی روایت کے اثرات قبول تو کئے ہیں، لیکن وہ مارکی نہیں ہیں۔ وہ کچھ کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ فلسفہ و تاریخ کی تشکیل کے دوران کارل مارکس کا رویہ ضرورت سے زیادہ یورپ پرست رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مارکس نے تاریخ کا جو تصور دیا ہے، اس میں بنیادی طور پر یورپی ماڈل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ وہ یورپی تاریخ کی اساس پر نظریہ سازی کرتا ہے اور اس سے جذبہ ہونے والے نتائج کا حقائق پر یورپی دیا کرنا ہے۔ اصل میں یہ بھی کسی انداز نظر کا شکار تھا اور اس نے یورپ کو قہر کا مرکز بناتے ہوئے مشرقی دنیا، و خصوصاً ہندوستان کو تاریخ سے خارج کر دیا تھا۔ مارکس بھی کسی قدر ہنگامی سمٹ کے ساتھ یہ کہے پر آمادہ ہو جاتا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس خطے کی کوئی تاریخ نہیں ہے یہ کہ اس خطے کی تاریخ لکھی نہیں گئی۔ ہاں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خطے کی تاریخ کے انیسویں صدی کے جرمن کلاسیکی فلسفہ کے زاویے سے تاریخ سازی و تاریخی عمل و صورتوں کو دیکھنے والے حوالے ہوتے ہیں، وہ ہندوستان میں غفلت تھے۔

کئی تحریروں میں ڈاکٹر صاحب کی نے اس موقف پر تکتے چینی کرتے ہوئے اس کو مفید آ میر نظر لیا ہے۔ تاہم وہ مانتے ہیں کہ تاریخی عمل کو سمجھنے کے لئے، مارکس کے کئی نظریات بہت کم ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہندوستان یا مشرق کی دوسری تہذیبوں کا مطالعہ یورپی ماڈل کی بنیاد پر یا یورپی فریم آف رفرنس میں نہیں کیا جانا چاہئے۔ تہذیبوں کا تاریخی عمل اور اس کے مقبول تاریخ سے بہت مختلف ہیں۔ لہذا ان کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا جانا چاہئے۔ مارکس اور مارکسی تاریخ نگاروں سے یہ اختلاف جہاں ڈاکٹر صاحب کے مخصوص فردی نقطہ نظر کی نشاندہی کرتا ہے، وہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نظریے کے حوالے سے تاریخی حقائق کو دیکھنے کے بجائے حقائق کو روایت دیتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ میری اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ ڈاکٹر صاحب کی علی مغربی دنیا کی فنی اور مقبول تجربی رسائی (Empirical approach) کی جانب مائل ہیں۔ تاریخ کو لکھنے کا یہ رویہ دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں و علمی حلقوں میں معتبر مانا جانے لگا ہے اور ہمارے تاریخ دان اور دانش ور حلقوں میں اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ عقل و علم بھی اس کی تائید کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ بظاہر اس تصور کی فنی کرنے والے دلائل کو تلاش کرنا محال ہوتا ہے کہ مورخ کا کام بس یہ ہے کہ ماضی میں جو کچھ پیش آیا ہے، وہ اس کو جوں کا توں ریکارڈ میں لے آئے۔

کاش یہ ممکن ہوتا۔ لیکن یہ بھی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعات بے شمار ہوتے ہیں اور ان سب کو اکٹھا کرنا اور محفوظ کرنا ممکن نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک واقعہ کو بیان

کرتے ہیں تو ان کے بیان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات اس قسم کے بیانات ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ اس لئے ان سب کو جانچنا اور کسی ایک حقیقت تک پہنچنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ تاریخ کی کتابیں غلط کر دیکھ لیجئے۔ دو یا دو سے زیادہ مورخین جب کسی ایک واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو ان کے بیان عموماً ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے دانش ور اور مورخ اس تصور کے دام فریب میں آ جاتے ہیں کہ اگر تاریخ نگار اپنے آپ صرف واقعات بیان کرنے تک محدود رکھیں تو ماضی کی ”صحیح تاریخ“ مرتب کی جا سکتی ہے۔ خیر، اکثر مبارک علی کو ہم اس قسم کے تاریخ نگاروں میں شمار نہیں کر سکتے۔ اپنی تاریخی بیسیرت کے باعث وہ جان جاتے ہیں کہ ہم عام کو متاثر کرنے والا یہ نقطہ نظر مغالطہ آمیز ہے۔ تاریخ نگاری کے تجربی منہاج کو مسترد کرنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ ماضی واقعات کا اس قدر بڑا اور بے ہنگم مجموعہ ہے کہ مورخ کو دلچسپ انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے۔ جب وہ انتخاب کرتا ہے تو داخلی یعنی subjective عامل متحرک ہوتا ہے اور وہ معروضیت یا غیر جانب داری کو ضعف پہنچاتا ہے جو کہ تجربی منہاج کا آدرش ہے۔ نژاد پل سارتر نے اس حوالے سے یہ کہا تھا کہ تاریخ نگار تاریخ نگاہ نہیں بلکہ اُس کو بناتا ہے۔ وہ جن حقائق و واقعات کو چن کر لیتا ہے وہ محفوظ رہ جاتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ چھوڑ دیئے جانے والے یا نظر انداز کر دیئے جانے والے حقائق و واقعات ماضی کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے کم از کم ایک جگہ جرمین مورخ رنگے سے بھی حقائق کا اظہار کیا ہے جس کا کہنا یہ تھا کہ معروضی (objective) مانگ کرتی ہے کہ معرض وجود میں آنے والے تمام واقعات کو بیان کیا جائے۔ لیکن درحقیقت اس انداز میں لکھی ہوئی تاریخ ایسی شے ہوگی جس کا کوئی مطالعہ نہ کرنا چاہیے گا۔

یہاں ایک اور بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے مطالعہ سے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ سارتر کی حد تک نہ جاکیں تو بھی وہ تاریخ سے مورخ کو خارج کرنے کی اجازت دینے پر مائل نہیں ہیں۔ چنانچہ طور پر وہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ لکھنے والا تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اُس کا اپنا ایک رول ہے اور اُس کو ختم نہ کرنا چاہئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ رول جائز حدود سے نہیں ٹکنا چاہئے۔ یہاں پیش نظر رکھنے والا یہ بات یہ ہے کہ ان جائز حدود کی خلاف ورزی اس وقت ہوتی ہے جب مورخ اپنے کسی مقصد یا مفاد کی خاطر حقائق و واقعات کو جان بوجھ کر توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ خلاف ورزی اُس وقت بھی ہوتی ہے جب مورخ کسی مذہب، نظریئے یا آئیڈیالوجی کی گرفت میں ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ معروضی دراک اور متوازن فیصلوں کی اہلیت کھودیتا ہے۔ اُس کو وہ کچھ دکھائی

نہیں دیتا جو کہ موجود ہے بلکہ اُس کو وہ کچھ دکھائی دیتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب وہ تاریخ لکھ نہیں رہا ہوتا بلکہ اپنی ذاتی تسکین کا سامان کٹھ کر رہا ہوتا ہے۔ اُس کی نگاہیں اپنے مذہب، نظریئے یا آئیڈیالوجی کی تائید کرنے والے حقائق و واقعات سے آگے نہیں جاتیں۔ تسکین کی نوبت اُس کی ذات کو معطل کر دیتی ہے اور یہاں تک کہ وہ حقیقتوں کو چھپا دے یا ان کو مسخ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

اپنے بہت سے مضامین میں، اعتراف اور کتابوں میں ڈاکٹر مبارک علی نے اس قسم کی نظریاتی تاریخ نگاری کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ دوران کے کام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کی تاریخ نگاری سے پیدا ہونے والے معضلوں اور گمراہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ہمارا کام طبقہ اور سرکاری مراعات سے مستفید ہونے کے آرزو مند دانش ور اس ملک کو نظریاتی ریاست قرار دیتے ہیں، لہذا وہ نظریاتی تاریخ کے دمدادہ ہیں۔ ان کو معروضی تاریخ سے یا غیر جانبداری سے لکھی جانے والی تاریخ سے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اس کو ملک کو نقصان پہنچانے کی سازش سے تعبیر کرتے ہیں، اور نظریاتی تاریخ نگاری کی سرپرستی کرنے پر آمادہ رہتے ہیں، ڈاکٹر مبارک علی نے اس روش پر خاص طور پر نکتہ چینی کی ہے۔ اس موضوع پر ان کے خیالات بہت سے مضامین میں ملتے ہیں۔ جن میں سے ایک ”پاکستان میں تاریخ نگاری کا مضمون“ ہے۔ یہ مضمون مجلہ تاریخ کے فہرہوں میں شمارے میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک کتاب ”تاریخ اور نصابی کتب“ خصوصاً اس موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ پاکستانی ریاست تاریخ کے مضمون کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ اُس کا مضمون نظریئے ہے کہ تاریخ سے اُس نظریئے کی توثیق کا کام لیا جائے جس کو وہ نظریئے پاکستان کا عنوان دینے لگی ہے۔ ہذا حکمرانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ تاریخ کے انصاف و تحقیق میں اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس نظریئے اور اُس کے تقاضوں کی بہر طور باوقافی ثابت ہو۔ ہماری صابی کتب اس خواہش کی عکاس ہیں جن میں صرف اُن موضوعات اور خیالات کو شامل کیا جاتا ہے جو حکمران طبقوں کے مفادات کو آگے بڑھاتے ہوں۔ یوں جو تاریخ لکھی جا رہی ہے وہ مسخ شدہ تاریخ ہے۔ وہ نوجوانوں میں مثبت تاریخ کا شعور پیدا کرنے کی اہلیت سے محروم ہے۔ یہ بھی ہے کہ بارائی طبقوں کو معروضی تاریخ میں کوئی دلچسپی اس لئے بھی نہیں کیونکہ وہ اُن کی سیاہ کاریوں، سازشوں اور خامیوں کو ریکارڈ میں لے آتی ہے۔ عام لوگ روایتی انداز کی تاریخ کے مطالعہ سے بے زار ہو گئے ہیں۔ وہ ایسی تاریخ چاہتے ہیں جس میں حقیقی اہمیت کے حامل موضوعات ہوں۔ وہ اپنے موجودہ حارت کو تاریخ

کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتا چاہتے ہیں کہ آزادی کی دو تہائی صدی کے بعد بھی وہ کیوں سیاسی استحکام و معاشی خوش حالی سے محروم چھے آرہے ہیں۔ وہ واقعات کی حقیقت جانتا چاہتے ہیں۔ تاریخ ان کے تقاضوں کا جواب دے سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے ہم اسے اس کو نظریاتی پابندیوں سے آزاد کیا جائے۔

خیر، آئیے اب تاریخ کے بارے میں ایک اور نکتہ سے بھی بات ہو جائے۔ اپنی حادیہ تحریروں میں، اور ان سے میری مراد اکیسویں صدی میں لکھی جانے والی تحریروں میں، ڈاکٹر مہارگ علی نے تاریخ میں قوت کے رول کو پیسے سے زیادہ اہمیت دینا شروع کی ہے۔ اس موضوع پر ان کے تازہ ترین خیالات ان کی "خوابِ نوشت" میں "میر و دنیا" کے ایک باب میں ملتے ہیں جس کا عنوان "تاریخ کے تاثرات" ہے۔ یہ ستمبر 2012ء کے آخری مفتوں میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس میں وہ جانتے ہیں کہ تاریخ میں قوت کا کردار اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ جب کوئی قوم سیاسی، معاشی اور فوجی لحاظ سے طاقت ور ہو جاتی ہے تو اس میں احساسِ برتری نشوونما پاتے لگتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس میں چند ایسی خصوصیات ہیں جن سے اس کا مقدر معروضی ہے۔ اس سے وہ دوسرے سے ممتاز ہوتی ہے اور زندگی کے ہم شعبوں میں ان سے آگے نکل گئی ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے عقیدوں، تہذیب و تمدن، رنگ و نسل کو دوسروں سے بہتر مانے لگتی ہے۔ دوسری قومیں اس کی نظر میں وقعت کھو دیتی ہیں اور پس منظر بن جاتیں۔ وہ وحشی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اس لئے وہ قوم دوسروں کی قیدت کرنے کو اپنا فرض مانے لگتی ہے۔ یہیں سے سامراجی عزائم کی شروعات ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو نامہ مانے اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے پر مائل ہو جاتی ہے۔ جب کوئی قوم اس کیفیت میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کا عام فرائض بھی قومی فخر و مہابت کی زائیں آجاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ قوی تر قوتی و دین میں اس کا بھی حصہ ہے۔ وضاحت کے لئے ڈاکٹر صاحب برطانیہ کی عظمت رفتہ کا حوالہ دیتے ہیں جب اس کی سلطنت پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اس وقت قوی و دین پر ایک غربت راہ انگریز کا سر بھی فخر سے بند ہو جاتا تھا، اور دوسری قوموں کے لوگ اس کی نظر میں گھٹیا اور پس ماندہ ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں امریکیوں کا بھی یہی حال ہے جو اپنی قوم کی عالمی فتوحات کو عظمت خیال کرتے ہوئے ان پر ناز کرتا ہے۔

طاقتور قومیں دوسروں سے اپنی بالادستی منوانا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ دوسری قومیں ان کی اطاعت کریں اور ان کی بالادستی کا اعتراف کریں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اس امر کی مثالیں بہت سی ہیں۔ انہوں نے ایتھنز کی فوج کا حوالہ دیا ہے جس نے ماس تائی ایک چھوٹے جزیرے پر حملہ کیا اور

اس کے حکمرانوں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں ورنہ فی الحال موت دیں گی۔ اس پر ماس کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ اس لئے تمہارا ہم پر حملہ ناجائز ہے۔ اس پر ایتھنز کے جنرل نے کہا کہ فطرت کا یہ قانون ہے کہ کمزور طاقتور کی یا تو حاکمیت کرتا ہے یا تسلیم کر لیتا ہے۔ چونکہ ہم طاقتور ہیں اور تم کمزور ہو، اس لئے ہمارا حق ہے کہ تم پر حکومت کریں۔ مگر تم مراد مت روئے تو اس کی مراد موت ہے۔ ماس کے لوگوں نے مزاحمت کی اور شکست کھائی۔ اس نتیجہ میں ان کے مردوں کو قتل کر دیا گیا اور اس کی عورتوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔

اس طرزِ عمل کی ڈاکٹر مہارگ علی نے، اور بھی مثالیں دی ہیں اور کہا ہے کہ آج بھی اس طرزِ عمل ہو رہا ہے۔ تاریخ کی اس تاریکی میں روشنی کی کرن یہ ہے کہ ہر معاشرہ میں مغرب اور باغی لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف لڑتے ہیں۔ وہ عوام کی آزادی اور معاشرہ کی خوش حالی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے فکری نظام میں روشنی کی یہ کرن عموماً باغی اور سب سے نتیجہ رشتی ہے۔ مل بھر کے لئے وہ اپنی چمک دکھاتی ہے اور پھر سب ہو جاتی ہے۔ یہ کیونکر ہوتا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اس نکتہ کی وضاحت ڈاکٹر صاحب کے ہی الفاظ میں پیش کروں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مغرب اور باغی لوگ جب اپنے مقاصد کے لئے، اپنے نصب العین کے لئے لڑتے ہیں تو عام لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ یوں بغاوت اور مخالفت میں یہاں کیے رہ جاتے ہیں۔ حکمرانوں کے لئے یہ آسان ہوتا ہے کہ ان کی آواز کو دبا دیں۔ انہیں الیٹ دے کر ان کو مجبور کر دیں کہ یہ خاموش ہو جائیں۔ قید و بند کی صعوبتوں سے ان کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور اگر بات زیادہ بڑھ جائے تو انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس سارے عمل میں معاشرہ خاموش تماشا بن جاتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے اور ان کو تہہ چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد سرکاری تاریخوں میں یہ باغی، شہر پسند، غیر ملکی ایجنٹ اور فتنہ فساد پیدا کرنے والے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں ان کا یہ ٹکس ٹوٹوں تو بھی اس نقطہ نظر کا منہ بنا دیتا ہے۔ ایسے جیسے ان کا وجود ہی نہیں تھا اور آنے والی نسلیں انہیں بھول جاتی ہیں۔

بادشاہیہ تاریخ کا تاریک نقطہ نظر ہے۔ لیکن ہم اپنے ماضی پر تنقید کا دوسرا اس کو جھٹکنا دشوار ہو جاتا ہے۔ خیر، اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے مورخ نے اس رنجیدہ ورمایوس کن صورت حال میں تاریخ کا ایک روشن ورا امید افزا پہلو بھی نمایاں کیا ہے۔ یہ پہلو انسان کی عظمت، اہل ارادہ اور لڑنے جانے کی خصوصیات پر مبنی ہے۔ ایک بار پھر خود انہی کے الفاظ پڑھ لیجئے۔ "تاریخ کے تاثرات" کے عنوان سے اپنی زندگی بھر کے تاریخ کے مطالعہ، تجزیہ اور غور و فکر کے

تاریخ پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ

”لیکن دوسری جانب تاریخ کا روشن پہلو (یہ) ہے کہ انسان کو چاہے جس قدر دبایا جائے، اس پر ظلم کیا جائے، پابندیاں عائد کی جائیں، ڈرایا اور خوف زدہ کیا جائے، مگر اس میں اپنے حق کے حصول کے لئے مزاحمت اور بغاوت ناچند یہ ختم نہیں ہوتا ہے اور وہ برابر وقت کے خلاف اٹھتا رہتا ہے۔ غلام اور کسان (تاریخ میں) برابر بغاوتیں کرتے رہے۔ اگرچہ انہیں احساس تھا کہ ان کی بغاوتیں ناکام ہوں گی، مگر حقوق کے حصول کے لئے انہوں نے جدوجہد کی اور تاریخ میں اضافہ کر گئے۔“

”یہ سبق ہے آمروں، مطلق العنان حکمرانوں اور طاقت کے متوالوں کے نام کہ جب نیچے اور اسلحہ سے محروم لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ ہر رکاوٹ کو دور کرتے ہیں اور ہر طاقت کو نکمیر دیتے ہیں۔ تاریخ کا یہ وہ پہلو ہے جو محروم طبقوں اور بے بس عوام کو حوصلہ دیتا ہے کہ تبدیلی ان کے حق میں آئے گی۔“

میں یہ سوچنے کا میاں رکھتا ہوں کہ تبدیلی کا یہ امکان ہی ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کو برس ۲۰۰۳ سے ۲۰۰۷ کے درمیان پروردہ کئے رکھا ہے۔ قریبی دوستوں کے حلقے میں وہ کبھی کبھی یہ شہرہ دینے والی مایوسی کی باتیں کیا کرتے ہیں کہ ہمارا سچ جس مرحلے پر آ گیا ہے، وہاں اب کسی قابل ذکر مثبت تبدیلی کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ لیکن مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ خود ڈاکٹر صاحب کی نگارشات سے مضبوط تبدیلی کا عمل تیز تر کر دیا ہے۔ انہوں نے صرف تاریخ لکھی نہیں بلکہ اپنے ہمارے قارئین کو نیا شعور دے کر تاریخ کو متحرک رکھنے میں بھی حصہ لیا ہے۔

خیر، میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ خاتمے تک پہنچنے کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کو، بنیادی طور پر، دو حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہئے۔ ایک حصے میں وہ کتابیں اور دیگر تحریریں آتی ہیں جن کا موضوع تاریخ ہے اور دوسرے حصے میں وہ تحریریں شامل ہیں جو تاریخ سے متعلق ہیں۔ وضاحت کے لئے میں یہ کہوں گا کہ پہلے حصے میں آپ جدید تاریخ، اصل دربار نجی زندگی کی تاریخ اور اکبر کا ہندوستان کو شامل کر سکتے ہیں، جب کہ تاریخ کی تلاش، المیہ تاریخ، تاریخ اور دانش ور اور تاریخ کے نئے زاویے جیسی کتابیں دوسری فہرست

میں آتی ہیں۔ آپ ان کی تفصیلات کی مکمل فہرست، جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے، کو پیش نظر رکھیں تو دیکھیں گے کہ یہی فہرست کے مقابلہ میں دوسری فہرست میں آنے والی کتب کی تعداد زیادہ ہے۔

میں اس تقسیم کو یہ بات کہنے کے لئے بیان کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی کو عموماً تاریخ نگار کے طور پر پہچانا جاتا ہے، لیکن وہ تاریخ کے نثریہ ساریجینی فلسفی، تاریخ بھی ہیں۔ ہاں یہ بھی ہے کہ میں پاکستانی فلسفیوں کے بد حال کنبہ میں شامل کرنے کا خواہش مند بھی ہوں۔

عمومی طور پر تاریخ دان تاریخ لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نہ صرف تاریخ نویس ہیں بلکہ تاریخ سازی بھی کرتے ہیں اس کا پودا لگاتے ہیں اس کی آبیاری کرتے ہیں اور پھر اس کی پھیراں لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں اور یہی اس کا اریہ معاش ہے وہ جگہ جگہ بخاراں کی طرح صد لگاتے ہیں تاریخ پر دھوا تاریخ سمجھو اور تاریخ لکھو۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے میں پچیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں متعارف ہوا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اسی دور میں ان کی تحریریں منظر عام پر آئی شروع ہوئی تھیں ان کی پہلی کتاب جو قارئین تک پہنچی وہ تھی ”تاریخ کیا ہے“ اس کا اس اشاعت 1982ء تھا۔ پھر اس کے بعد ”تاریخ اور شعور“ تھی۔ ایک کتابچہ ”سندھ کی تاریخ کیسے لکھی جائے“ آگئی پہلی کیشن نے حیدرآباد سندھ سے 1983ء میں شائع کیا جس کی قیمت 3 روپے تھی۔ پھر اس کے بعد آگئی نے ہی دو اور کتابچے ”آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان“ اور ”مرسید اور اقبال“ 1984ء میں شائع کئے۔ یہ کتابچے بھی کسی پیشہ ور کا تب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں تھے بلکہ ہاتھ سے لکھی ہوئی، تحریریں تھیں جو ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے قلم سے لکھی تھیں۔ ایک اور کتاب ”تاریخ اور رویت“ بھی اسی دور میں لکھی گئی لیکن جبران بک کمپنی حیدرآباد نے شائع کی تھی۔ من اشاعت اس پر درج نہیں ہے لیکن مبارک صاحب نے پیش لفظ کے نیچے 10 نومبر 1983ء کی تاریخ لکھی ہے۔ میں نے یہ کتاب 27 جولائی 1986ء کو کراچی میں خریدی تھی۔ بعد ازاں کتابیں، قاعدہ، انداز میں چھپی شروع ہو گئیں۔ لیکن ان کی زیادہ تر کتابیں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوئیں۔ کچھ کتابیں دوسرے اشاعت گروہوں سے بھی چھپیں۔

اس کے بعد جب ڈاکٹر صاحب نے لاہور میں رہائش اختیار کر لی تو انہوں نے کتابی سلسلہ ”ہی تاریخ“ فکشن ہاؤس سے غانا 1999ء میں شروع کیا کیونکہ اسے شائع کی تاریخ اشاعت جولائی 1999ء سے۔ اس وقت ایک شمارے کی قیمت 100 روپے تھی، سارا کام اس دوران وہ خود ہی کرتے تھے لیکن بعد ازاں ایک مجلس مشورت بھی قائم کر دی گئی جس میں نامور لوگوں کے نام شامل ہیں۔ ان میں وقار قاتلہ جی بھی آتی رہتی ہے۔

یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ پاکستان سٹڈی سینٹر کراچی کے ڈائریکٹر جعفر احمد نے سہ ماہی ”تاریخ“ کو چاری رکھنے میں بہت محنت سے کام کیا ہے۔ وہ کئی سال تک (Perspective) ”ارتقاء“ اور ”ماہی“ ”تاریخ“ پر بہ یک وقت کام کرتے رہے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ بلکہ ڈاکٹر مبارک علی نے جعفر احمد کے ساتھ مل کر پاکستان میں اپنی کاوشوں

تاریخ ساز۔ ڈاکٹر مبارک علی

اشفاق سیم مرزا

ہمارے ارد گرد جو قابلِ حشر شخصیات مختلف ماحول سے وابستہ ہیں یا رہی ہیں، مگر ان کا کوئی خاکہ لکھنے بیٹھے تو ان سے متعلق کئی کرداری مظہر نامے کھل جاتے ہیں۔ مشار کے طور پر ڈاکٹر سیم الزماں صدیقی مرحوم پر ہی بات کر رہے ہیں ان کی شہرت کی بڑی وجہ تو کیسے دان ہونا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ ایک مصور بھی تھے ان کا ادبی ذوق بھی علی پائے کا تھا اور انہیں شاعری کے ساتھ بھی خصوصی لگاؤ تھا وہ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ غرض یہ کہ وہ بہت سے فنونِ لطیفہ کی طرف راغب تھے۔ اسی طرح رضا کاظم صاحب کو دیکھئے، پیٹھے کے اعتبار سے تو وہ قانون دان ہیں۔ لیکن زندگی کا بیشتر حصہ انہیں مارو کی سیاست میں گزارا، پھر انہوں نے شعبہ موسیقی میں جو کام کئے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان دو محترم بزرگوں کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ گو ان کی بہت شہرت کسی ایک پیٹھے سے تھی لیکن دوسرے مشغل میں بھی وہ بہت وقت فعال تھے۔ مثلاً میجر سابق محمد حفصہ فرصت کے محلوں میں رضا کاظم کے ساتھ شطرنج بھی کھیل کرتے تھے۔ اسی طرح میکسم گورکی ورینن کی ایک مشہور تصویر ہے جس میں وہ دونوں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔

درب میں اپنے دوست ڈاکٹر مبارک علی کا ذکر اس بنیادی بات سے کروں گا کہ ان کا ذہن پھوٹا ہوا تھا ہے۔ تاریخ ان کا روزگار ہے وہ اسی میں سانس لیتے وراہی میں جیتے ہیں۔ شاید یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تاریخ ان کی ہیر ہے اور وہ اس کے رانچے ہیں۔ جس طرح محبوب یا محبوبہ کو کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا اسی طرح جس طرح تاریخ کو وہ کہتے ہیں وہی تاریخ کو ان کے سامنے کوئی بُرا بھلا نہیں کہہ سکتا۔ وہ تاریخ کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے، تاریخ کے ساتھ گستاخی ان کے اپنے ساتھ گستاخی کے مترادف ہے۔

سے تاریخ کانفرنس کا بھی آغاز کیا اور پاکستان کی کئی جماعت اور تقسیمی اداروں نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر کراچی یونیورسٹی کے علاوہ میں گجرات یونیورسٹی اور نیشنل کالج کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس کام میں گجرات یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر نظام الدین اور سجادہ وٹل کا بہت تعاون حاصل رہا۔ کانفرنسوں کا یہ سلسلہ بھی تک جاری ہے لیکن فنڈز کی کمی کی وجہ سے کبھی قسط پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب پر صاحب آراء ان کے کام اور کردار کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کریں گے لیکن میں ان کی تاریخ سازی کے ساتھ ان کا مختصر سا کردار کی خاکہ کھینچوں گا۔ کیونکہ ایک عرصہ سے نہ صرف میری اس کی دوستی ہے بلکہ میں کسی نہ کسی طرح اپنی بساط کے مطابق ان کے کام میں اپنا حصہ ڈال رہا ہوں۔

تاریخ سازی کے ضمن میں دو باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں کوئی حتمی بات کرنے سے گریزاں رہتا ہوں۔ علم کے حوالے سے حتمی بات دیے بھی زیب نہیں دیتی۔ اس سلسلے میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے سب سے بڑے تاریخ نویس ہیں۔ لیکن ایک بات میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو عوام میں مقبول بنانے کا جو بیڑا اٹھایا اس میں وہ کامیاب رہے۔ مگر میں یہ کہوں کہ ایسا کرنے میں ان کے کچھ اہداف تھے جن کی طرف ان کی ہر تحریر واضح اشارہ کرتی ہے۔

پہلا تو یہ کہ انہوں نے تاریخ اور الہیات میں واضح تقسیم کو قائم رکھا۔ انیا بھر میں الہامی کتابوں میں لکھی گئی تاریخ اور انسان کے ہاتھوں مرتب ہوئی تاریخ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ یہ دو واضح یکپ میں۔ ڈاکٹر صاحب انسانی تاریخ کے داعی ہیں۔ الہیات کی مقصدیت اور چھاپ ان کی تحریروں میں کہیں نظر نہیں آتی۔ ان کی تحریروں نے پوری طرح تو تاریخی روایت کا بڑھاپا نہیں اور لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے ہاں تاریخ کے معمار عوام ہیں۔

اس حوالے سے انہوں نے تاریخ کو مزید دو طریقوں سے سوارا انہوں نے ایک طرف تو (Subaltern) نیچے طبقات کے تاریخ میں کردار کو بھرا اور سامنے لائے اور ان کی طرف توجہ دوائی۔ یہ کام ہندوستان میں بھی وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ ایک سیریز "Subaltern Studies" کے نام سے مورخ (Ranjit Goha) رنجیت گوہا نے شروع کر رکھا ہے۔ یہ نام انہوں نے انٹونیو گرامسچی (Antonio Gramsci) سے لیا ہے جس نے یہ اصطلاح کم تر درجہ کے لوگوں کے لئے

ستعمال کی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مقامی علاقوں کی تاریخ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ بہت سے پرانے لکھنے والے بھی اس طرف راغب ہوئے۔ گویا ایک بہت ہی نازک کام ہے اور کٹھن بھی کیونکہ اگر آپ صرف مقامی تاریخ سیاق و سباق سے کٹ کر لکھیں گے تو اس سے انصاف نہیں کر سکیں گے مقامی واقعات اپنے اطراف کے عدالتی اور بین الاقوامی واقعات سے جڑے ہوتے ہیں اور اسی تناظر میں آپ اس کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ صرف مقامی تاریخ تک موقوف رہنا ایک میٹا کی مہمان ہوگا جو یکطرفہ ہوگا اس کام سے ایک نام تاریخ دل ہی نہ رہتا ہو سکتا ہے۔ میں جب عوام و تاریخ کی بات کر رہا ہوں تو اس سے مراد یہ نہیں کہ تاریخ صرف عوام بناتے ہیں بلکہ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جدید دور کی تاریخ میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔ وہ بھی بدولت یہ کہ معروض وجود میں آنے کے بعد یہ کام ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے باقی دور پر یہ بات من و عن صدق نہ آتی ہو۔ لیکن جدید دور میں جمہوریت کے پھیلنے کے بعد مغربی دنیا میں یہ ضرور ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان میں بھی جدید تاریخ کے نہ صرف پائے بلکہ تعلقات کو بھی وسعت دی، اور دوستوں سے یہ کہا کہ اردو زبان میں لکھیں کیونکہ اس زبان میں لکھی ہوئی تحریروں کو عوام کی اکثریت چڑھ سکتی ہے۔ ان کا یہ مشاہدہ بالکل درست ہے کیونکہ ان کی کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جنوبی پنجاب، سندھ اور ہوجستان میں ان کے قارئین کی تعداد زیادہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک کام یہ بھی کیا کہ یورپی تاریخی نشوونما اور موضوعات کو اپنی کتابوں میں سمویا۔ سماجی علوم کے حوالے سے یہ کام سید حسن اور علی عباس جلال پوری بھی بطریق احسن کر چکے ہیں۔ فلسفہ تاریخ کے تعلقات کو جس خوبی سے مبارک صاحب نے اپنی کتاب "تاریخ و فلسفہ تاریخ" میں متعارف کروایا ہے اس سے کوئی دو کی یاد تازہ ہوگی۔

سہ ماہی "تاریخ" پرانی تاریخی دستاویزات بھی نئے طور پر شائع کرنے سے عوام تک ان کی رسائی ہوئی۔

عرصہ دراز سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ راست باز انسان جب اپنے ارد گرد کے ماحول سے مایوس ہونا شروع ہوتا ہے تو اس کے کردار میں زور و زنجی کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے اور ایسے دور میں جہاں سماجی سطح پر رست بازی کا فقدان ہو تو کسی بھی ایسے انسان کا زور و زنجی

ہونا کوئی اجنبی کی بات نہیں ہے جو منہ کی قدر سے مطابقت کرنے سے انکاری ہوتا ہے۔

مبارک صاحب کی طبیعت کی راست بازی نے زور زنجی کو ختم دیا ہے۔ جس سے کبھی کبھی دوستوں کے جلو میں بھی اکیلے ہو جاتے ہیں۔ اُن کی سوانح عمری کا عنوان ”دردِ دھوکہ کھائے“ بھی اسی بات کی غمزدی کرتا ہے اس سے کچھ نقصان بھی ہوتا ہے جو ڈاکٹر صاحب برداشت کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ سچ کل کے دور میں اس قسم کی راست بازی مندرے کا سودا کبھی جاتی ہے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ راست بازی ہونا کوئی منفی کرداری پہلو ہے تو میں اس سے ہرگز اتفاق نہیں کروں گا۔ اس حوالے سے چند تحفظات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کھڑا ہوں۔

ناقواں عہد کی توانا شخصیت — ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر ناز فرشتہ

ڈاکٹر مبارک علی سے میرا اولین تعارف ان کے سہ ماہی رسالہ ”تاریخ“ کے حوالے سے ہوا، یہ کوئی سال 2000-1999ء کی بات ہے۔ تاریخ کا شمارہ پڑھنے سے بعد اس میں دینے کے نئی فون پر میں نے ان سے رابطہ کیا تو جواب میں ایک پڑھے لکھے اور مہذب شخص کا شستہ ہجہ سننے کو ملا، تب سے آج تک میں اپنائیت کے اس لہجے سے بندھا ہوا ہوں، تاریخ کے رسالہ میں غالباً کراچی کے حوالے سے کوئی مضمون تھا، جب میں نے سوچا کہ لاہور کے حوالے سے کچھ ایسا ہی مضمون کہ جس میں شہروں کی توسیع و پھیلنے کے محرکات کو قلم بند کیا گیا ہو، لکھا جاسکتا ہے۔ جب اپنے اس خیال کا ذکر ڈاکٹر مبارک علی سے کیا تو ان کی جانب سے بھرپور تائید و حوصلہ فزائی نے مجھ میں قسم کھانے کا اعتماد پیدا کیا۔ اس سے قبل میری چند کتابیں شاعری اور افسانے کے حوالے سے شائع ہو چکی تھیں اور میں قومی سطح کے علمی و ادبی جریدوں میں گزشتہ کئی برسوں سے چھپ رہا تھا مگر فنِ تعمیر، شہری منصوبہ بندی و ہدایتی و تاریخی تعمیرات کے حوالے سے نہ تو کچھ شوق سے پڑھا تھا اور نہ ہی لکھنے کی جانب دھیان گیا تھا، گویا یہ میرے موضوعات ہی نہ تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے اوپن ہلٹھافد قات لکشن ہاؤس میں ہوئی جہاں وہ اپنی مخصوص نشست اور شفیق مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھے ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے تھے۔ نئی دنوں تاریخ کانفرنس کے انعقاد کا سلسلہ چل رہا تھا، اور اس کے لئے لاہور کو موضوع بنایا گیا تھا، سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے تب تک اندرون لاہور کی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے کچھ نہ پڑھا تھا، اور نہ ہی کوئی زیادہ شناسائی تھی، ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی کانفرنس میں ملحقہ پڑھنے کے لئے مدعو کر دیا، اس دعوت پر پہلی بار سنجیدگی سے میں نے اردو میں تعمیرات کے موضوع پر کچھ لکھنے کے بارے میں سوچا، اس سے قبل معروف نقاد

منظر علی سید مجھے فن تعمیرات کے حوالے سے اردو میں لکھنے پر اس طرح آمادہ کر چکے تھے کہ میں اپنے "سنز آف آرکیٹیکچر" کا تھیسس جو کہ بھری مساجد کے مینار و مینار سے متعلق تھا، روز زبان میں ترجمہ کروں اور اسے شائع کرواؤں۔

میں نے تاریخ کانفرنس میں "بدلتے معاشرتی تناظر میں گھر کی حیثیت" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا جس میں اندرون شہر کے گھروں میں رہنے والوں کے بدلتے معاشرتی رشتوں کے گھروں کی تعمیرات اور نقش جات میں تبدیلیوں پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ دیا۔ گھر کا نقش اندرون اور سے گواہی دیتی، لیکن آباد اور اقبالیوں تک پہنچنے میں جن سیاسی، سماجی اور معاشی عوامل کے باعث تبدیل ہوا، اس کا ایک تجزیہ اس مضمون میں شامل تھا۔ اسی کانفرنس میں کئی برسوں کے بعد میری ملاقات پروفیسر ظفر علی خان اور پروفیسر پرویز وند سے ہوئی۔ پروفیسر ظفر علی خان سے بدلتی تعداد جنم میں ایف ایس سی کے زمانے (81-980) کا تھا جبکہ پروفیسر پرویز وند سے ہمیں تجزیہ نگاری کی بنیاد میں آرکیٹیکچر کے پانچ سالہ تدریس کی کورس میں پاکستانی فن تعمیر کی تاریخ پڑھائی تھی۔ میں تجزیہ کی خوش قسمت ہوں کہ تاریخ تحقیق اور اردو کے حوالے سے میری تحریری و تحقیقی کامن تین قد آور محبت کرنے والی تو نا شخصیات کے جلو میں شروع ہوا۔ تاریخ کانفرنس میں پڑھا جانے والا وہ مضمون میری کتاب "ناہور۔۔۔ گھر گلیں دروازے" کی شاعت کی بنیاد بنا اور اگلے ایک دو سالوں میں شہر قدیم ۱ اور کے حوالے سے لکھے جانے والے مضامین جو تاریخ کے اگلے شماروں میں شائع بھی ہوئے، میری کتاب کی اشاعت کا سبب بنے۔ تاریخ میں میرے شائع ہونے والے دیگر مضامین کا موضوع درگا ہیں، مزارات، وغیرہ جو دراصل میرے ڈکریٹ کرنے کے دور کی جاہلی تحقیق کے دوران وفاقاً تو لکھے جاتے رہے اور جو "جواب میں خلتا کی کچھ" نام کی کتاب میں شائع ہوئے، میں کھلے دے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر مبارک علی کی مقدس شخصیت کے حصار میں نہ آتا تو یہ دونوں کتابیں اور بعد ازاں دیگر کئی تصنیفات میرے لوگ قلم سے تخلیق نہ ہوتیں، یہ بار تاریخ کے رسالہ کی اشاعت کے بعد اگلے رسالہ کے نئے مضمون لکھنے کی تحریک اور ترقیب کا سبب بن کر مبارک علی کا فیضان ہوتا اور ان کا تحقیق انداز کا حکم نہ ہے، جو ان کی خاص پہچان ہے، اور جو لوگ ان کی شخصیت سے واقف ہیں انہیں ان بات کا بخوبی علم ہے کہ اس حکم نہ ہے شہادت کا عنصر حسب نام ہوتا ہے تو یہ سچ کیا رنگ لاتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کی شخصیت و توانائی ہمیشہ سے ہی مجھے ایک فی تحقیقی قوت عطا کرتی رہی ہے۔ وہ

مسلل کانفرنس میں شمولیت اختیار کرتے ہیں، مسلسل لکھتے اور چھپتے رہتے ہیں، عام گفتگو میں بھی غیر متوقع اور نہایت اچھے ہوئے دقیق مسائل سے متعلق سوالات کے جوابات نہایت مدلل اور تاریخی حوالہ جات کے ساتھ پوچھنے والوں کو دیتے ہیں، معصوم ہی نہیں ہوتا کہ ان کی نئی کتاب شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آ جاتی ہے، اس بات سے میں اکثر حیرت زدہ ہو جاتا ہوں، پتی تو نائیاں مجتمع کر کے میں ان کے گھروں کے نشانات کی رہنمائی میں سفر جاری رکھتا ہوں، مگر میری رفتار کے کم ہونے کے سبب ہمارے درمیان یہ فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی کا نقطہ نظر بالکل الگ اور مختلف ہے، وہ سیاسی، سماجی، مذہبی اور جغرافیائی حقائق کو منظر، پس منظر اور پیش منظر میں بہ یک وقت دیکھتے ہیں، ان کی تحریریں پڑھ کے ہمیں آج کل کے حالات و واقعات، عمل و عمل، معاشرہ، حکومتوں کے انداز، سیاسی چال بازیوں اور لوگوں کی زیادہ بہتر سمجھ آنے لگتی ہے۔ وہ اپنی "ساز زبان اور زبان" کے لیے وضع کیے ہوئے اس لیے نہایت ادق اور بچے ہوئے مسائل پر اپنی "ساز زبان اور زبان" سے لکھتے ہیں کہ ہمیں شک آتا ہے، دوچار رہتوں میں نہایت اہم موضوع پر ان کی کتاب کی شاعت ہمارے لئے ایک سنگ میل سے کم نہیں ہوتی، خاص طور پر جب وہ انسانی تاریخ کے ورق لکھتے ہیں تو ہمیں اپنی "ساز زبان" میں سانس لیتا ہوا، تنگ دھڑکتا، اور بہت واضح دکھائی دیتا ہے، ہم ابھی اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں میں الجھے ہوتے ہیں اور ڈاکٹر مبارک علی اپنی تجویزیاتی انداز کی تحریروں کے ذریعے کئی ناگفتہ سواہوں کے جواب بھی ہمیں دے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے جس طرح تاریخی موضوعات اور تناظر کو ہادشاہوں کے فریم سے نکال کر عام آدمی کے چوکھٹے تک لے آئے ہیں، یہ اسی تربیت کا حصہ ہے کہ میرے جیسے لکھنے والوں نے عمارات کا انسانی زندگی سے یک نئے انداز سے رشتہ جوڑا ہے، عمارتوں کے ڈیزائن اور جگہ کی تنوع نے انسانی ضرورتوں، موسمی اثرات، معیشت، سیاست اور معاشرت کے سبب جو رتقاء کی منزلیں طے کی ہیں، ہمیں ڈاکٹر مبارک علی کے انداز نظر سے ان کی بہتر دریا معنی سمجھ آنے لگی ہے۔ میرے جیسے بہت سے لوگ اس بات پر متفق ہیں اور اپنے لئے اس کو باعث عزت سمجھتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر مبارک علی کے عہد میں سانس لے رہے ہیں، اور جن کی عمر بھر کی کوشش و سعی مسلسل نے تاریخ اور معاشرے کو بالکل الگ زاویے سے دیکھنے کا شعور دیا ہے، مگر نہ تو ہم جہات کے اندھروں اور فرسودہ تاریخ نگاری کی روایات میں ہی زندگیاں بسر کر کے چلے جاتے۔

ڈاکٹر مبارک علی تحقیقی دعوے سے عین یک ایسے مرد آہن ہیں جنہوں نے اپنی علمی جنگیں ہی نہیں لڑیں بلکہ ہمارے معاشرے کے کئی ناسور ان کی اصول پرستی سے نکلنے اور پاش پاش ہوئے ہیں مگر زندگی اور تاریخ نگاری کے حوالے سے وہ اپنے نقطہ نظر اور زاویے سے ایک ڈگری بھی نہیں ہٹے، ان کو صدائوں میں سے جالیا گیا، ان پر معاشی تنگ دستی کے گھیرے تنگ کئے گئے، ان کی تخلیقی اور تجزیاتی صلاحیتوں پر ایک حملے کئے گئے، مگر وہ نہایت مضبوطی، استقامت اور یقین کے ساتھ اپنے طے کردہ راستوں اور منزلوں کی جانب رواں رہے، زر پرستی اور مادی خواہشات کے حصول کے لئے دن میں ہزار بار بکنے والے افراد سے بھرے ہوئے اس معاشرے میں ڈاکٹر مبارک علی جیسی صالح اور ثابت قدم شخصیت ہمارے جیسے محدود دامن اور تنگ فو جاواںوں کے لئے ایک میثار نور اور مشعل راہ ہے۔

میں جب بھی دنیا کی بھاگ دوڑ سے تھک جاتا ہوں، کندھے سے کندھا مار کر آگے نکل جانے والوں کی قاری صرب سے اپنا توڑ کھونے لگتا ہوں، عزم، استقامت، زندگی کی امید اور یقین کے لئے ڈاکٹر مبارک علی کی توانا، متوازن اور مضبوط شخصیت کے حصار میں پناہ لیتا ہوں۔ جب بھی ٹیلیفون کر کے میں نے ان سے پوچھا ہے کہ آپ معروف تو نہیں، کیا میں آسکتا ہوں۔ نہایت خندہ پیشانی سے مثبت جواب دیتے ہیں اور میں ان کے گھر کی جانب چل پڑتا ہوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے یہ کہہ ہو کہ میں کام کر رہا ہوں، تھیویر میں فارغ ہوں گا، آج نہیں، کل کسی وقت آنا۔ ان کی طرف سے ملنے والی اس سہولت نے مجھے اپنی نظروں میں ہمیشہ باوقار اور معزز کیا ہے، وگرنہ معاشرے کے لئے میرے جیسے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے ہرگز زیادہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کی شخصیت سے علمی، فکری اور فنی پابندگی کے علاوہ میں جس جماعتی مسرت سے ہم کنار ہوتا ہوں وہ ان کی خوش لباسی ہے، جس قد ران کی شخصیت نفیس، صاف ستھری اور تازہ دم ہے، ویسے ہی لباس کے معاملے میں وہ منفرد نظر آتے ہیں، اس بات کا کریڈٹ مجھے بھی جان کو دینا چاہئے یا نہیں، معلوم نہیں، میں نے کبھی پوچھا نہیں، مگر گھر میں جس سادگی و سہولت کی جھلک مجھے نظر آتی ہے، اس کے لئے یقیناً یہ بھی حسین کی مستحق ہیں، مگر انہوں نے بھی صد و ستاش سے بدتر ہو کر جس طرح ان کو سہارا دے رکھا ہے ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے تشیئے سے دو بیٹیاں علم کی تلاش و زندگی کی دوڑ میں شمولیت کے سبب از کردیا بغیر میں مقیم ہو چکی ہیں مگر ان کی تیسری بیٹی نین تار جو رشت بھی ہے اور ڈاکٹر صاحب کی پرائیویٹ سیکرٹری بھی، ان کے ساتھ ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ وہ بیٹوں کی طرح ڈاکٹر صاحب کی ہمت بندھاتی ہے۔ ان کی

باجبری سے کوئی کتاب تلاش کرنی ہو یا ڈاکٹر صاحب کے دوستوں کی تواضع، ہمہ وقت تیار رہتی ہے، بہت چھوٹی سی عمر میں وہ بااعتماد اور سمجھدار ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب تحقیقی و تخلیقی سفر کا آغاز کیا وہ نائپ مشین اور کتابت کا زمانہ تھا اور آج اکیسویں صدی کے اوّلین نصف میں وہ کمپیوٹر کے عہد میں سانس لے رہے ہیں، انہوں نے بدلتی ہوئی دنیا میں سائنسی ترقی کے ساتھ قدم سے قدم لا کر خود کو چلایا ہے جو صرف تحقیقی صلاحیتوں سے مالا مال موزخ ہی کر سکتا ہے وگرنہ وہ دہائیاں گزرنے کے بعد مورخ خود عہد پرینڈ کا قصہ بن کے رہ جاتا ہے مگر ڈاکٹر مبارک علی کی علمی و فکری صلاحیت نے ان کے وجود کو کل، آج اور کل کے درمیان ایک طویل مضبوط پل کی حیثیت سے زندہ رکھ دیا ہے۔ وہ زمان و مکان کے تناظر میں تاریخ کو محدود کر کے نہیں پرکتے بلکہ اس کا ربط عصر حاضر سے اس طرح بناتے ہیں کہ ماضی عہد حاضر بن کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود وقت، حکومت، معاشرت، معیشت، مذہب اور ثقافت کسی سطح پر بھی بنیادی انسانی فطرت تبدیل نہیں ہوئی۔ وہ دیکھ ہی چاہئے، انسان کی سوچ و شعور بھی اس سے بہت دور ہے مگر ڈاکٹر مبارک علی نے جس تاریخ کی آگہی کا بیڑ اٹھایا ہے، اس نے انسانی سوچ و شعور کی پابندگی کی کئی منز، جو صدیوں پر محیط تھیں، سادوں میں طے کروادی ہیں اب یہ تو اپنی اپنی توفیق ہے، کس کے کشکول میں کتنا آتا ہے۔

یونیورسٹی میں داخلہ ملنے تک کے عرصے میں جب جیکب آباد میں طویل عرصے تک قیام کرنے کا موقع نہ تو اسی دور میں ڈاکٹر منور سے، بھٹی کے توسط سے، باقاعدہ مذاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس وقت جام ساقی سندھی نوجوان کے سپہ ایک ہیرو کی مثال دکھاتا تھا جو کہ اپنے بائیں بازو کے خیالات کے باعث طویل عرصے سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا تھا ڈاکٹر ظاہر ہے بائیں بازو کے زیر اثر طبقاتی جدوجہد کی باتیں کرتے تھے اسی دور میں انہوں نے ڈاکٹر مبارک علی کا ذکر کیا جو کہ ان سے مل چکا تھا اور ان کی کتابیں ساتھ رکھتا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کو ۱۹۸۷ء کے اواخر میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اب ہماری مذاقاتوں کا موضوع ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں ہوتی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء الحق کی فضائی حادثے میں ہلاکت کے بعد ملک میں جمہوری حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی تھکن کے ماحول میں کچھ کمی آئی، تو ہم دونوں نے سوچا کہ ملک میں سننے والی س آراء کی کاغذی داغ دھبہ پانے اور روشن خیالی کے عمل کو آگے بڑھایا جائے۔ اس لیے ہم لوگوں کے لیے سب سے اولین ترجیح ڈاکٹر مبارک علی تھے۔ ہم ملک میں وقت بہت دور میگزین نکال رہے تھے جو کہ سندھی زبان میں تھا۔ ہم لوگوں نے اس کو ترقی پسند تحریروں شائع کرنے کا مقصد بنایا۔ کیونکہ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں بہت دلچسپ اور معصوماتی ہوتی تھیں جو کہ لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی تھیں لیکن چونکہ یہ اردو میں تھیں اس لیے سندھی زبان کا قاری ان سے اس طرح مستفید نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے فیصلہ یہ گیا کہ ان کی تحریروں کو سندھی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اس طرح مبارک علی کو سندھی میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر مبارک علی سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

ہم لوگوں نے جہاں ایک طرف ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں سے تراجم شروع کیے تو دوسری طرف میں نے ڈاکٹر صاحب سے تازہ تحریروں کی بھی درخواست جاری رکھی اور ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ ہماری درخواست پر فورا تحریروں فرمیں کیں۔ اسی دوران وہ ہیر اندر فزیر پوسٹ در دیگر نگرینی کے اخبارات اور رسائل میں ڈاکٹر صاحب کے شائع ہونے والے انٹرویو اور مضامین کو بھی سندھی میں منتقل کرنے کا عمل ہو اور ان مضامین کے سندھی میں شائع ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو سندھی زبان کے قارئین تک پہنچانے کی اولین کاوش ہوئی۔

یونانی تاریخ ہیرودوٹس سے لے کر آج تک تاریخ نویسی کے مختلف نقطہ نظر (school of thoughts) سامنے آتے رہے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ روایت کیا جانے والا نقطہ نظر سیاسی تاریخ کا نظریہ ہے۔ جہاں تاریخ نویسی کا بیشتر کام حکمرانوں کے مفادات کو سامنے

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر راض احمد شیخ

ڈاکٹر مبارک علی سے ہمشافہ مذاقات تو کافی بعد میں ہوئی لیکن ان کے نام و ر کام سے شناسائی ۱۹۸۷ء کے اواخر میں اس وقت ہوئی جب جیکب آباد میں بوئے بھٹی کے دوست جو کہ لیاقت میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کی تعلیم میں مصروف تھے در تعلیمات میں جب بھی حسیب دہاتے تو بڑے بھائی سے ملنے آ جاتے اور کئی گھنٹے گفتگو جاری رتی۔ انھیں پڑھنے لکھنے کا کافی شوق تھا اس لیے اکثر اوقات نئی کتابیں دے رہے تھے۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا دور تھا۔ ایم آر ای کی جمہوری تحریک کے اہل دانش آئے کے بعد ملک میں بونی انگری جمہوریت تو بھٹی کر دی گئی تھی۔ لیکن ایک شریف لیکن کمزور سندھی سیاستدان محمد خان جو بیجو کو وزیراعظم بنایا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ملک میں سیاسی جبر و دہشت گردی میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی تھی۔ جنرل ضیاء اور اس کے فوجی حکمران اسی طرح برقرار تھے۔ سندھ کے تعلیمی ادارے در سندھ یونیورسٹی در لیاقت میڈیکل کالج قوم پرستی در دہشت گردی کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ جنرل ضیاء نے اپنے دور حکومت میں جہاں دیگر نہاد نہاد معاشی ور معاشی تحریکوں کا گڑھ بنے ہوئے تھے۔ جہاں حکومت میں جہاں دیگر نہاد نہاد معاشی ور معاشی صلاحات کو متعارف کر یو ہیں اس نے اس ملک کے ساتھ سب سے بڑا خطرناک کھیل کھیل اور وہ تھا اصلاح کے نام پر اس ملک میں مذہبی انتہا پسندی کو متعارف کروانا۔ فساد جہاں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں مدرسوں کا ایک وسیع جال بچھا گیا۔ ور بعد ان کی مدد سے ملک میں انتہا پسندی کی آماجگاہ بن کر ابھرے۔

صوبہ سندھ تاریخی طور پر مذہبی رواداری اور ایم اے اہلی کی مثالی تصویر رہا ہے چند واقعات کو چھوڑ کر عموماً سندھ میں سیکولر قوم پرست اور رد واری کو قبولیت حاصل رہی ہے۔ ہمیں اپنے بچپن کے دنوں میں بھی یہی ماحول دیکھنے کو ملا۔ ۱۹۸۸ء کے اوائل میں کینڈٹ کالج سے نظر میڈیٹ کا ختام ہو اور

رکھ کر کیا گیا ہے۔ بادشاہوں نے اپنے درباروں میں سرکاری تاریخ نویس مقرر کیے جنہوں نے صرف مراء و بادشاہوں کے نقطہ نظر سے تاریخ لکھی۔ مذہب کے انسانی معشرے میں داخل ہونے کے بعد تاریخ کو مذہبی اثر کے تحت لکھ جانے لگا اور جدید تاریخ میں قوم پرست ریاستوں کے ابھرنے کے بعد تاریخ کو بھی محدود پیمانے پر لکھ جانے لگا۔ لیکن تاریخ نویسی کے عمل میں بڑی اہم تبدیلی اس وقت دیکھنے کو ملی جب ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ منسلک تاریخ دانوں کے ایک گروہ نے ہم خیال تاریخ نویوں کا گروہ بنانے کا اعلان کیا۔ اس گروہ نے تاریخ کے روایتی طریقوں سے ہٹ کر لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ تاریخ نویسی اب تک زیادہ تر امراء اور مرعات یا فتنہ گردوں کا ذکر کرنے تک محدود ہے۔ اس میں عام آدمی بالکل غائب ہے۔ اس سے ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کو نئے انداز اور اسلوب سے لکھا جائے اور تاریخ کا محور عام آدمی ہو۔ عام آدمی کا طریقہ رائج کن ہو، اس کی متاقت اور اس کا دکھ درد ہو، معشرے میں اس کی خدمات اور اس کے کردار کا ذکر ہو۔ ان کے استحصال و ران کی اس انتہائی نظام کے خلاف بغاوتوں کا ذکر ہو۔ معشرے کے طبقاتی کردار اور طبقاتی بنیادوں پر ابھر کر سامنے آنے والے سماجی نظام اور سماجی ڈھانچے کا ذکر ہو۔

اس نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس برطانیہ کمیونسٹ تاریخ دانوں نے تاریخ لکھنے کا ایک نیا اور منفرد نقطہ نظر پیش کیا، اور اس کو نام دیا گیا "History from below" یعنی تاریخ زیریں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ کو عام آدمی کے نقطہ نظر سے لکھ جائے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے آنے کے بعد اس میں آنے والی تبدیلی کے نتیجے میں جو نیا سماجی ڈھانچہ ابھر کر سامنے آیا ہے اس کو بھی تحقیق کا موضوع بنایا جائے کیونکہ سرمایہ دارانہ نے پہلے سے موجود جاگیردارانہ طرز کے استحصال کو مزید زیادہ انتہائی بنا دیا ہے۔ اس گروہ میں نمایاں کردار سٹو فرل اور ای پی تھا سنر شامل تھے۔ تھا سنر نے اپنی معرکہ آراء کتاب "The making of working class" لکھی۔ اس گروہ کے ایک اور رکن سی۔ ایل۔ آر جیمز جو کہ اپنی سوچ میں مارکسٹ تھے لیکن وہ اشالن کی پالیسیوں کے مخالف تھے انہوں نے اپنی کتاب "The black jacobins" لکھی جو کہ ۱۹۳۸ء میں سامنے آئی۔ ناول کی طرز پر تحریر کی جانے والی کتاب بڑی مقبول عام ہوئی۔

ڈاکٹر مبارک علی نے ایک مارکسٹ تاریخ داں اور دانشور ہونے کے باعث اسی گروہ سے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خواص پر تنقید کی اور عام آدمی کو تاریخ سے غائب رکھے جانے کے باعث اپنی تحریروں کا محور عام فحش کو بنایا۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ عام آدمی ہی ہے جو تاریخ کو بناتا ہے۔

معشرے میں نظر آنے والی قوم ترقی عام آدمی کی مرہون منت ہی ہے۔ تمام کامیابیاں تو عام آدمی کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں اور کامیابیوں کے اختتام پر اسی عام آدمی کو ہی فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کے بیشتر کتابوں کے موضوعات وہ کردار ہیں جو کہ ہمارے معشروں میں اکثر دھتکارے جانے والے کردار سمجھے جاتے ہیں۔ جو بے وقعت تھا اور ان کی حیثیت چانور سے بھی بدتر ہیں۔ لیکن ڈاکٹر مبارک علی سمجھتے ہیں کہ وہی تو اصل معشرہ ہے مزدور، کسان، محنت کش، توین، غلام ن کے ہیرو ہیں۔ بادشاہ، مذہبی علماء، سپہ سالار، جاگیردار، سرمد داران کے نزدیک وہ کردار ہیں جو کن کے استحصال و معشرے کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا باعث ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مارکسٹ تاریخ داں بریک ہاوس بام کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈکویٹ و ٹھٹھوں کی تاریخ بھی لکھی۔ یہ بتایا کہ یقیناً معشرے میں ایسے کرداروں کو تجارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ورنہ انہیں ظالم تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ بہت سچی طریقہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان حقیقی وجوہات کا جائزہ لیا جائے تو کسی بھی انسان کو معشرہ سے ہٹ کر ڈاکو اور چور بننے پر مجبور کرتا ہے۔ معشرے کے مفاد پرست و امراء کس طرح بعض اوقات اپنے مخالفین کو مختلف نقاب لے کر ان کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں اور پھر ان کے یہی خیالات معشرے میں قابل قبول بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی چھ سات درجن سے زائد کتابیں اتنے زیادہ موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں کہ لگتا ہے تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ رہ گیا ہے جس پر انہوں نے اظہار خیال نہ کیا ہو۔ انہوں نے بچوں کے لیے، خواتین کے لیے، مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے لیے غرض ہر ایک کے لیے لکھا ہے۔ انہوں نے مذہبی پیشواؤں اور نام نہاد علماءوں کے طریقہ واردت کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اپنی کتابیں تحریر کی ہیں۔ بلکہ انہوں نے کئی کتابیں اور مضامین ترجمہ بھی کیے ہیں جن میں برصغیر کی تحریروں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے پہلے سے شائع شدہ مودنی تاریخی اہمیت کو سمجھتے ہوئے انہیں لکھ کر کے شائع کروایا جن میں لطف اللہ کی آپ جی جیسی کتابیں بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے جہاں مختلف موضوعات پر کتب تحریر کی ہیں وہیں انہوں نے کتابوں کے ساتھ ساتھ اخبار اور جرنامہ میں بھی بڑی باقاعدگی کے ساتھ لکھ اور اب تک لکھتے آرہے ہیں۔ روزنامہ ڈان، پاکستان ٹوڈے، بدلتی دنیا جیسے اخبارات اور جرنامہ میں ان کے مضامین عام و خاص سب کے لیے یکساں دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ انہوں نے ڈان میں خصوصی طور پر بچوں کے لیے تاریخ کو بڑے سہل انداز میں لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کو بڑی خوبی سے منزل تک پہنچایا ایک طرف جہاں ہمارے درسی

نظم کو نام نہاد و تنگ نظر مذہبی اور قومی سوچ (ideology) میں مقید کر کے اس کا ذرہ بڑھو کر دیا گیا ہے جس کے باعث معروضیت (objectivity) اس سے بالکل ہی غائب ہو گئی تو دوسری طرف اپنے مخالفین کے لیے تعصب اور نفرت پر مبنی خیالات کو اس قدر بھردیا گیا ہے کہ ہماری ٹیلی ویژن کے ڈھنوں میں سوائے نفرت اور تعصب کے اور کوئی بات سامنے نہیں آ رہی۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں عدم برداشت اور انتہا پسندی کے رجحانات کو بڑھا دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان رجحانات کو ختم کر کے ان کی جگہ روشن خیالی اور حقیقت پسندی کو آگے لانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتابوں اور تحریروں سے دہم و توہمات (myths) کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ صدیوں سے جن کو لوگوں نے اپنا ہیرو و درمسیح بنا کر پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریروں میں انہیں عوام دشمن ثابت کیا۔ فاتحین ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اکثر غاصبین ہیں اور وہ بھی ایسے غاصب کہ جنہوں نے نہ صرف قبضے کیے بلکہ قتل و غارت گری بھی کی اور لوٹ مار بھی۔ عصمت دری بھی کی اور مقبوضہ علاقوں کی تہذیب و ثقافت کو بھی تباہ و برباد کرنے کے ذمہ دار بھی ٹھہرے۔ وہ بغیر کسی تفریق کیے اپنی تحریروں میں سچ لکھنے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب، نسل، زبان کی تفریق کیے بنا مظلوم مظلوم ہے اور ظالم ظالم ہے ان کی تحریروں میں ان کی ذات و شخصیت کی طرح کسی قسم کی سودے بازی اور Compromise نہیں ہے۔ جس بات کو تاریخی حقیقت (Historical fact) کی بنیاد پر درست پاتے ہیں۔ اسے اسی طرح بیان کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے صرف اپنی بات کو قاری تک پہنچانے کی ذمہ داری نہیں نبھائی بلکہ انہوں نے کوشش کی کہ حقیقی ماحول کی عوامی تحریروں کو اپنے قارئین تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر لی اور اسے بڑے احسن طریقے سے نبھایا۔ ان میں کئی نام ہمارے سامنے ہیں مثلاً عرفان حبیب، رومیہ تھیرید، غیرہ شامل ہیں جن کی تحریروں اور کتابوں کو ترجمہ کر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فکشن ہاؤس کے ذریعے شائع کروایا۔ یہ عوام ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کو عیاں کرتے ہیں کہ وہ حقیقی ظالم کو عالم سمجھتے ہیں اور اسے وہ مقام دینے کے قائل ہیں جو کہ اس کا حقیقی درجہ ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام جس سے ڈاکٹر مبارک علی بہت متاثر رہے اور جن کی تحریروں کو ترجمہ کر کر اردو زبان کے قارئین تک پہنچانے کے عمل کو کامیاب بنایا وہ "دکھی" ہر عمر انیات پر فیسر حمزہ صہلی ہیں۔ حمزہ صہلی صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دیا و غیر میں برطانیہ اور کینیڈا کی کئی ممتاز یونیورسٹیوں میں پڑھاتے گزر دیا۔ انہوں نے بے تحاشہ تحقیقی کام کیا لیکن بد قسمتی سے اس کا کام انگریزی میں تھا اور نکھرا ہوا تھا۔ اس لیے پاکستانی قارئین

کی وہ توجہ حاصل نہ کر سکا جس کا کہ وہ عقد رہا کیونکہ انہوں نے زیادہ تر تحقیقی کام تحریک پاکستان، ہندوستان کے مسلمان معاشرہ، تقسیم ہند، مذہبی انتہا پسندی، تخلیق پاکستان اور پاکستان کے سول اور فوجی پر کیا تھا۔ اس لیے یہ تہیائی ضروری تھا کہ ایسے حقیقی تحقیقی کام کو روڈ میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے حمزہ صہلی سے اپنی دیرینہ دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ان کی تحریروں کو اردو میں شائع کروایا۔ حمزہ صاحب کے مضامین پر مشتمل کتابیں "جاگیر داری و سامراج"، "پاکستان ریاست اور اس کا بحران" کے نام سے شائع کروائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش رہی کہ ان کے مزید مضامین کا بھی ترجمہ ہو اور یہ شائع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں اب یہ ذمہ داری انہوں نے مجھے سونپی اور نہ صرف یہ ذمہ داری سونپی بلکہ ہم جیسے پورا درانی دلوں کو ہر وقت یا دوہائی بھی کراتے رہے کہ یہ کام صد زبردست مکمل کیا جائے۔ اس کا ایک سال و قافلہ عمل طریقہ بھی تھی کہ جو یہ کیا جس کے تحت میری ذمہ داری یہ ٹھہری کہ حمزہ صہلی کا ایک مضمون ڈاکٹر صاحب سے سہ ماہی تحقیقی جرنل "تاریخ" کے لیے مہیا کروں۔ کوشش کر کے جب ہم نے یہ ذمہ داری نبھائی اور مضمون کثیر مقدمہ میں لکھا ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی تک یہ خوش خبری سنائی کہ انہوں نے فکشن ہاؤس کے ذریعے ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کر لیا ہے۔ ہم جیسے نوجوانوں کے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز کی بات دیر یا ہوسکتی تھی کہ حمزہ صہلی کے تراجم کیے جائیں اور انہیں ڈاکٹر مبارک علی جیسے عوامی دانشور کی سرپرستی میں شاعت کا اہتمام کیا جائے۔ مزید سزا یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کی ترتیب اور تمام مراحل اپنی زیر نگرانی طے کرائے اور سب سے بڑی بات یہ کہ کتاب کا سرورق خود بنی خوش پر اپنی بیٹی نین تارا جو کہ آرٹ سے نہ صرف شغف رکھتی ہے بلکہ اجتماعی سے کام بھی کرتی ہے۔ اس سے اس کا سرورق بھی ہوا۔ نین تارا ہی سچ کل ڈاکٹر صاحب کی شائع ہونے والی کتابوں کے بڑے دانش سرورق بن رہی ہے اور کیوں نہ بنائے بالآخر عظیم باپ کی بیٹی جو ہر سے گھر میں وہ ماحول اور تربیت ملی جو کہ بہت سے لوگوں کو نصیب نہ ہو سکے اور ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم نے پوری طرح حق تربیت بھی ادا کیا۔ میری یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے تعاون و رکن کی کاوشوں سے "تخلیق پاکستان" سماجی و تاریخی مباحث" کے نام سے ۲۰۱۲ء میں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریروں سے تاریخ جیسے مضمون کو جسے عمومی طور پر ایک خشک اور بوریت کا مضمون سمجھا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو عوامی دلچسپی کا مضمون بنا دیا۔ اب یہ مضامین اور ڈاکٹر صاحب کی تحریروں عوام سے عوامی زبان میں بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کے لیے ایک مزید ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائی، اور اسے اب

تک بڑی خوبی سے نبھاتے چلے آ رہے ہیں اور وہ ہے سالانہ "تاریخ کانفرنس"۔ ڈاکٹر صاحب بڑی کامیابی سے گزشتہ برسوں سے اس کامیاب انعقاد کرتے آ رہے ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ بغیر کسی مالی مدد اور کسی خاص معاونت کے نہ ہونے کے باوجود اس سلسلے میں کسی ایک سال بھی ٹوٹی تھل نہیں آیا۔ میرے لیے یہ بڑی اعزاز کی بات تھی جبہ ۲۰۱۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کی کانفرنس کو ہمارے ادارے szabist میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بار کانفرنس کا موضوع تھا "تاریخ اور جنگ" جبکہ اس سے قبل کئی ہم موضوعات مثلاً "تاریخ اور عوامی تحریکیں"، "پارٹیشن اور تاریخ"، "تاریخ و عورت" اور دیگر کئی موضوعات پر یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ ان کانفرنسوں میں پڑھے جانے والے تحقیقی مقالوں کا معیار انتہائی بلند رہا ہے۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد نے اس سلسلے کی کانفرنسوں کو بڑے ذہن طریقے سے منعقد کروانے میں بڑی تگ و دو کی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تاریخ کانفرنس اب ایک اہم علمی رویت بن گئی ہے جو کہ کبھی، پور، کراچی اور دیگر شہروں میں منعقد ہوتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک مزید کاوش سماجی تحقیقی جرنل "تاریخ" کا جرمہ ہے۔ اب تک اس جرنل کے 47 شمارے شائع ہو چکے ہیں اور ہر شمارہ ایک اعلیٰ تحقیق کا شہکار ہے۔ اس شمارے میں جہاں ایک طرف سالانہ تاریخ میں پڑھے جانے والے مضامین شائع ہوتے ہیں تو دوسری طرف اس میں اعلیٰ پائے کے تحقیقی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ کئی شمارے خصوصی نمبر کے طور پر شائع ہوئے ان جرنل میں کئی نامور دانشوروں کے مضامین کو ترجمہ کر کے شائع بھی کرایا گیا۔ اس جرنل کی شاعت بذات خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور ایسے حالات میں جہاں اس ملک میں لکھنے والوں کی قلت ہو اور جتنے لکھنے والے باقی ہیں وہ بھی اپنی دیگر مصروفیات میں الجھے ہوئے ہوں تو ایسے حالات میں مضامین تحریر کروانا اور پھر انہیں شائع کروانا ایک جوئے شیر نہانے کے مترادف ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تمام مشکلات اور مصائب کے باوجود بالکل نہیں گھبرائے اور ہمت نہیں ہارے اور اس جرنل کو باقاعدگی سے شائع کر داتے رہے اور یہ جرنل ایک مقبول تحقیقی جرنل کے طور پر سامنے آ گیا ہے۔ اس نے اپنی مستند علمی حیثیت سوانہ ہے۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کی ذات سے ہی ممکن ہوا کہ یہ کام آگے بڑھایا جاسکے۔ تحقیقی جرنل ہمارے ملک کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور ادارے شائع نہیں کر سکتے لیکن ڈاکٹر صاحب کی نے جو کہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں انہوں نے اپنی انفرادی حیثیت میں اس جرنل کو ایک معیاری تحقیقی جرنل بنا ڈالا ہے اور دیگر کئی لوگوں کے لیے ایک مثال قائم کر دی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو گزشتہ دو دہائیوں سے بینائی کا مسئلہ درپیش رہا لیکن اس تکلیف کے باوجود انہوں

نے اپنے علمی کام کو نہ رکھنے دیا۔ ان کے حوصلے خفا نہ ہوئے ان کی ہمت نہ ٹوٹی بلکہ انہوں نے اپنے مسئلے مسائل کا حل نکال ہی لیا ہے اور اس کا علمی کام آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنا کام جاری رکھنے میں ان کے خاندان اور خصوصاً ان کی بیگم ذبیہ وراں کی چھوٹی بیٹی نین تارا کا بھرپور ساتھ رہا۔ ہمیں ان دونوں افراد کو بھی کھل کر ریٹ دینا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک عرصے تک جس طرح کورٹ پکھری کو بھگت کرنا کر دیا تھا ان کی سہرا کائی، دو گوں سے جس طرح بددیوانہ ان کوئی معاملات میں لٹھیا جس کا ان سے دور دور تک واسطہ نہیں تھا لیکن ہم نے دیکھ کر کہ جی مالا خرقہ تھا ورڈ کٹر صاحب ہمہ تر پریشانیوں کے باوجود ان تمام معاملات سے سرخرا ہو کر نکلے ہمارے جیسا کوئی کم حوصلہ مند ان حالات کا شکار ہوتا تو وہ فوراً اپنی ہمت ہار چکا ہوتا لیکن یہ ڈاکٹر صاحب جیسا ہی مرد تھا کہ جنہوں نے تمام تر مصائب کے باوجود اپنا علمی کام جاری رکھا۔ آج کے اس دور میں ڈاکٹر صاحب کی جیسا علمی دانشور یقیناً ہم جیسے لوگوں کے لیے ذخائر اور امید کی ایک کرن ہے۔ ہماری اے ورڈ فائل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مزید لکھیں اور بہت لکھیں اور اس ملک کے لوگوں میں روشن خیالی اور بیداری شعور کی جو مصیبت انہوں نے اٹھارہ رکھی ہے اس کو مزید مضبوطی سے تھامے رکھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری نسل ور دانشوروں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ن کی ان علمی کاوشوں کا بھرپور ساتھ دیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کا مشن آگے بڑھ سکے۔ مجھے یہ بات کہنے دیجیے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں اور بڑی بد قسمت ہے وہ قوم اور گروہ جو ڈاکٹر صاحب کی جیسے عوامی دانشور کے حقیقی مقام کو نہ سمجھ سکے۔ حکومتی سطح پر آج تک ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا کوئی اعتراف نہیں اور انہیں اس کا گلہ بھی نہیں کیونکہ ایک ایسے ملک میں جہاں بیشتر اوقات فوجی حکومتیں نافذ رہی ہیں اور جہاں جمہوریت اور جمہوری اقتدار کا فقدان رہا ہو وہاں ڈاکٹر صاحب کی روشن خیالی اور خرد افروزی پر مشتمل تحریروں کو کوں برداشت کرنے کو تیار ہوگا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے بقول چاہے ہم قدر میں کتنے کم ہی کیوں نہ ہوں چاہے حالات کتنے نامساعد ہی کیوں نہ ہوں سماجی کاوشیں جاری رکھیں گے چاہے وہ میں کتنی رکاوٹیں ہی کیوں نہ آئیں ہم اپنے مشن کو آگے ہی بڑھا دیں گے، ہم لڑیں گے اور جدوجہد کرتے رہیں گے عوام کے حق حکمرانی کے لیے، مفقود قوموں اور گروہوں کے حقوق کے لیے، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف، ظلم اور استحصال کے خلاف، سماجی ناہمواری کے خلاف۔ کیونکہ بنا جدوجہد ہم اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا حوصلہ اور ہمت ہے جس نے ہم جیسے کارکنوں میں جدوجہد کرنے کی قدیل جلا دی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

انور کمال

ڈاکٹر مبارک علی خان سے تعارف کیسے ہوا، ملاقات کیوں اور کہاں ہوئی یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب بذاتہ خود دلچسپ ہے۔

تعارف ہوا جب ڈاکٹر مبارک علی حیدر آباد میں مقیم تھے اور لاہور میں ان کے چند ہاتھ سے تحریر شدہ کتب پہنچے پڑھنے کو ملے۔ اس کے بعد ایک قدرے ضخیم، غالباً 120 صفحات پر مشتمل کتاب بعنوان "برصغیر پاک و ہند میں مسلمان معاشرے کا لبہ" پڑھنے کو ملی۔ مہذبہ سوچ سے بہت کچھ نئی کو ایک نئے زاویے سے دیکھا، پرکھا۔ پریشانی کے عالم میں اپنے دوست انگریزی کے استاد یس یلم رضی عابدی سے پاک گیا ورنہ سے معاملے پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی۔ آپسی بحث و مباحثہ کے بعد ملے پایا کہ رضی اور میں حیدر آباد جا کر ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقات کریں۔

چنانچہ رضی اور میں ریل سے ڈاکٹر مبارک علی کے گھر حیدر آباد میں جا پہنچے۔ تعارف کروایا اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ گفتگو کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے ہم دونوں مسافروں کو کھانا بھی کھلایا اور رات ہو جانے پر اپنی بیٹھک میں دوستر بھی عنایت فرما دیے۔ مہمان نوازی سے اندازہ ہوا کہ بھائی ڈاکٹر مبارک علی کی ہر طرح سے شریک حیات اور معاون ہیں۔

صبح ناشتہ کے بعد آگاہی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر رضی اور میں بس سے لاہور واپس آ گئے۔ اس بتدائی ملاقات کے بعد ڈاکٹر مبارک علی سے باقاعدہ رابطہ رہا اور جب ریٹائرمنٹ کے وقت ڈاکٹر مبارک علی دوستوں کے اصرار پر کراچی جانا چاہتے تھے تو رضی اور میں انہیں لاہور کھینچنے لگے۔ بالآخر ہم کامیاب ہوئے اور ڈاکٹر مبارک علی ہمراہ اہل وعیال لاہور میں آ گئے۔ تعلیم و تدریس کے اس شہر نے ڈاکٹر مبارک علی کو اپنی غوش میں پناہ و گرجہ ڈاکٹر مبارک علی کبھی بھی کراچی واپس کی باتوں میں نہ کرے یہ کہتے کہ انہیں کراچی جانا چاہئے تھا، رہے وہ لاہور میں ہی۔

ڈاکٹر مبارک علی ایک نامور مورخ ہیں، کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا اپنا منفرد مقام ہے۔ میری تعلیم لاہور شہر کے انگریزی ڈیڑھ تعلیم اور پھر گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی میں ہوئی۔ پنجابی ادب سے ماہر، اردو میں اظہار کزور اور انگریزی دل دیا کمانے والی۔ سکول میں تاریخ قصہ کہانیوں کے طور پر اور وہ بھی ہادش ہوں کی شان و شوکت کے قصیدے، داخلی و خارجی جنگوں اور شہزادے شہزادیوں کے عشق اور شادی بیاہ کی دست نوں کے طور پر پڑھائی گئی۔

ڈاکٹر مبارک علی نے اس تعلیمی پس منظر کے نوجوان کو آنکھیں دیں۔ میرا تاریخ پڑھنے اور سمجھنے کا زاویہ بدل گیا۔ یہ کیا؟ سکندر اعظم اور اکبر اعظم کے دور میں ان کی رعایا بھی تھی، عام لوگ بھی بستے تھے، ختن کی دست اس سے پہلے ڈاکٹر کی سچائی نہ تھا۔ یہاں اس کی تاریخ و عوں کے حوالے سے دیکھنے سے داغ روشن ہو۔ ہمیں پید ہوئی۔ انسانی سماج کے رشتہ کی جدیدی و مادی بنیادوں کا پتہ چلا۔ برصغیر پاک و ہند میں برطانوی ستھاری دور کیا تھا، کیوں تھا، لہذا اور اس سے بھی بدتر لہذا وہ ڈاکٹر کیسے تفکیریں پایا، کچھ کچھ سمجھ میں نہ لگا۔

عالمی جنگ عظیم اول و دوم، آج کا امریکہ، آج کے عالمی اقتصادی ادواروں و سرمایہ داری نظام کے خلاف جدوجہد کی ضرورت اور تاریخی پس منظر کا شعور ملے۔ ڈاکٹر مبارک علی جن عام لوگوں کے حوالے سے تاریخ لکھتے ہیں، اس کو ان کی زبان میں لکھتے ہیں۔ طرزِ تحریر سادہ اور سمجھ میں آنے والا ہے۔ جو قدرتی کام لگتی ہیں، ان میں موصوفات ایسے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے اپنی دنیا پر مسلط کرتے سمجھ سکتے ہیں یا نہ ہو رہے ہے۔ حکمران طبقات کن مشاغل میں مصروف ہیں۔ نظام فرسودہ، جو پیسے تھا، سوا ب بھی ہے۔ عوام بد حال، جو پہلے تھے، سوا ب بھی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی سے تعارف لے پنے سماج کو، اپنی دنیا کو، پنے گرد و نواح کو سمجھنے میں ایک ایسے شخص کی مدد کی جو استعمار، استبداد، استحصاء، سرمایہ جبر، اندامہ ذلت جیسے الفاظ و زمانے تاریخی معنوں سے روشناس ہی نہ تھا۔ جس کی سوز سادہ باقاعدہ تعلیم نے اسے اندھا بہرہ رکھا تھا۔

اس سے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو جاننے کا بھی موقع ملتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو ایک دیو ماری دنیا میں پاتے ہیں۔ نہ انہیں اپنے سماج سے، نہ اپنی حقیقی دنیا سے روشناس کرواتے ہیں۔ نہ بچوں کو اس ادب کی طرف لے کر جاتے ہیں جس سے بچوں میں سماجی و سیاسی شعور پیدا ہو سکے جو آگے چل کر پروان چڑھ سکے اور نئی نسل میں تنقیدی صلاحیتیں پیدا کر سکے۔

ڈاکٹر مبارک علی جیسے سائنہ کرم کی اپنے معاشرے کو نیکی دین ہے کہ وہ ان عام لوگوں کو پرانی کی چشمہ دیتے ہیں جو ان کی جانب توجہ کرتے ہیں۔ میں ایسے تمام سائنہ کرام کو تسلیم پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر مبارک

رضی عابدی

ڈاکٹر مبارک علی، ایک منفرد نام، ایک منفرد کام۔ 1986ء میں، پور فورم نے، جس کے صدر پروفیسر اشفاق علی خان اور سیکرٹری پروفیسر منظور احمد، تاریخ پر ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ تنظیمین نے اس سلسلے میں بہت دماغ دوڑائے۔ لیکن لاتعداد کالجوں اور جامعات کی موجودگی کے باوجود کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آیا۔ کوئی یہ شخص نظر نہیں آیا جو تاریخ کے کسی موضوع پر درسی سبق سے بہت کر کوئی بات کر سکے۔ اس وقت تک کسی نے ڈاکٹر صاحب کا نام نہیں سنا تھا۔ پہلی مرتبہ، پور ڈاکٹر مبارک علی کے نام سے وقف ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے لئے ایک بڑی خوش آئند دریافت تھے اور ہمارے لئے یہ دریافت انور کمال صاحب کی تھی۔

تاریخ کو عموماً محض ایک مضمون سمجھا جاتا تھا۔ جس کا بظاہر عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے 947ء میں میٹرک کا امتحان دی بورڈ سے دیا تھا۔ وہاں تاریخ اور جغرافیہ لازمی مضامین تھے۔ علم عام طور پر یہ کہتے تھے کہ تاریخ جغرافیہ ہے، وقاشم و گھونو، صفا۔ تاریخ کو محض تاریخوں در سالوں کا گورکھ دھندا سمجھا جاتا تھا۔ جو کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا زبردست کام یہ ہے کہ انہوں نے لو جو انوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا کی اور اسے ایک ہامعنی مطالعہ بنا دیا۔

ڈاکٹر مبارک علی پر ایک اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ پر کوئی بڑا کام نہیں کیا اور چھوٹے چھوٹے تعارفی مقالے لکھے۔ بات یہ ہے کہ تاریخ ڈاکٹر مبارک علی کے لئے کوئی نصابی مضمون نہیں بلکہ سوچ کا ایک انداز ہے۔ وہ چاہتے تو بڑے بڑے ضخیم تحقیقی مقالے بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نام و رسم کے لئے نہیں لکھتے۔ وہ ایک درویش صفت علم دوست سکار ہیں اور تاریخ سے انہیں عشق ہے جسے وہ ساری دنیا کا محبوب بنانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تاریخ ماضی کی بھولی، سری کہانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ہمارا حال ہے۔ یہ وقت کا ایک آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنی بنی گزرتی سنواری شکلیں نظر آتی ہیں۔ اس میں ہمیں اپنے خدو خال نظر آتے ہیں۔ اپنی خویاں اور خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ہم چاہیں تو اسے اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کی تصویر سمجھیں۔ یہ آج کو دور سے دیکھنے کا طریقہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو کتابوں سے نکال کر ایک زندہ حقیقت بنا دی ہے۔ ایک ایسی تصویر جس میں تذکرہ تو دوسروں کا ہوتا ہے لیکن تصویر اپنی ہی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو اب ایک مخصوصا ہمارے وجود پر محض ایک درسی کاش نہیں سمجھتے بلکہ اس میں انہیں ایک حقیقت نظر آتی ہے۔

حقیقت یقیناً ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن کسی موضوع پر تحقیق سے پہلے اس میں دلچسپی کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سائنس میں کاش کی ہو کر رہ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو دلچسپ بنا دیا ہے اور اسے رنگا رنگ سے نکال کر عام زندگی کا جزو بنا دیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اب زندگیوں میں چاری، ورساری ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ تاریخ کے موضوع پر جلسے نہیں کئے جاتے تھے۔ یہ عام دلچسپی کا موضوع نہیں تھا۔ لیکن آج تاریخی مجلسوں میں بھی لوگ خصوصاً نوجوان بے شوق سے آتے ہیں جیسے کبھی مشاعروں میں آتے تھے، اور یہ سب ڈاکٹر صاحب کی محنت اور ان کی تاریخ سے وابہانہ لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ اور پنجاب کے دور دراز علاقوں میں، یہاں تک ہندوستان کے طول و عرض میں بھی لوگ ڈاکٹر صاحب کی آمد کے منتظر رہتے ہیں اور بڑے شوق اور اشتہاک سے ان کی باتیں سنتے ہیں۔

اس تمام گفتگو سے یہ مطلب نہیں بیٹا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب صرف لوگوں کی تفریح و تہلک کے لئے تاریخی موضوعات پر دلچسپ و دعوام پسند مضامین لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں علمی گہرائی اور تحقیقی باریکی بنی ہے۔ انہوں نے بہت سے تاریخی مفاصلوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً

”اس ضمن میں سب سے اہم عنصر نظریہ پاکستان کا ہے کہ جو پاکستان بننے

کے بعد وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ 1970ء کی دہائی میں اس کی تبلیغ شروع

ہوئی۔ چونکہ پاکستان کی جدوجہد میں سیاست و مذہب دونوں کا دخل تھا اس

لئے نظریہ پاکستان کی تعمیر میں دونوں عناصر کو شامل کر کے اس کا جواز بنایا

گیا اور تاریخ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔“

(تاریخ اور نصابی کتب)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران نہ تو مسلم لیگ کے عمائدین کے ذہن

ورنہ ان کے مخالفین کے ذہن میں کوئی تذبذب تھا۔ مسلم لیگ پاکستان مسلمانوں کے لئے حاصل کرنا چاہتی تھی نہ کہ اسلام کے لئے۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے پاکستان کے علاوہ کسی بھی منصوبہ کو قبول کرنے کے لئے تیار تھی۔ اسی لئے تمام مذہبی جماعتوں اور تقریباً سب ہی مذہبی علماء نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کوئی مذہبی تحریک نہیں تھی بلکہ ایک سیکور تحریک تھی۔ مسلمان صرف ایک مذہبی جماعت نہیں تھے بلکہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت بھی تھے۔ پاکستان کا مطالبہ مذہبی نہیں بلکہ ایک سیاسی مطالبہ تھا۔ تاریخ کا مطالعہ ایسی کچھنوں کو سمجھانے میں بہت مدد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں،

”جب کبھی معاشرے میں انتشار ہوتا ہے اور وہ کھڑے کھڑے ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت گرتاریخ کی مدد لی جائے تو وہ اس زوال کے عمل کو روک سکتی ہے اور معاشرے کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان ثقافتی و سماجی روابط کو تلاش کر کے انہیں یک جہتی کے مواقع فراہم کر سکتی ہے۔“

(تاریخ کی روشنی)

اس طرح تاریخ کو قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تاریخ کی صحیح تدوین بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ”تاریخ کو کیسے پڑھانا چاہئے کہ یہ ہماری نسل سے نفرت اور تنگ نظری کو ختم کر کے ان میں وسیع النظری اور قوت برداشت پیدا کرے؟ کیونکہ اس وقت تاریخ کو جس انداز میں پڑھا جا رہا ہے وہ انتہائی فرسودہ طریقہ ہے جس نے ہماری نسل کو جاہل اور تنگ نظر بنا رکھا ہے۔“

(تاریخ اور آگہی)

آج ہماری سیاست اور ثقافت کا یہ سب سے اہم مسئلہ ہے اور ہر طرف اس بات پر گرم بحثیں ہو رہی ہیں کہ ہماری قوم میں قوت برداشت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ بات بات پر لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات یہاں تک کہ بچوں کی لڑائی پر بھی گولیاں چلتی ہیں اور جانیں جاتی ہیں۔ علاقائی، فرقہ وارانہ اور یہاں تک کہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ بھی تشدد آمیز رویے عام نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کے ذریعہ ان تضادات کو معقولیت کی حد تک رکھنے کا راستہ دکھایا ہے۔ یہ ان کا جہاں ہے جو وہ بلا خوف و خطر اور بد کسی ذاتی مفاد کے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی س کوشش نے بہت سے لوگوں میں صحیح کہنے کی ہمت پیدا کی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی ایک تابندہ ستارہ

سرور عظیم قندمیو

معاشرے یقیناً انسانی رویوں سے عبارت ہوتے ہیں۔ انسانوں کے شعور اور اخلاقیات کا مجموعی مظہر معاشرے کی اجتماعی سوچ ہوتی ہے۔ بد قسمت معاشرے کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں سمجھ، فہم، دانش، برداشت، ایمان داری اور دوراندیشی جیسے جو ہر منافقت، مکاری، طاقت کی بے جا نمائش اور کج فہمی کی غذر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اسے پرکھا جائے تو ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ کسی طرح بھی خوش قسمت کہلانے کا سزاوار نہیں۔ اس رویے کا ایک عکس ہمارے ہیروز کے چناؤ میں نظر بھی آتا ہے۔ ہم میں سے، اکثریت کے ہیروز وہ لوگ ہیں جو عقلی شعور کی بجائے جسمانی صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور ہیں اور اگر ایک دو لوگ لکھنے پڑھنے والے ہوں تو ان میں سے بھی اس فہرست میں شامل ہیں تو انہیں ہم نے مختلف وجوہات کی وجہ سے جن میں جذباتیت سب سے اہم وجہ ہے ایک ایسے سنگھاسن پر بیٹھا ہوا ہے جہاں بیٹھو وہ ہر قسم کی تنقید و تحریف سے ماوراء ہیں۔ ان کے کام کو عقلی دیکھ کر پرکھنا کفر ٹھہرتا ہے۔ لہذا ایسے حالات میں جس قسم کے معاشرتی رجحان ہو سکتے ہیں اور جتنے خطرناک ہو سکتے ہیں ہمارے معاشرہ اس کی نین مثال ہے۔

لیکن وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے بعد کے چھیانوہ ساڑھے تین لاکھ وائس اور علم و فن کے میدان میں ہم دنیا میں آخری سرے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ معدودے دو چار لوگ ہوں گے جنہوں نے اس میدان میں بین الاقوامی سطح پر چنانام بنایا اور انہوں نے انہیں صاحب فن تسلیم کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہے تو کیا ہماری دھرتی بھر ہو چکی ہے جو علم و دانش اور فکر و فلسفہ کے میدان میں کوئی نیا شگوفہ کھدائے سے قاصر ہے۔ جواب یقیناً نفی میں آئے گا۔ ہمیں دنیا کی ذہین اقوام میں شمار کیا جاتا ہے۔ دھرتی تو اپنے سینے سے متنوع قسم کے پھولوں کی افزائش میں مصروف ہے۔ یہ تو ہمارا المیہ ہے کہ جس پھول کی خوشبو ساری دنیا کے لئے ہوتی ہے اسے ہم اپنے گاؤں، شہروں تک بھی پہنچنے سے روکتے ہیں۔ ہمارے اس

ڈاکٹر مبارک

رضی عابدی

ڈاکٹر مبارک علی، ایک منفرد نام، ایک منفرد کام۔ 1986ء میں لاہور فورم نے، جس کے صدر پروفیسر اشفاق علی خاں، وزیر بکر، بٹری پر فیئر منفلور احمد، تاریخ پر ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ منتظمین نے اس سلسلے میں بہت دماغ دوڑائے۔ لیکن راتعداد کالجوں اور جامعات کی موجودگی کے باوجود کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آیا۔ کوئی یہ شخص نظر نہیں آیا جو تاریخ کے کسی موضوع پر درسی سبق سے ہٹ کر کوئی بات کر سکے۔ اس وقت تک کسی نے ڈاکٹر صاحب کا نام نہیں سنا تھا۔ پہلی مرتبہ، ہورڈ کنز مبارک علی کے نام سے واقف ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۰ء سے سنی ایک بڑی خوش قسمت دریافت تھے اور ۱۹۷۰ء سے لے کر یہ دریافت انور کمال صاحب کی تھی۔

تاریخ کو عموماً محض ایک مضمون سمجھا جاتا تھا۔ جس کا اظہار عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے 1947ء میں میٹرک کا امتحان دلی بورڈ سے دیا تھا۔ وہاں تاریخ اور جغرافیہ، زمینی مضامین تھے۔ طلباء عام طور پر یہ کہتے سنا دیتے تھے کہ تاریخ جغریہ ہے، وہاں شام کو غولوں، صبح صفا۔ تاریخ کو محض تاریخوں اور سالوں کا گورکھ دھندا سمجھا جاتا تھا۔ جو کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا ربر دست کام یہ ہے کہ انہوں نے لو جو انہوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا کی اور اسے ایک با معنی مطالعہ بنا دیا۔

ڈاکٹر مبارک علی پر ایک اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ پر کوئی بڑا کام نہیں کیا، درجہ چھوٹے تنہا رہے لکھے۔ بات یہ ہے کہ تاریخ ڈاکٹر مبارک علی کے لئے کوئی صوابی مضمون نہیں بلکہ سوچ کا ایک مدار ہے۔ وہ چاہتے تو بڑے بڑے ضخیم تحقیقی مقالے بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نام و نمو کے لئے نہیں لکھتے۔ وہ ایک درویش صفت علم دوست سکالر ہیں اور تاریخ سے کہیں عشق ہے جسے وہ ساری دنیا کا محبوب بنانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تاریخ ماضی کی بھولی ہسری کہانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ۱۱۰۰ سال کا حال ہے۔ یہ وقت کا ایک آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنی مٹی بگڑتی سنواری شکلیں نظر آتی ہیں۔ اس میں ہمیں اپنے خدو خال نظر آتے ہیں۔ اپنی خوبیاں اور خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ہم یہاں تو اسے اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کی تصویر سمجھیں۔ یہ آج کو دور سے دیکھنے کا طریقہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو کتابوں سے نکال کر ایک زندہ جلتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے۔ ایک ایسی تصویر جس میں تہ کرہ تو دوسروں کا ہوتا ہے لیکن تصویر اپنی ہی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو اب لوگ خصوصاً ۱۱۰۰ سالہ نوجوان محض ایک درسی کاوش نہیں سمجھتے بلکہ اس میں انہیں ایک چلتی پھرتی زندہ حقیقت نظر آتی ہے۔ تحقیق یقیناً ایک ہم ضرورت ہے۔ لیکن کسی موضوع پر تحقیق سے پہلے اس میں دلچسپی کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سارا ٹیٹل میکاگی ہو کر رہ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو دلچسپ بنا دیا ہے اور اسے درگاہوں سے نکال کر عام زندگی کا جزو بنادیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے دب زند گیوں میں جاری اور ساری ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ تاریخ کے موضوع پر جیسے نہیں کئے جاتے تھے۔ یہ عام دلچسپی کا موضوع نہیں تھا۔ لیکن آج تاریخی محسوس میں بھی لوگ خصوصاً نوجوان یہ شوق سے آتے ہیں جیسے کبھی مٹ عروس میں آتے تھے، اور یہ سب ڈاکٹر صاحب کی محنت اور ان کی تاریخ سے وابہ نہ لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ اور پنجاب کے دور دراز علاقوں میں، یہاں تک ہندوستان کے طول و عرض میں بھی لوگ ڈاکٹر صاحب کی آمد کے منتظر رہتے ہیں اور بڑے شوق اور شہادگ سے ان کی باتیں سنتے ہیں۔

اس تمام گفتگو سے یہ مطلب نہیں بیٹا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب صرف لوگوں کی تفریح طبع کے لئے تاریخی موضوعات پر دلچسپ اور عام پسند مضامین لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں علمی گہرائی اور تحقیقی باریک بینی ہے۔ انہوں نے بہت سے تاریخی معالفتوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً

”اس ضمن میں سب سے اہم عنصر نظریہ پاکستان کا ہے کہ جو پاکستان بننے کے بعد وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ 1970ء کی دہائی میں اس کی تبلیغ شروع ہوئی۔ چونکہ پاکستان کی جدوجہد میں سیاست و مذہب دونوں کا دخل تھا اس لئے نظریہ پاکستان کی تعمیر میں دونوں عناصر کو شامل کر کے اس کا جواز بنایا گیا اور تاریخ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔“

(تاریخ، درنصابی کتب)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران نہ تو مسلم لیگ کے حامدین کے ذہن

دورنہ کے مخالفین کے، اہم میں کوئی تذبذب تھا۔ مسلم لیگ پاکستان مسلمانوں کے لئے حاصل کرنا چاہتی تھی نہ کہ اسلام کے لئے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے پاکستان کے علاوہ کسی بھی منصوبہ کو قبول کرنے کے لئے تیار تھی۔ سی نے تمام مذہبی جماعتوں اور تقریباً سب ہی مذہبی گروہوں کو پاکستان کی حقیت کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کوئی مذہبی تحریک نہیں تھی بلکہ ایک سیکولر تحریک تھی۔ مسلمانوں کو صرف ایک مذہبی جمعیت نہیں تھی بلکہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی قوت بھی تھے۔ پاکستان کا مطالبہ مذہبی نہیں بلکہ ایک سیاسی مطالبہ تھا۔ تاریخ کا مطالعہ کسی انجمنوں کو سمجھنے میں بہت مدد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

”جب کبھی معاشرے میں انتشار رہتا ہے اور وہ کلڑے کلڑے ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت اگر تاریخ کی مدد لی جائے تو وہ اس زوال کے عمل کو روک سکتی ہے اور معاشرے کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان ثقافتی اور سماجی روابط کو تلاش کر کے انہیں یک جہتی کے موقع فراہم کر سکتی ہے۔“

(تاریخ کی روشنی)

اس طرح تاریخ کو قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تاریخ کی صحیح تدریس بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ”تاریخ کو کیسے پڑھانا چاہئے کہ یہ ہماری نسل سے نفرت اور تنگ نظری کو ختم کر کے ان میں وسیع النظری اور قوت برداشت پیدا کرے؟ کیونکہ اس وقت تاریخ کو جس انداز میں پڑھایا جا رہا ہے وہ انتہائی فرسودہ طریقہ ہے جس نے ہماری نسل کو جاہل اور تنگ نظر بنا رکھا ہے۔“

(تاریخ اور آگہی)

آج ہماری سیاست اور ثقافت کا یہ سب سے اہم مسئلہ ہے اور ہر طرف اس بات پر گرم بحثیں ہو رہی ہیں کہ ہماری قوم میں قوت برداشت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ بات بات پر لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات یہاں تک کہ بچوں کی لڑائی پر بھی گویاں چلتی ہیں اور جاں جاتی ہیں۔ عدالتی، فرقہ وارانہ اور یہاں تک کہ سیاسی مخالفین کے ساتھ بھی تشدد میز رویہ عام نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کے ذریعہ تنقیدات کو معقولیت کی حد تک رکھنے کا راستہ دکھایا ہے۔ یہ ان کا جہاد ہے جو وہ بد خوف و خطر اور بلا کسی ذاتی مفاد کے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی اس کوشش نے بہت سے لوگوں میں بچا کہنے کی اہمیت پیدا کی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی ایک تابندہ ستارہ

سرदार عظیم اللہ میو

معاشرے یقیناً انسانی رویوں سے عبارت ہوتے ہیں۔ انسانوں کے شعور اور اخلاقیات کا مجموعی مظہر معاشرے کی جماعتی سوچ ہوتی ہے۔ بدقسمت معاشرے کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں سمجھ، فہم، دانش، برداشت، یگانہ روی و دور اندیشی جیسے جوہر منافقت، مکاری، طاقت کی بے جا نمائش و رنج بھی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس پیمانے پر پرکھا جائے تو ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ کسی طرح بھی خوش قسمت ہونے کا سزاوار نہیں۔ اس رویے کا ایک ٹکس ہمارے ہی دور کے چناؤ میں نظر بھی آتا ہے۔ ہم میں سے اکثریت کے ہیر وزوہ لوگ ہیں جو عقلی شعور کی بجائے حسنی صد جیتوں کی وجہ سے مشہور ہیں اور اگر ایک دو لوگ لکھنے پڑھنے والوں میں سے بھی اس فہرست میں شامل ہیں تو انہیں ہم نے مختلف وجوہات کی وجہ سے جن میں جذباتیت سب سے اہم وجہ ہے ایک ایسے سکھان پر بٹھایا ہوا ہے جہاں بیٹھے وہ ہر قسم کی تنقید و تحریف سے ماوراء ہیں۔ ان کے کام کو عقلی دلیل پر پرکھنا ٹھہرتا ہے۔ لہذا ایسے حالات میں جس قسم کے معاشرتی رجحان ہو سکتے ہیں اور جتنے خطرناک ہو سکتے ہیں ہمارے معاشرہ اس کی تین مثال ہے۔

پہلی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے بعد کے چھیا سٹھ سالوں میں فکر و دانش اور علم و فن کے میدان میں ہم دنیا میں آخری سرے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ محدودے دوچار لوگ اوس گے جنہوں نے اس میدان میں بین الاقوامی سطح پر پنا نام بنایا اور دنیا سے کہیں صاحب فن تسلیم کیا ہے۔ سوال یہ ہے اگر ایسا ہے تو کیا ہماری دھرتی بھر ہو چکی ہے جو علم و دانش و فکر و فلسفہ کے میدان میں کوئی نیا شہنشاہ کھلانے سے قاصر ہے۔ جو ب یقیناً نفی میں آئے گا۔ ہمیں دنیا کی ذہین قوم میں شمار کیا جاتا ہے۔ دھرتی تو اپنے سینے سے متنوع قسم کے پھولوں کی افزائش میں مصروف ہے۔ یہ تو ہمارا المیہ ہے کہ جس پھول کی خوشبو ساری دنیا کے لئے ہوتی ہے اسے ہم اپنے گاؤں، شہروں تک بھی پہنچنے سے روکتے ہیں۔ ہمارے اس

روپے کی وجہ سے کتنے ہی درخشاں ستارے وقت سے پہلے اپنی تابناکی کھو بیٹھے یا کسی اور آسمان کی تلاش میں اس مدار سے ہی نکل گئے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا آسمان ابھی تک ایسے کچھ ستاروں سے محروم ہے جنہوں نے باوجود نامساعد حالات کے نالودار بدلا اور نہ ہی اپنی تابناکی کو ماند پڑنے دیا بلکہ ہر نیا دن ان کے علم و فن کی روشنی میں اضافے کا پیغام لئے آتا ہے۔ یہی ایک روشن ستارہ ڈاکٹر مبارک علی خان ہیں جو برس ہا برس سے خود اپنے اور اپنے وطن کے ساتھ کئے عہد کو نبھ رہے ہیں اور وہ عہد ہے سچ لکھنے کا، سچ کہنے کا، جبر کے آگے نہ جھکنے کا اور لوگوں تک علم و دانش کا سچ پھیلانے کا۔ بطور مفکر و مورخ ان کی پنے فن اور فکر سے کمینٹ مثالی ہے۔ جھوٹی کہانیوں کا گورکھ دھندہ کھلانے والی فن تاریخ، ماڈرن ازم اور کولونیل ازم سے ہوتا ہوا پوسٹ کولونیل ازم، سب آلٹرن تاریخ نویسی پوسٹ ماڈرن ازم اور اورینٹل ازم تک جا پہنچا ہے جبکہ ہمارے اکثریتی لکھنے والے ابھی تک مذہب اور نسل کے تعصبات سے ہی نہیں نکل سکے۔

فن تاریخ کی اس ترقی میں ہمارا کیا حصہ ہے یہ ایک الگ لمحہ فکریہ ہے۔ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زبان میں اپنے لوگوں تک تاریخ کا سچ ان صدوں سے وائٹنر تک پہنچے فلسفہ تاریخ کی روشنی میں لکھنے کی جرأت و جسارت کی ہے؟ صرف ایک ڈاکٹر مبارک علی۔ کیا یہ ایک فرض کفایہ تھا جو اکیلے ڈاکٹر مبارک علی کے کام سے ادا ہو جائے گا؟

میری ڈاکٹر صاحب سے پہلی ملاقات 2008ء کے اواخر میں محترم شہب الدین میو صاحب کی وساطت سے ہوئی اس وقت تک میں نے ڈاکٹر صاحب کو بہت کم پڑھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے سفر نامے پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ بعد ازاں ایک دو جگہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو سنا تو سوچا ڈاکٹر صاحب کی کتابیں بھی پڑھنا چاہئیں اور پھر پڑھنا ہی چاہ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو وہ ناولوں کی طرح کی روایتی تاریخ لکھتے ہیں اور نہ ہی شخصیات کو دیو مال کی ہیر دہنا کر پیش کرتے ہیں بلکہ یہ تو اکثر فلسفیانہ تحریریں ہوتی ہیں جن میں تاریخی واقعات کو حوالہ کے طور پر دیا جاتا ہے مگر یہ ان کے فن کی سچائی ہے کہ ایک عالم ان تحریروں کے بحر میں مبتلا ہے جو عام طور پر خشک تھوڑی جاتی ہیں۔ تاریخی حقائق کو بغیر کسی لگی لٹی کے بیان کر دینا ان کا خاصہ ہے اور اسی جرأت اظہار نے انہیں ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھانے کی ترغیب دی ہے جن پر رائے دینا ہمارے یہاں قائل گرفت سمجھا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر سچے انسان کی طرح انہوں نے بھی آدرشوں پر چلنے کی قیمت چکانی ہے۔ پیچھے دنوں ہماری ادبی

تخظیم ”میواتی دنیا“ کی طرف سے معقد کی گئی ایک تقریب میں ڈاکٹر صاحب مہمان خاص تھے۔ وہاں انہوں نے زور دے کر یہ بات کہی کہ ”اشرافیہ کے ہارے میں لکھنے والوں کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جن کے پاس فخر کے نئے نام و نسب کا کوئی رشتہ موجود نہیں اور مخصوص طبقات یا کتبہ قبیلوں کی بڑائی بیان کرنے سے پہلے یہ صبر و سوجنا ہوگا کہ ہمیں یہ تحریر کسی دوسرے کے لئے آزار کا باعث تو نہیں۔“

اپنی آپ بیتی ”میری دنیا“ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ ”میں نے اخلاقی قدروں کو پامال ہوتے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ایمانداری اور دیانت کس طرح سے پشیمانی کا باعث بن جاتی ہیں اور کس طرح ایک حساس شخص کے لئے جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے اُس وقت جب مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہو تو لبرل خیال رکھنے والا ہے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ ریاست اور حکومت سے تو لڑ سکتے ہیں لیکن اگر معاشرہ اس کا شکار ہو تو ان سے لڑنا ان کے درمیان زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ سبھی باتیں میرے سامنے ہیں کہ سیاست کس طرح سے دوست کرنے کا ذریعہ بنی اور یہ بھی کہ طبقہ اعلیٰ کے لوگ قانون سے باز تر ہو گئے۔ اگرچہ ہمارا بادشاہ نے کہا ہے کہ ”ہر پرہیزگار کو ش کے عالم دوبارہ نیست“ یہ ہمارے لئے تو ٹھیک تھا کہ وہ حکمران تھا اس کے پاس عیش و عشرت کے درائع تھے مگر لوگوں کے لئے یہ کس قدر اذیت ناک ہے جو چاہتے ہیں کہ دنیا بار بار نہیں آئے گی اور وہ مایوسیوں اور محرومیوں کے عام میں اس جہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو جہاں بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہیں پاکستان میں بھی اس کو نہایت سنجیدگی سے پڑھا گیا ہے اور حقائق کو بغیر جاہداری کی کسوٹی پر پرکھنے کی تحریک میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سوچئے دیکھئے اور علم سے محبت کرنے والے طبقے کی اکثریت کو انہوں نے اپنے خیالات اور فکر سے متاثر کیا ہے اور وہ وقت بہت قریب ہے جب یہی علم دوست تعصبات سے ماوراء گروہ انتہا پسندی کے اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوگا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو قلم کے ساتھ کتیس (31) برس مکمل ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اپنی تحریروں کے ذریعے انسان دوستی، سچے تعصبی اور غیر جانبداری کی تحریک کو فکری قیادت مہیا کرتے رہیں گے۔

ایک تاریخ داں، ایک انسان

رفاقت علی انصاری

میں ایک کاروباری آدمی ہوں اور میرے لئے کتابیں پڑھنے کے لئے وقت نکالنا مشکل کام ہے۔ گوکہ میں زمانہ طالب علمی سے ہی ادب خصوصاً شاعری پڑھنے کا شوقین رہا ہوں۔ میں نے تقریباً سارے مشہور شاعروں کی شاعری پڑھ رکھی ہے۔ نثر کا آغاز میں نے اسی زمانے میں کر لیا تھا جس کی کتاب ”جنگ آمد“ سے کیا۔ اس کے بعد میں مزید تعلیم اور پھر ملازمت میں مصروف ہو گیا تو کتابوں سے کافی دور رہا۔ جب میں لاہور میں واپس آیا اور اپنا کاروبار شروع کیا تو میرے پاس کچھ فارغ وقت ملنے لگا۔ میرا کتابوں کی طرف آنے کا موجب دو شے بن گئیں۔ مجھے شکر گزار ہونا چاہئے موجودہ حکومت کا۔ انہوں نے کوئی اچھا کام تو میرے لئے کیا۔

مجھے یاد ہے جب ایک دن میں بہاولپور میں سہ پہر کے وقت اپنے ہوٹل میں تھا تو بجلی چلی گئی اور مجھے ہوس ناخوشہ کمرے سے باہر نکلنا پڑا۔ میں قریب ہی پارک میں چلا گیا جہاں پر کتابوں کا ایک شان بگا ہوا تھا۔ مجھے اتفاقاً ڈاکٹر صاحب علی کی کچھ کتابیں مل گئیں۔ اس سے پہلے میں ان کی دو ایک کتابیں ”تاریخ اور آگہی“ وغیرہ، زمانہ طالب علمی میں پڑھ چکا تھا۔

’ان میں میری دلچسپی کی وجہ ان کا تنازعہ ہونا تھا۔ اس وجہ سے میرے دل میں ان کی کتابیں پڑھنے کی جستجو پیدا ہوئی۔ اب چونکہ میں Mature ہو چکا تھا تو ان کی کتابیں میرے دل پر اثر کرنے لگیں۔ پھر لاہور میں نہیں نے، وراء بکس سے ان کی مزید کتابیں خریدیں۔ جب ان کے پاس موجود ڈاکٹر صاحب کی سب کتابیں میں نے پڑھ لیں تو ان کے سلاہین سے پوچھا کہ کوئی اور کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ اب مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ”گلشن ہاؤس“ پر رہتے آتے ہیں اور مزید کتابیں وہاں سے ملیں گی۔ پس میں

ایک دن گلشن ہاؤس پہنچ گیا اور جناب ظہور صاحب سے ملاقات ہوئی اور اپنے ”سے کا مدعا بیان کیا اور کچھ کتابیں وہاں سے خریدیں۔

لہذا گلے ہی ہفتے میری پہلی ملاقات ڈاکٹر صاحب علی صاحب سے ہو گئی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک وہ اس کے کافی دیر بعد تک، میں صرف ڈاکٹر صاحب علی کی کتابیں پڑھتا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو میں اپنے کاروبار میں بہت مصروف رہتا تھا لہذا میرے لئے کتابیں پڑھنے کے لئے وقت نکالنا مشکل تھا۔ پس میں صرف جب سفر پر جاتا تھا تو بس یا ہوٹل میں اور ریل گاڑی یا بس کے انتظار میں پڑھتا تھا۔ ایک تو اس سے سفر کا ہانا نہیں چلتا تھا اور پتہ علم بھی حاصل ہوتا تھا۔

ب کچھ ڈاکٹر صاحب کے متعلق بیان کروں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ایک بلند پایہ تاریخ داں اور محقق ہیں اور آپ کی کتابوں نے لاکھوں لوگوں کی سوچوں کو بدلا ہے۔ میں نے ان کی زندگی اور کتابوں میں ایک زخم ہونے والی مقصدیت پائی ہے جب بھی وہ کتاب لکھتے ہیں تو یہ مقصدیت ہر جگہ کارفرما ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی دونوں حیات زندگی کی کتابوں کو قلم بند کرتے وقت یہ کارفرما تھی۔ میں نے ان سے اس سے متعلق کہا کہ آپ نے اپنی خودنوشت ”میری دنیا“ جو بعد میں آئی جو آپ نے اپنی بیاری بیٹی کے کہنے پر لکھی۔ اس کو بھی اپنے ہی صوں پر لکھا، اور بہت سے دوستوں کا شکوہ ہوا کہ آپ نے ان کا ذکر کھل کر نہیں کیا۔ میں نے اس کتاب سے زیادہ مواد زیر سطر کیا۔ جو میں عموماً آپ کی دوسری کتابوں سے کیا کرتا تھا۔

یہ آپ کی ہی کتابوں کی بدولت مجھے زندگی کے بہت سے مسائل کو بہتر طریقے سے سمجھنے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے میری سوچ بھی ویسی ہی تھی، جیسے اور طالب علموں کی پاکستان میں ہوتی ہے۔

اب کچھ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے متعلق۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میں نے بہت کم کتابیں پڑھی ہیں اور جو پڑھی ہیں ان سے مجھے فائدہ حاصل نہیں ہوا، جتن میں نے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کو پڑھ کے حاصل کیا۔

ایک تو انہوں نے غیر دلچسپ Subject تاریخ (History) کو دلچسپ بنایا اور دوسرا میں مختلف قسم کے عنوانات کو شامل کر کے اس کے دائرے کو وسعت دی۔ اب قاری کو اس مضمون میں گھسے پئے عنوان چٹائیں، بادشہوں کے نام اور ان کی تاریخیں جو کہ یاد کرنا بہت مشکل تھا۔ اس سے ہر نکال کر اس کے کیوں کو وسیع کر دیا۔ اب آپ اس میں مختلف عنوان جیسا کہ ”نسوز کی تاریخ“ ناموں کی تاریخ بھگتوں، کسوں، عورتوں، بھاء، دستور، مزدور ور ب تو کائنات کی تاریخ بھی پڑھ سکتے ہیں۔

نیچے والی سطروں میں ان دو چیزوں کے متعلق لکھوں گا، جنہوں نے مجھے متاثر کیا، جس کی وجہ سے میں ڈاکٹر صاحب کا Fan ہے۔

یہ کوئی 90ء کے عشرے کی بات ہے۔ جب میں M.Sc مکمل کرنے کے بعد مختلف اخبارات کو روزانہ پڑھتا تھا۔ جس میں Daily Dawn بھی تھا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کا کالم ہر اتوار کو آتا ہے۔ ان میں سے ایک کام مغل دور میں عورتوں کے لقب اور ناموں کے متعلق تھا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ مغل بادشاہوں نے کس طرح گھریلو اور بازاری عورتوں کے نام رکھ رکھے تھے۔ انہوں نے گھریلو عورتوں کے نام مثلاً نور محل، نور جہاں، زیب النساء، مہر النساء، جہاں آراء وغیرہ رکھے تھے اور بازاری عورتوں کے شعلہ بدن، گل نار وغیرہ تھے۔ یعنی انہوں نے گھریلو عورتوں کے نام پاکیزہ رکھے اور بازاری عورتوں کے بدھکیے، بازاری تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک کتاب سے میں نے پڑھا، اس کتاب کا نام مجھے یاد نہیں، کیونکہ یہ کتاب میں نے کافی دیر پہلے پڑھی تھی۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ ابتدائی زمانے میں جب انسان جنگل میں رہتا تھا اور اس کا گزر بہرہ صرف شکار پر ہوتا تھا۔ اس وقت وہ ہر جانور کو اپنا دشمن خیال کرتا تھا۔ لیکن غائب کسی اتفاق سے انسان کی پہلی انسیت ”کتنے“ سے ہو گئی۔ جس نے اپنی موجودگی میں غار اور آگ کے علاوہ ایک زیادہ محفوظ رات گزارنے کا موقع فراہم کیا۔ اس سے آگے چل کر انسان نے اور بہت سے دوسرے جانوروں کو سندھیا اور انہیں اپنے استعمال میں لے آیا۔ جس سے انسان نے تہذیبی طور پر بہت ترقی کی۔ جن جانوروں کو انسان نے اس زمانے میں پالتو بنا کر اپنے استعمال میں لیا، وہ تھے بھینس، گائے، بیل، گدھا، بھیڑ، بکری، اونٹ اور گھوڑا۔ لیکن انسان نے اپنے اس محسنوں کی عزت نہ کی اور انہیں زمانے میں یک گالی بنا دیا۔ جیسا کہ بھینس کے آگے بین بجا ناگائے، بیل اور گدھے کو حق قرار دیا۔ بھیڑ اور بکری بردن کی عداوت ظہری۔ اونٹ رے و نت تیری کون سی کل سیزھی اور ”کتنے“ کو تو، بیٹیاں میں سب سے بڑی گان بنا دیا گیا۔

لیکن اس کے برخلاف جن جانوروں نے انسان کی اداعت میں آنے سے انکار کر دیا انہیں ہم نے عقلم بنا دیا۔ جیسا کہ شیر، چیتا اور سانپ۔ ہم بڑے فخر سے اپنے ناموں کے ساتھ ان کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم یہ سوچتے نہیں کہ انہوں نے انسانیت کی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا اور ان کا نقصان پہنچایا، ورنہ بھی تک پہنچا رہے ہیں۔

اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جو ہم نے جناب ڈاکٹر صاحب کی کتابوں سے سیکھیں۔

آپ کا مقصد حیات یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو سچی بات نہایت آسان زبان میں پہنچائی جائے اور اس میں کسی قسم کی غیر ضروری لفظی، منظر کشی، مبالغہ سبزی ور ہے جا کر کو ختم کیا جائے۔ مجھے ان کی کتابیں پڑھ کر ایسی عادت بن گئی کہ میرے لئے کوئی اور دوسرے لکھاریوں کی کتابیں پڑھنا مشکل ہو گیا۔ اس بات کی شکایت میں نے ڈاکٹر صاحب سے کی ورنہ مسکرائے۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ان دنوں مجھے قاضی جاوید صاحب کی کتاب ”لوگوں کو سوچنے دو“ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے قاضی صاحب سے شکایت کی کہ ایک تو اس میں فلسفہ کی Terms کا اردو میں ہونا اور دوسرا آپ نے غیر ضروری مشکل لفظ کے انتخاب سے اس کو بوجھل بنا دیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ کتاب آپ جیسے لوگوں کے لئے نہیں لکھی گئی۔ جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تو مجھے پتا چلا کہ یہ کتاب ہمارے جیسے لوگوں کے لئے ہی لکھی گئی تھی۔ جیسے کہ اس کا عنوان ہے ”لوگوں کو سوچنے دو“۔ اور اس میں خاص بات نہیں تھی۔ جو خاص لوگ (Intellectuals) اسے پڑھتے، کیونکہ ان کو یہ سب معلوم تھا۔ میں نے اپنے مطالعہ سے یہ بھی نوٹ کیا کہ بہت سے مشہور لکھاری یہاں کے ہوں یا باہر کے آسان زبان استعمال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب وقت کے بہت پابند ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں اکثر ان کی ڈانٹ سنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ سچ بولتے ہیں اور سچ ہی لکھتے ہیں۔ چاہے اس کی انہیں کتنی ہی قیمت کیوں ناچکانی پڑے۔ اس سلسلے میں نہیں بہت ساری نوکریاں چھوڑنی پڑیں۔

برداشت اور قوت ارادی ان میں بہت زیادہ ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم سب نیرنگ گیلری میں بیٹھے گرمی میں بجلی والوں کو کوس رہے ہوتے ہیں وہ بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہمارے پرچنے پر وہ صرف اتنا کہتے ہیں ”بس اب عادت ہو گئی ہے۔“

ایک حساس انسان ہیں اور جب بھی میں انہیں نیرنگ گیلری سے واپس گھر چھوڑنے جاتا ہوں تو وہ اکثر موجودہ ملکی حالات کے متعلق متفکر ہوتے ہیں۔

غرض کہ جیسی ان کی تحریریں ہیں۔ ویسا ہی ان کا جیکر ہے۔ ایک چیز جو ان میں بہت زیادہ ہے۔ دوسری کا احسان نہیں لیتے۔ یعنی کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے۔

ہم چند دوست (قاضی جاوید، اسم گور اسپوری، سلمان عابد، زمان خان، لیاقت علی، شہزاد احمد، شہزاد ایدہ وکیٹ وغیرہ) باقاعدگی سے نیرنگ گیلری میں ڈاکٹر صاحب کی معیت میں بیٹھتے ہیں یہاں ہمارا اکثر عموماً گفتگو سیاست ہوتا ہے۔ لیکن جب کبھی کوئی علمی و ادبی بات ہوتی ہے تو ہم خوب

ڈاکٹر صاحب کی ذہانت و تحقیق سے مستفید ہوتے ہیں۔ مجھے جو چیز ان کی بہت زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کی غیر معمولی یادداشت۔ انہیں تمام واقعات، ان کی تاریخیں، نام، اور پوری تفصیل زبانی یاد ہوتی ہیں، اور پوری تفصیل سے انہیں بیان فرماتے ہیں۔

اس کے علاوہ جب کبھی ہم ان سے کوئی سوال کے متعلق پوچھیں تو وہ ہماری پوری رہنمائی فرماتے ہیں۔ وہ نہایت ہی فلسفہ ور شفیق ہیں، ملتے میں دو یا تین دن بعد ان کا فون ہماری خیریت کے متعلق آتا ہے۔ غرض کہ ان میں وہ تمام خوبیاں اور خصوصیات ہیں جو ایک غیر معمولی انسان میں ہو سکتی ہیں۔ آخر میں یہاں برٹرنڈ رسل کا یہ مقولہ نکھوں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ "شاعر، ادیب اور فلسفی ایسے لوگ ہیں جن کو ان کی زندگی میں کوئی نہیں پوچھتا، ان کی وفات کے بعد لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔"

میری تمام ہوگوں سے پہلے سے کہ یہ بڑے قیمتی لوگ ہیں۔ بڑے کرم فائدہ عظیم اور قبول کے علاوہ دوسرے دانشوروں اور صاحب کمال لوگوں کی بھی عزت کریں۔ جنہوں نے اپنی ہماری زندگی سچی کو پھیلانے میں صرف کردی ہے اور ابھی مصروف ہیں۔

دعا ہے کہ خدا انہیں اسی طرح مصروف کار رکھے۔ آمین!

ڈاکٹر مبارک علی

زمانہ خان

انہیں نے کہا تھا۔

خیاب خاطر احباب چاہتے ہر دم
انہیں ٹھیک نہ لگ چائے آگینوں کو

ڈاکٹر مبارک علی جیسے حساس، نازک مزاج، مہذب مگر انتھک اور چٹان سے زیادہ مضبوط ارادے والے شخص کے بارے میں کچھ لکھنا ورنہ بھی بہت ہی قلیل وقت میں بہت ہی بڑے خطر اور جان جو کھوں کا کام ہے، عموماً پورا کر آپ کسی کی تعریف کریں تو آپ صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ خوش ہو گا مگر یہ کیسی کی کارگر ورنہ زودہ، آسمان نسد ڈاکٹر مبارک علی پر کارآمد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خود بلند پایہ کے بڑے عزم و مورخ ہیں ورنہ انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کب کوئی چھوڑا کام کر رہا ہے در تعریف کر کے نہ صرف اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرتا ہے بلکہ جس کی تعریف کی جائے اس کا مرتبہ بھی گھٹاتا ہے۔ سو ڈاکٹر مبارک کے بارے میں قلم اٹھانا دراصل ہلے صراط پر گزرنے کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے سب درس جدت و عرف ہوا ب صحیح طور پر یاد نہیں (مگر مجھ سے پہلے سب گلی میں میرے افسانے لکھے ان کے نام و رکام سے متعارف تھا) ڈاکٹر صاحب غالباً ہر دور میں گوئے انٹینیوٹ کے ڈائریکٹر تھے ورنہ کوئی پیکر سننے دہاں گیا تھا وہاں ہی ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف مورخ مرحوم کے کے عزیز سے کرایا تھا جو کے کے عزیز دور کی نیگم زریں سے عمر بھر کی دوستی میں بدل گیا پوچھیں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے صوبوں کی بنیاد پر گوئے انٹینیوٹ سے استعفی دے دیا (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا پہلا اور آخری استعفی نہیں تھا بلکہ جب بھی انہیں یہ موقع ملا انہوں نے کلمہ حق کہنے

سے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی خواہ اس کے سنے انہیں کتنی بھی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے، درگھر کے حالات خواہ کچھ ہوں۔ یہ سلسلہ غالباً سندھ یونیورسٹی سے شروع ہوا تھا۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا تو ڈاکٹر صاحب کی سوانح عمری کے دونوں وائیم (دراشکو کرکھائے اور میری دیا) پڑھیں اور خود ہی نتیجہ نکال لیں، اور دیکھیں کہ ڈاکٹر صاحب کے کن نامہ معاملات کا مقابلہ کیا ور یہ مقام حاصل کیا۔

بہر حال مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ وہ میری دعوت پر راکپور (جسے آجکل فیصل آباد کہا جاتا ہے) تشریف لائے، لیکچر دیا۔ جماعت اسلامی کے ایک ممبر نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب سے ایسا سول کیا جائے جس کا جواب شاید ڈاکٹر صاحب نہ دے سکیں یا سرعام دینا پسند نہ کریں مگر ڈاکٹر صاحب سونی پر بھی کلمہ حق کہنے والے ہیں (ایک ہی جماعت حس نے تخلیق پاکستان کی محاشفت کی ہو اور اب اپنے آپ کو پاکستان کا حقیقی اور سچا وارث سمجھتی ہے)۔ ڈاکٹر صاحب نے بلا لگی لپٹی فوراً جواب دیا کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں (مسلم لیگ) کا درست فیصلہ نہ تھا، اور سب کو حیران کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے دورہ فیصل آباد سے مجھے پہلی دفعہ یہ معلوم ہو کر ان کا واحد ذریعہ آمدن لکھنا پڑھنا اور لیکچر دینا ہے۔ جب میں پچیسویں صدی کے آخر میں لڑنے کی دہائی میں، ہو آ گیا تو ان دنوں ڈاکٹر صاحب فکشن ہاؤس سے وابستہ تھے اور نہ صرف ان کے لئے لکھتے تھے بلکہ پناہ دہی رسالہ "تاریخ" بھی نکالتے تھے۔ (مقتدی سے پچیس شمارے نکالنے کے بعد وہ اب اس کی اشاعت منقطع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں)۔

مجھے گو ہفتہ اور اتوار کو جمعی ہوتی تھی مگر میں پھر بھی جب لہور میں ہوتا اس محفل میں ضرور شریک ہوتا۔ یقین کریں کہ وہاں بہت دھپ و گوں سے باتیں کرنے ورن کے خیالات سننے کا موقع ملتا۔ کیونکہ وہاں دوسرے شہروں سے بھی لوگ کتب خریدنے آتے تھے اس لئے دوسرے شہروں سے آنے والے لوگوں سے تبادلہ خیال کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ پھر ظہور میو اور رانا رحمان کے درمیان ملی اختلافات سامنے آ گئے اور رانا رحمان نے اپنی لگ دوکان "بک ہوم" کے نام سے کھولیں۔ اب یہ ہوتا کہ چند گھنٹے فکشن ہاؤس میں گزارے جاتے جس کے دوران چائے، قہوہ کے علاوہ "جسے کئی دل" بھی کھانے کو ملتی اس کے بعد قائد ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں "بک ہوم" چاتا اور وہاں پھر چائے کا دور چلتا۔ پھر ڈاکٹر صاحب جیسے سادہ آدمی پر ان کے اپنے ہی پروردہ سعود الحسن نے حملہ کر دیا۔ پھر ظہور اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان ایسے مسائل پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے فکشن ہاؤس اور بک ہوم کی محفل اجڑ گئی۔ یہاں یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ اس کڑے وقت میں جہاں اور لوگوں (خیم سٹھکی) نے

ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیا وہاں امجد منہاس نے بھی بھرپور کردار ادا کیا اور اس طرح ڈاکٹر صاحب نے امجد منہاس کے "کوٹھے" پر جانا شروع کر دیا۔ "سانجھ" نے ڈاکٹر صاحب کی کئی کتابیں شائع کیں مگر ڈاکٹر صاحب سادہ آدمی (کھرے آدمی) کے اپنے پیشتر کے ساتھ ملی مسائل پیدا ہو جاتے (ہر پیشتر یہ چاہتا ہے کہ وہ نہ صرف صاحب کتاب کو کچھ معوضہ نہ دے بلکہ اس سے کیش لے) کیونکہ وہ حسب وعدہ ان کام معوضہ ادا نہیں کرتے۔ ہاں ایک ترقی پسند پارٹی کے لوگوں نے بھی ابھی تک ان کے پیسے دیئے ہیں۔

"سانجھ" کے مالک کے ساتھ مسائل پیدا ہوئے تو اب مسئلہ پیدا ہوا کہ ہفتہ وار منڈلی کہاں جے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو قائل کیا کہ اب یہی جگہ پر بیٹھا جائے جہاں کسی پیشتر کا کوئی عمل دخل نہ ہو تو ملے ہوا کہ ہر ہفتہ نیرٹلی داد کی نیرنگ گیری پر محفل جمانے جائے اور ہر آدمی اپنا اپنا دل خود داکرے۔ یہاں نیرٹلی داد کا ذکر اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ دادا نے ہمارے لئے خصوصی سلوک (رعایتی نرٹوں) کا حکم فرمایا۔

یہاں شامل ہونے والے ڈاکٹر صاحب کے پرانے فکشن ہاؤس کے ساتھیوں کے علاوہ جماعت اسلامی کے ہمدر بھی شامل ہوتے ہیں۔ (انقلابی شاعری کو ہضم کرنا بہت آسان کام ہے مگر شگلے میں اٹک جاتی ہے) اس محفل میں دلچسپ اضافہ ڈاکٹر صاحب کی "منکر نکیر" جوڑی کا بھی ہو گیا (بھلا ہو ٹی وی ٹک شو کا ہر شخص اپنے آپ کو منکر پر سن سمجھتا ہے) جو ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں ہی یہ دہراتے ہیں نہیں سمجھتے کہ ڈاکٹر صاحب نے "یہ کہا ہے۔"

یہاں نہ صرف مختلف مسائل پر دلچسپ اور کبھی کبھی گرم بحث بھی ہوتی ہے بلکہ کئی ایک کتابوں پر خصوصی نشستیں بھی ہو چکی ہیں۔ دوسرے شہروں سے لوگ بھی ملنے آ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب میں یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے خیالات دوسروں پر نہیں ٹھونسے شروع سے ہی ان کا یہ طریق ہے کہ اگر کوئی سو کرے تو کسی ساتھی کو کہتے ہیں کہ بھی آپ اس کا جواب دیں گوان کے "منکر نکیر" ٹی وی اسٹیکر کی طرح ڈاکٹر صاحب کو مجبور کرتے ہیں کہ وہی ہر سوال کا جواب دیں۔ گوڈاکٹر صاحب میری پر یقین نہیں رکھتے۔ مگر آج کے دور میں یہ لوگ بھی یقیناً غیبت ہیں اور ان میں جانے کی خواہش اور تحس پر شک نہیں کیا جاسکتا۔

میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بطور مورخ بات نہیں کروں گا کیونکہ میری نظر میں یہ کام دوسرے ساتھی بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ صرف اتنا کہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو عام فہم زبان

میں لکھ کر اسے عام آدمی میں متعارف کروایا ہے سو ڈاکٹر صاحب کو "عوامی مورخ" کہا جاسکتا ہے۔ ان کی کتابیں بلوچستان اور سندھ میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف عام آدمی، خواتین، بچوں اور بوزھوں کے لئے لکھا ہے بلکہ پاکستان کے بارے میں کوئی بھی تحقیق ان کے کام کا حوالہ دینے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نڈر اور سچے معنی رابرٹ فکس نے جب پاکستان کا ذکر کیا تو ڈاکٹر صاحب کی کتاب Identity of Pakistan کا حوالہ دیا۔

مجھے یہ پتہ حاصل ہے کہ جب سے ڈاکٹر صاحب سے میل ملاپ شروع ہوا ہے انہوں نے مجھے اپنی ہر کتاب سے نوازا۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ جب انہیں ہندوستان میں دلانی آمد سے امن ایوارڈ ملتا تو میں نے ان کا نذر دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے سے جونیئر لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے دل کھول کر دے دیتے ہیں۔ جب میرا مضمون پاکستان کی تاریخ پر "جہد حق" میں چھپا تو انہوں نے سب سے پہلے فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ بہت ہی اچھے انداز میں ہر شخص سے تخلیقی کام کروانے کے ماہر ہیں، انہی کی وجہ سے میں آہستہ آہستہ "تاریخ" کا ریکارڈ لکھاری بن گیا۔ پھر یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف مجھ سے واکاؤ کے کسانوں کی تحریک کے بارے میں مضمون لکھوایا بلکہ مجھے کراچی میں ہونے والی تاریخ کانفرنس میں شرکت کی دعوت بھی دی۔ جسے میں بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔

چند ماہ پہلے جب مشہور مورخ امیرک ہاوس کا انتقال ہوا تو ڈاکٹر صاحب ان کے بارے میں چھپے ہوئے دو مضمین لکھے اور مجھے کہا کہ تم نے انہیں تاریخ کے لئے ترجمہ کرنا ہے۔ مجھے کچھ ہچکچاہٹ تھی مگر انہوں نے اس پر زور دیا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ بلکہ اشتیاق اس قدر بڑھا کہ میں Economic and Political Weekly (EPW) میں رو میلا تھا پر کے ہاؤس ہاؤس کے بارے میں لکھے گئے مضمون کا بھی ترجمہ کر دیا، اور اس کے ساتھ ہی ہاؤس ہاؤس کی کتاب کا بھی مطالبہ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب انکار نہ کر سکے مگر انہوں نے یہ ضرور کہا کہ وہ کسی کو کتاب مستعار نہیں دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھے رو میلا تھا پر کی کتاب سونم تھوٹو کاپی کر دی تھی۔ اس کا ترجمہ کرو کر بھی چھپوایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب یقیناً ایک عوامی مورخ ہیں اور انہوں نے عام زبان میں تاریخ پر درجنوں کتابیں لکھی ہیں اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ایک عوامی مورخ ہیں۔

یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی بعد امت بہت کم ہو گئی ہے اور انہیں لکھنے پڑھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے روزانہ کے معمولات نہیں

چھوڑے ہیں، پہلے کی طرح لکھتے پڑھنے کا کام جاری ہے مگر اس سارے معاشرت میں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی نین تار کا بہت ہم کردار ہے جس کو ڈاکٹر صاحب پٹی سیکریٹری کہتے ہیں کیونکہ وہی اس کا ٹیپوگرافر بنتی ہے اور یہی لکھتی ہے۔ اس کی دوسری دو بیٹیاں عطیہ اور شہلا امریکہ میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف دوسرے دوستوں کی طرح اپنا ادا کرتے ہیں بلکہ دوستوں کو اکثر اصرار کر کے گھر پر لکھنے کے لئے بھی بلاتے ہیں اور اپنی زوجہ محترمہ ذکیہ کے ہاتھ کا بنا ہوا حلیم اور پائے بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بہت دکھ کے ساتھ لکھا ہے کہ انہیں "کنزورمہ جڑ" کہا جاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اس کی وجوہات کا کس کو علم ہو سکتا ہے صرف یہ عرض ہے کہ (مسلم لیگ) جو بڑی بڑی کٹھن گے اور اس میں بے گنہ گوگوں کو بھی خیمہ زد بھگت پڑتا ہے۔ آج پاکستان کی سڑکوں پر بڑی بڑی گاڑیاں نظر آتی ہیں، دنیا کے بڑے بڑے بین الاقوامی سنور بھی نظر آتے ہیں ہر شخص کے پاس موبائل ہے اور بچوں میں یہ پناپ بھی پائے جارہے ہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی معاشرہ کافی حد سے ذہنی اور فکری پس ماندگی کی طرف گامزن ہے اور ہم سب اس کے ذمہ دار ہیں۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ریاست ڈاکٹر صاحب کو ایک ایسا ادارہ بنانے میں مدد کرتی جہاں وہ نوجوانوں کی تاریخ نویسی میں ٹریننگ کرتے اور پاکستانی سینٹرز سٹری لکھتے مگر بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوا مگر اس حالات سے ڈاکٹر صاحب بد دل نہیں ہوئے اور انہوں نے انفرادی طور پر وہ سب کچھ کر دکھایا ہے جو کہ دوسرے ملک میں ادارے کرتے ہیں۔ مبارک علی پاکستان کا شاہ ہیں۔ مگر افسوس ریاست نے انہیں وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔

مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے اور ان کی صحت اور درازی عمر کے لئے دعا گو ہوں۔

چند یادیں

کھٹاؤل

یہ 1984ء کی بات ہے جب دلی رام صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر مبارک علی جو سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اُس نے سندھ کی تاریخ پہ کتابچے لکھے ہیں، وہ پڑھنا ضروری ہیں۔ میں ییل۔ ایم۔ سی کی این سینا ہاسٹل سے پیدل ایک دن آرٹس فیکلٹی پہنچا تو مبارک علی کے ساتھ فرید الدین آئے۔ آرنہ گوری، جماعت علی شاعر اور عیسیٰ دودھ پوتا کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی۔ اس پہ حیرت ہوئی کہ مبارک علی خود لکھتے، چھاپتے اور بیچتے ہیں۔ اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ہر ایک اینڈ پے ریڈیو پاکستان یا ہونٹ فارن میں ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دفعہ مبارک علی کے ساتھ ساگھڑ گئے وہاں اللہ وراہیو اور اسحاق منگرو نے ٹیکچر کے لئے بلایا تھا۔ یاد رہے کہ ہم جہاں بھی گئے تو بس کا کرایہ ڈاکٹر صاحب یا پروفیسر فرید الدین دیتے تھے۔ دیل واس کلب میں زبید احمد فردوس، فکیل پٹھان، خالد وہاب ورحسن منظر سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہماری ملاقاتیں اسنڈی سرکل کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ ایک دفعہ ہم دادو گئے جہاں عاقل سفیرائی نے طالب، مولیٰ ہائی اسکول میں ٹیکچر کرایا تھا اور وہاں عجاز قریشی کے گھر ٹھہرے تھے وراستاد بناری، حکم شاہد بناری، شوکت سندھی اور صدق منصور سے ملاقات ہوئی۔

مبارک علی کے ٹیکچرز اور ہماری ملاقاتوں کی وجہ سے دوستوں میں تاریخ پڑھنے کا رجحان پیدا ہوا جو پورے ملک میں پھیل گیا، وراہ مبارک علی کی ساٹھ سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں اور وہ کئی خبروں میں کالم لکھتے ہیں خاص طور پر ”ڈان“ اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ 1990ء میں باقاعدہ ختم ہوا جب وہ لاہور چلے گئے اور ہم واپس تھرپاکر آ گئے۔ لیکن اب تک رابطہ برقرار ہے اور اسنڈی سرکل اب ٹیلیفون پہ ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے دنیا کے بہت پڑھے لوگوں کو اور مجھ جیسے عام آدمی کو کتابوں اور سہ ماہی ”تاریخ“ کے ذریعہ متعارف کروایا جس میں خاص

طور پر ہنس کھپ، رومیاتھ پر، عرفان حبیب، پن چندرا، کوئٹی قابل ذکر ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں کے سب اساتذہ اگر اپنے کرایے پر اور اپنی چائے پلا کر ٹیکچر دیں۔ اسنڈی سرکل چلائیں تو ہم دوسروں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ مبارک علی نے ایک بات ثابت کی ہے کہ ذریعہ بحث پہ بھی کتابیں اور رسالے چھپ سکتے ہیں اور فردا جس کا کام کر سکتا ہے۔

ایک دفعہ سید حسنی بی بی پر کرچی جانا ہوا۔ مبارک علی و جب 1989ء میں فیض ایو رڈ ملا تو ہم بھی سو گئے تھے۔ ایک ہفتہ نصیر اسٹیج کے گھر ٹھہرے تھے اور وہاں موجود فیض فیملی، رفیق جعفر، انور کمال، حمد شیر، صفدر میر، کشورناہید ورنجم حسین سید سے ملاقاتیں ہوئیں اور اُسے بنیاد بنا کر ہم بھی زندہ ہیں۔ آخر میں یہ کہوں گا کہ اگر مبارک علی ڈپلویٹک حراج کے ہوتے تو زندگی میں تکلیفیں مشکلات کم دیکھتے اور وہ لوگوں کے تعصب اور تنگ نظری کا کم شکار ہوتے۔ لیکن میں اُن کے گزارے ہوئے وقت پہ فخر کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

تاریخ اور مؤرخ

ڈاکٹر توصیف احمد خان

تاریخ دنیا کا قدیم مضمون ہے۔ تاریخ سے ماضی کے واقعات کا علم ہوتا ہے جس کی بناء پر حال میں سونے والے قدمائے کو بہتر بنانے کا شعور آتا ہے۔ یوں مستقبل سنو رنے کا موقع ملتا ہے۔ پاکستان میں پڑھائی جانے والی تاریخ عرب، ہندوستان، مسلمان بادشاہوں اور مسلم لیگ کے کاربائین کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے یوں ماضی کے کارناموں پر فخر کرتے ہوئے دیامیں سہولتی قائم کرنے کے عزم کے ساتھ ناکامیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اس صورتحال کی بناء پر مشرقی بنگال کے عوام نے مرکز کے خلاف جدوجہد کی اور بنگلہ دیش بن گیا اور اب ہر طرف پاکستان کی تقسیم کے چرچے ہو رہے ہیں۔ عرب، ہندوستان اور مسلمان حکمرانوں کی فتح کے گیت گانے والے مورخین ایک سارشی نظریہ کو ملک کی تباہی کا ذمہ دار قرار دے کر پنا فریضہ پورا کرتے ہیں۔ یوں ایک مخصوص ذہن Mandset نے ملک کی کشمیت کو اپنے بس میں کر رکھا ہے۔ پاکستان ایک دہشت گرد ملک کے طور پر دنیا بھر میں جاننا جاتا ہے ملک میں غربت و فساد کی شرح بڑھ رہی ہے ہر شخص مستقبل سے خوف زدہ ہے، روز و رات زیادہ قدیم زبان نہیں ہے، یہ ۸ ویں صدی میں ارتقاء پذیر ہوئی اس کی سرپرستی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاربائین نے کی پھر ۳۰ ویں صدی میں اردو اشتیاق حسین قریشی، کے کے عزیز، نسیم جازی اور ڈاکٹر صفدر محمود نے تاریخ لکھنے کا کام سنبھالا اور ریاست نے ان رجعت پسند دشوروں کی سرپرستی کی، ان دشوروں نے ایک نظریاتی ملک کا راگ اپنا، فوج جو امریکی سرپرستی میں ایک عہدہ ریاست بن رہی تھی نے اپنے مقاصد کے حال ان دشوروں کی سرپرستی کی یوں تاریخ کو حقیقی انداز میں لکھنے کا تصور عام نہ ہو سکا۔ سید سید حسن باری، عیسیٰ علی، عباس جلال پوری اور ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کو عقیدے سے ہٹ کر سائنسی طرز فکر کو رائج کرنے کی روایت کو اپنایا۔ ڈاکٹر مبارک علی کو ایک تیار

حاصل ہے کہ انہوں نے جدید تاریخی روایت کے اصولوں کے تحت تاریخ لکھنے کا آغاز کیا اور ہمیشہ معقول رہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اس ملک میں عوامی تاریخ لکھنے کی روایت ڈالی، انہوں نے انسانی سماج کے ارتقاء کو بیان کرنے کے ساتھ تاریخ کی آگہی کو پنا مشن قرار دیا۔ ڈاکٹر مبارک علی تو راجستھان کی ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے مگر اس کا بچپن اور جوانی حیدرآباد، سندھ میں گزرا۔ ڈاکٹر مبارک کا پس منظر ۱۹۰۷ء کے متوسلہ طبقے سے تھا۔ یہاں جاتا ہے کہ حیدرآباد کا اردو بولنے والا طبقہ رجعت پسند خیالات سے متاثر رہا ہے اور ان لوگوں نے طویل عرصے تک سندھ کی مقامی تہذیب و تاریخ کو قبول نہیں کیا اور تاریخ کو مستحق کی مگر ڈاکٹر مبارک علی اردو بولنے والے پہلے دانشور ہیں جنہوں نے سندھ پر حملہ کرنے والے جنگجوؤں کے عزائم کا تجزیہ کیا انہوں نے عرب، ہندوستان اور محمد بن قاسم کی مہم کے مقاصد اس کے دور میں لوٹ مار اس وقت کے حکمران حجاج بن یوسف کے پس پردہ کردار عربوں کی فوج کے جدید ہتھیار، حکمت عملی اور ہندوستان کے حقیقی مقاصد کے بارے میں اردو میں کتاب تحریر کر کے پاکستان کی نظریاتی ریاست کے شیشہ کو پکنا چور کر دیا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے مغلوں کی تاریخ پر خصوصی توجہ دی انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں اکبر کے طرز حکومت کا جائزہ لیا ہے ال کا کہنا ہے کہ اکبر کے بارے میں حساب کی کتابوں میں حقائق کو سمجھ کر کے پیش کیا گیا۔ اکبر کے بارے میں یہ بات غلط طور پر تحریر کی، اکبر نے ایک سیکور طرز فکر کو اپنایا، ہندوستان میں آباد تمام مذاہب کیسے صلح کل کا نظریہ بنایا یوں مغل سلطنت کو دوام حاصل ہو، اکبر نے اگر مسلمانوں کے کسی مخصوص فرقے کی شریعت کو اپنایا ہوتا تو ماضیہ سلطنت میں کبھی توسیعی نہیں ہوتی اور نہ سلطنت میں استحکام ہوتا اس طرح ڈاکٹر مبارک علی نے ورنگریب عالمگیر کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا انتہائی سنجیدگی سے تجزیہ کیا انہوں نے ورنگریب کی جنوبیت جس کا شکار اس کے بھائی اور بیٹی ہوئے کے بارے میں حقائق ظاہر کر کے ان لوگوں کیسے مشکل کھڑی کر دی جو ورنگریب کے دور سے نظریاتی ریاست کا سلسلہ جوڑتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ مغلیہ سلطنت کے زواں کا آغاز اورنگزیب کی پالیسیوں سے ہو، یوں جو لوگ اورنگزیب کی پالیسیوں کو ہیرو بنا کر اس ملک کو ہزاروں سال پیچھے دھکیلنا چاہتے تھے، ان کے پاس عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے حقائق مختصر ہوئے۔

ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ ۱۸ اور ۱۹ ویں صدی میں ہندوستانی معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان تبدیلیوں کی بناء پر ہندوستانی سماں میں ترقی کے امکانات روشن تھے مگر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر قبضہ کر کے اس کا بدترین استحصال کیا یوں برطانیہ میں خوشحال آگئی ور ہندوستان غریب

ہو گیا۔ برصغیر حکومت کی استحصالی پالیسیوں نے ہندوستان کو فرقوں ذات پات میں تقسیم کر دیا، جس کی بناء پر ۲۰ ویں صدی میں ہندوستان تقسیم ہوا جس کا خلیہ زہ بھارت اور پاکستان کے عوام آج بھگت رہے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک نے ۲۰ ویں صدی میں چلنے والی تحریکوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا انہوں نے یہ دھپ کشاف کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جمعہ کی نماز کے مختصر خطبے سے پہلے تقریر کا طریقہ رائج کیا اور یہ خطبے کا حصہ بن گیا۔ آج بھی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی مسجد میں علماء اس تقریر کے ذریعے رجعت پسند اندہ مواد کو وزوں وگوں کے دماغ میں داخل کرتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر مبارک نے خلافت تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ مہم تہا گاندھی نے سیاست میں مذہب کو سب سے پہلے استعمال کرنا شروع کیا، گاندھی کی مذہب کو سیاست میں استعمال کرنے کی اس ٹیکنیک سے پہلے ہندوستان میں یہ رواج نہیں تھا، یوں محمد علی جناح نے گاندھی کی پیروی کرتے ہوئے اسد م و بطور ہتھیار استعمال کیا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے محمد علی جناح کی مغربی طرز زندگی اور سیکولر اپروچ کا ذکر کیا ہے، جب ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے ایک آرٹیکل میں جناح صاحب کا یہ قول تحریر کیا کہ پاکستان میں نے اور میرے نائب رائٹر نے بنایا تھا تو خود سب ختم نظر یہ پاکستان کے علم بردار ڈاکٹر صفدر محمود نے ان کے خلاف رکیک مہم چلائی، بہت سے لوگوں کی کوششوں کے باوجود ڈاکٹر مبارک علی کا موقف "جنگ اخبار" میں شائع نہ ہو سکا، اس وقت ڈاکٹر مبارک کراچی آئے، کمانڈر ایوب ملک اور ماہنامہ ہدایتی دنیا کے ساتھیوں نے اس موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا، اس سیمینار میں ڈاکٹر جعفر احمد، تنسیم صدیقی وغیرہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا مگر اس سیمینار کی روداد بھی روزنامہ جنگ میں جگہ نہ پاسکی۔ ڈاکٹر مبارک علی ہر اس نوجوان کی سرپرستی کرتے ہیں جو تحقیق اور تصنیف میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وفاقی ردو یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ عام کے تحت میرے دوست پروفیسر ناصر عباس نے تاریخ عام میں سترہ ریت کے اثرات پر کانفرنس کرائی اس وقت اردو یونیورسٹی ٹی ٹی بی تھی ہمارے پاس کانفرنس کرانے کا تجربہ تھا اور نہ فنڈ موجود تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے یقین دایا کہ وہ لاہور کے ۱۰ کے قریب دانشوروں کو اپنے خرچے پر کراچی مانیں گے جو اس کانفرنس میں مقالے پیش کریں گے۔ ہدایتی دنیا کے روح رواں کمانڈر ایوب ملک نے رجنٹ پلازہ میں ہال اور کھانے کا انتظام کرایا یوں یہ اردو یونیورسٹی کے ساتھ پہلی کانفرنس تھی اس کانفرنس میں ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ ایک نوجوان وکیل بھی آیا جس کے مقالے سے ڈاکٹر مبارک کی تحریک کی جھلک نظر آئی، بعد میں اس ہی شخص نے ڈاکٹر مبارک علی کی ایک کتاب میں تحریف کر کے یہ مواد شائع کر دیا جس سے مختلف جوں، وکلاء، دانشوروں کی توہین ہوتی تھی۔ ڈاکٹر

مبارک علی کے خلاف لاہور کے مختلف تھانوں میں مقدمات درج ہوئے۔

ڈاکٹر مبارک علی امریکہ سے کراچی آئے تو ایوب ملک سے میرے مشورے پر سندھ ہائی کورٹ سے حفاظتی ضمانت کا بندوبست کرایا یوں، غائب پولیس ڈاکٹر صاحب کو گرفتار نہیں کر سکی پھر ہم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے ناروا سلوک کے خلاف دستخطی مہم چلائی۔ لاہور میں دوستوں کی کوششوں سے کچھ دانشوروں نے آرٹیکل تحریر کئے۔ حسن شاد صاحب نے ایک خوبصورت کام تحریر کیا، مجسم پٹھانی کے روزنامہ ٹائمر کے دارینے کو پڑھا کر گورنر پنجاب نے اس مسئلے کا نوٹس لیا۔ جب ڈاکٹر مبارک علی نے ایک طویل جدوجہد کے بعد کامیابی حاصل کی تو فیصلے کے وقت کئی قریبی لوگ آئے آئے اور ڈاکٹر مبارک نے اس شخص کو معاف کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے ہمیں یہ شعور ملا کہ مذہبی قوی اور ذاتی ہیرو خامیوں سے بے ہوتے ہیں انہیں خامیوں سمیت قبول کرنا چاہیے اس طرح وڈھوں کو جو انوں پر حکومت نہیں کرنی چاہیے، جو انوں کو اپنے فیصلے خود کرنے چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے حاصل ہونے والے شعور کی بناء پر مجھ جیسے کئی لوگ شخصیت پرستی کا شکار نہیں ہوئے یوں ہم لوگ استحصالی کی ایک خاص شکل کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں کے بارے میں ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں ورنہ ان کی مشکلات حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا موضوع ابلاغ عام ہے مگر میں نے اس موضوع پر جب بھی کوئی کانفرنس منعقد کرائی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے کہنے پر بھارت اور پاکستان میں سادہ اور صحافیوں سے رابطے کئے اور انہیں کانفرنس میں شرکت کے لئے آواہ کیا جب میں اپنے پلی ایف ڈی کے تھیس کے لئے مختلف ماہرین سے نطریوں کے لئے، ہوتا ہوا ڈاکٹر صاحب نے ذاتی دلچسپی لے کر میرے کام کو مکمل کرایا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی سوچ کی بڑی سزا کاٹی وہ سندھ یونیورسٹی میں معروف شاعر شائبا زکی وائس چانسلری کے دور میں معطل رہے پھر قوم پرست طبقہ تنظیم کے فاسٹ رویے سے ماہوس ہو کر ریٹائرمنٹ سے پہلے ریٹائرمنٹ سے دن پھر انہیں ملک کی کسی یونیورسٹی میں جگہ نہیں ملی۔ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی عازمت کی پیشکش انہوں نے قبول نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی انتقامت میں ان کی اہلیہ کا ہم کردار ہے، جنہیں اس موقع پر خراج تحسین پیش نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان کا ٹائٹل ہیں مگر ہم ان کے سے صرف چند جملے تحریر کر سکتے ہیں اور بے لوگ جب تک باقی ہیں تاریخ کا تسلسل جاری رہے گا۔

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر تنسیم صدیقی

ڈاکٹر صاحب سے میری ہفتادہ ملاقات تو اکتوبر 85ء میں اس وقت ہوئی جب حکومت نے مجھے حیدرآباد ڈیپارٹمنٹ اتھارٹی کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا لیکن اس سے پہلے سرسری واقفیت ڈاکٹر صاحب سے اس طرح ہو چکی تھی کہ ہم دونوں سندھ یونیورسٹی کے طالب علم تھے مبارک صاحب مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ جنرل ہسٹری ور پبلیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ ایک ہی بلڈنگ میں تھے اس لئے آتے جاتے سلام دعا ہو جاتی تھی۔

اس زمانے میں سندھ یونیورسٹی کا میعاد دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت بہتر سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر رضی احمد بن صدیقی وائس چانسلر تھے۔ جنرل ہسٹری کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر احمد بشیر ور پبلیکل سائنس کے ہیڈ ڈاکٹر نیاز الحق، انگلش کے پروفیسر جمیل واسطی، رادو کے ڈاکٹر خدیم مصطفیٰ خان فارسی کے ڈاکٹر قاضی، اسلامک کلچر کے ڈاکٹر نبی بخش بوج ورمعاشیات کے ڈاکٹر یں سے جی خان تھے جو ناگ خاں کہلاتے تھے۔ اسی طرح سائنس فیکلٹی میں نامی گرامی اساتذہ تھے۔ غریبک یونیورسٹی میں ایک مہمی اور ادبی فضا تھی ور طلباء کی لگن اور محنت کے ساتھ آگے بڑھنے کی جستجو میں گھر جتے تھے۔

غیر نصابی سرگرمیوں عروج پر تھیں ور رور نہ کوئی نہ کوئی تقریری مقابلہ سیمینار یا کانفرنس اولڈ کیپس میں منعقد ہوتا تھا جس میں سرے طالب علم جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ یونین کا سائنس ٹیکشن بڑے معرکے کا ہوتا تھا ور شروع کے سالوں میں نظریاتی بنیاد پر لڑا جاتا تھا لیکن 1960ء کے وائس سے اس میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی اور اب طالب علموں میں سائنسی تقسیم نظر آتی گئی تھی محسوس ہوتا تھا کہ رد ورسندھی بولنے والے طالب علموں میں بہت آہستہ کچھ بڑھ رہا ہے۔ میں چونکہ جام شورو کیپس کے ہوش میں رہتا تھا اس لئے یہ ٹھنڈی دہاں زیادہ محسوس ہوتی تھی حتیٰ کہ دونوں گروپوں کے میس بھی

ٹنگ ٹنگ تھے۔ لگتا تھا کہ اندر ہی اندر ساواپک رہا ہے جو کسی بھی وقت پھٹ پڑے گا۔ اس سائنسی تقسیم اور باہمی چیلنج کی بنیادی وجوہات کیا تھیں؟ اس پونٹ کے قیام اور یوب خانی مارشل لاء نے اس کو کتنا بڑھا دیا؟ ملازمتوں اور زرعی زمینوں کی بندر بانٹ میں بیوروکریسی کا کیا کردار تھا؟ ان تمام چیزوں کے اثرات سندھ یونیورسٹی پر کیا پڑے؟ یہ ایک امگ کہانی ہے جو کبھی تفصیل سے لکھی جانی چاہئے۔

1965ء میں میں نے سپیریئر سرورسز کا امتحان دیا اور سلیکشن کے بعد اپنی پوسٹنگوں کی وجہ سے مختلف شہروں اور صوبوں میں گھومتا رہا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر صاحب سے رابطہ تقریباً منقطع ہو گیا۔ تقریباً بیس سال بعد جب ڈاکٹر صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس وقت حالات بہت بد چکے تھے۔ مبارک صاحب نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کر لی تھی اور سندھ یونیورسٹی کے جنرل ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین بن چکے تھے، میں ایک پختہ کار بیوروکریٹ بن چکا تھا۔ لیکن دونوں ہی حالات سے سخت غیر مطمئن تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ سندھ میں سائنسی فسادات بے حد ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی میں پڑھنے لکھنے کا، حول تقریباً ختم ہو چکا ہے، نہ طالب علموں کو پڑھنے کا شوق ہے، نہ اساتذہ کو پڑھانے کا۔ اس پر طرح یہ ہے کہ Violence کا زور ہے۔ ہتھیاروں کا استعمال عام ہے اور انتظامیہ بے بس ہے۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ لطیف آدمی میں میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے اس لئے اب ان سے تقریباً ہر ہفتے ہی ملاقات ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے اساتذہ کے برعکس ڈاکٹر صاحب کی ملکی مسائل پر گہری نظر تھی اور نو جوانوں سے مستقل رابطہ تھا۔ اس میں سندھی بولنے والے لوگ بھی تھے اور ردو بولنے والے لوگ بھی۔ ان کا گھراؤ پن وائس تھا جب کسی کا دل چاہے وہاں آسکتا تھا اور حالات حاضرہ پر اپنا نقطہ نظر پیش کر سکتا تھا۔

کرنل فیض سے دلچسپی رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ 1984-85ء میں ضیاء الحق کی حکومت عروج پر تھی لیکن ایک transition کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سیاست پر نسلی رنگ غائب رہا تھا۔ ایک طرف سندھی نیشنلسٹ پارٹیز کو مٹری حکومت سپورٹ کر رہی تھی تو دوسری طرف ایم کیو ایم مہاجر قوم پرستی کے نام پر اپنے آپ کو رنگنا کر رہی تھی۔ پاکستان کے حالات پر گہری نظر رکھنے والے لوگ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ 1977ء کے مارشل لاء کے کچھ دنوں بعد ضیاء الحق کی سرکردگی میں حکومت اسلام پسندوں کے ہاتھ آگئی تھی ور انہوں نے جس جس کو نہ صرف پڑھے لکھے لوگوں کو تعلیمی اداروں سے نکال باہر کیا بلکہ سمدلی نظام تعلیم کے نام پر تاریخ اور فلسفے جیسے مضامین کو

کاجوں اور یونیورسٹیوں سے تقریباً دیس نکالا دے دیا۔ اسکوئوں میں پاکستان اسٹڈیز اور اسلامک اسٹڈیز نے تاریخ کی جگہ لے لی۔ اسی عرصے میں فنون لطیفہ اور ان تمام اداؤں کا بیڑا خرق ہوا جو لوگوں کو لبرل ازم کی طرف لے جاسکتے تھے۔ ہر وہ چیز اسلام کے خلاف گردانی گئی جو معتدربطقت کے مفادات کے خلاف تھی۔

جیسے کہ میں نے پہلے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی آف سندھ کے حوال سے بہت بالاں تھے لیکن وہ ناامید ہو کر گھر نہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے نوجوانوں سے رابطے بڑھانے شروع کئے اور پروفیسر اے آر ناگوری، پروفیسر فرید ورخو شید قائم خانی اور دوسرے سم خیز بگوں کو بھی اس طرف رغبت کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ گوکہ حالات بہت نامساعد ہیں لیکن لوگوں کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر نہیں بیٹھنا چاہئے۔

اسی زمانے میں، میں نے ایچ ڈی اے کے نوجوان افسروں کی مدد سے خدا کی ہستی اسکیم کو نری میں شروع کی جس کے ذریعے ایک سرکاری دارے نے یہ ثابت کیا کہ اگر حکومت اور اس کے کارندے چاہیں تو کم آمدنی والوں کے مسائل انہی کی مدد سے آسان طریقے اور انتہائی کم قیمت میں حل کئے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس اسکیم میں مستقل دلچسپی لی اور اس کے مختلف سیمینارز اور ورکشاپوں میں بھرپور شرکت کی۔

شاید اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے چھوٹے چھوٹے کنجے لکھنے شروع کئے اور اپنے خرچے پر انہیں چھپوانا شروع کر دیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کا ذہن اس بارے میں Clear تھا کہ تاریخ صرف بادشاہوں، شہزادوں، جنگوں اور فتوحات کا علم نہیں ہے اس کا Canvas بہت بڑا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ تاریخ کے مختلف زمانوں میں عام لوگوں کے کیا حالات تھے ان کے مسائل کیا تھے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ تاریخ کی تقسیم بدھوں، مسلمانوں یا مگریزوں کے دوار پر نہیں ہونی چاہئے تاریخ ایک مسلسل عمل ہے اور حکمرانوں کا مذہب ایک Subsidiary چیز ہوتا ہے۔ اصل چیز اقتدار پر قبضہ اور اس کو مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کرتے ہیں جس میں مذہب بھی شامل ہے۔

1988-89ء کے لگ بھگ ڈاکٹر صاحب لاہور شفٹ ہو گئے اور وہاں جا کر اپنا حلقہ احباب وسیع کیا۔ انہوں نے ایک ادارہ ترجمہ ادارے کے ذریعے بے شمار کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مختلف یونیورسٹیوں اور کالجز میں پڑھایا اور بے شمار طبعموں کو اپنے خیالات سے متاثر کیا۔ کچھ عرصے کے لئے انہوں نے گونے انٹرنیٹ کے ڈریکٹری حیثیت سے بھی کام کیا لیکن پھر ہمہ وقت پڑھنے لکھنے کے کام کے کام میں لگ گئے اور بے شمار کتابیں لکھ ڈالیں۔

ان کا دوسرا بڑا Contribution یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو عام فہم بنا کر اسے عام آدمی تک پہنچایا۔ تاریخ کے ہر پہلو پر کتابیں لکھیں چاہے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب ہوں یا پاکستانی معاشرے کی کمزوریاں، چاہے ہمارے دانشمندیوں کا دوغلہ پن ہو یا سماجی ناہمواریاں۔ ڈاکٹر مبارک علی کا تیسرا اہم Contribution یہ ہے کہ انہوں نے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا کہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے خصوصاً تاریخ جیسے خشک مضمون کی۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اندرون سندھ و راجستان کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کادشوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوئی کہ اگر کتاب اچھی ہو، دور حاضر کے مسائل سے اس کا تعلق ہو اور آسانی سے دستیاب ہو تو لوگ اسے ضرور پڑھیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی سے سب سے اہم سبق جو ہم سیکھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں لگن ہو اس کا جذبہ صادق ہو تو کامیابی یقیناً اس کے قدم چومتی ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کو ان کی 72 ویں سالگرہ پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے کام میں لگن رہیں اور نئی نسل کے لئے ان کی کتابیں مشعل راہ ثابت ہوں۔

لکھنے کا عمل ہی نہیں بلکہ چھپوانے کا عمل بھی اپنی محنت اور محرومی و ذاتی بجٹ سے جاری رکھا۔

ان دنوں ڈاکٹر صاحب اپنی تحریروں کو Rotring Pen سے خود ہی ہر پیپر (Butter Paper) پر لکھتے پھر لطیف آباد یونٹ نمبر 7 میں واقع ایک چھوٹے سے پریس سے چھپواتے خود ہی اس کی پروف ریڈنگ کرتے پھر دوبارہ پریس میں پہنچایا کرتے، اور چھپ گئی کتابوں کے بندر بنی 70 موٹر سائیکل کے کیریئر میں رکھ کر لاتے۔

دو ایک بار ڈاکٹر صاحب کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے راقم نے نظریاتی کٹ منٹ کے اس عملی مظاہرے کو بہ چشم خود دیکھا۔

حیدر آباد شہر کے علاقے صدر میں موجود ایک ہوٹل "قاران" ہے (یہ آج بھی موجود ہے) وہاں ہر دیک بیک کو ایک غیر رسمی (Informal) بینٹھک ہوا کرتی تھی جس میں شہر کے چند ایک پروفیسرز، زبیر احمد فردوسی، فرید الدین شیخ، ڈاکٹر حسن منظر، خالد وہاب اور ڈاکٹر مبارک علی شامل ہیں، بیٹھا کرتے تھے۔ ترقی پسند سوچ رکھنے والے ان اصحاب میں کبھی کبھی اسی شہر یا کسی اور شہر کے دانشور، ادیب یا شاعر بھی شامل ہو جاتے مگر دو چار اسٹوڈنٹ اکثر ہی شامل رہتے۔

ان نشستوں کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ یہاں ڈاکٹر پہلے سے طے شدہ کوئی موضوع یا روایتی طور پر اشعار سننے اور سنانے کے بجائے زندگی اور اس سے جڑے مسائل، سیاسی، سماجی، معاشی وغیرہ کسی بھی موضوع پر گفتگو شروع ہو جاتی جس میں ان اصحاب کا تجربہ بھی شامل ہو جاتا تھا اور یہ سب انتہائی غیر رسمی (Informal) طریقے سے ہوتا تھا۔ شعور کی تربیت کا یہ انوکھا انداز پروگرامر سوسائٹی کے حوالے سے اُس وقت کے حیدر آباد میں واحد ذریعہ تھا جو کسی بھی Formality کے بغیر اسٹوڈنٹ کو ترقی پسند سوچ کو سیکھنے کا موقع فراہم کرتا۔ اپنے زمانہء حال میں میر بھی یہاں جانا رہتا تھا اور مجھے ان اصحاب دانش سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، بالخصوص زندگی کے ترقی پسندانہ نظریہ کے بارے میں یہاں پر بھی ڈاکٹر مبارک علی سے میری اولین ملاقات ہوئی۔

ایک دن میں اپنے ایک عزیز اور مجھے دار دوست ڈیشان ساسل (شاعر) سے ملنے اُن کے گھر گیا ہوا تھا وہاں ہوٹل قاران میں ہونے والی بینٹھک اور اس کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی کا ذکر بھی آیا تو معلوم ہوا کہ ہم دونوں ہی ڈاکٹر صاحب کے زبردست مداح بن چکے ہیں۔ ڈیشان نے بتایا کہ دو تین ماہ ہوئے ہیں ڈاکٹر مبارک علی ہمارے محلے دار بھی بن چکے ہیں وہ پروفیسر عبدالحق کے گھر کی وپری منزل میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ ڈیشان ایک مرتبہ بن کے گھر بھی ہوئے تھے بس تو پھر یہ طے ہو گیا کہ

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

حسین صدیقی

برسوں پہلے کی بات ہے جب فکشن ہاؤس سے چھاپی جانے والی ڈاکٹر مبارک علی کی کتابیں جن کی تعداد اب تقریباً 70 تک پہنچی ہے اس وقت ان کتابوں کی تعداد تین چار سے زیادہ نہ تھی یہ 1980ء کے شروعات کی بات ہے جب ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند دوستوں نے مل کر ایک چھوٹے سے اشاعتی ادارے کی بنیاد ڈالی جسے "آگہی پبلی کیشنز" کا نام دیا۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند دوستوں کی کچھ کتابیں اس ادارے کے تحت چھاپی گئیں لیکن کچھ ہی عرصے بعد شاید چند ایک برسوں بعد ہی کچھ وجوہات کی بناء پر یہ ادارہ ختم ہو گیا۔

لگ بھگ اسی دور میں یا اس کے فوراً بعد چھپی ایک کتاب "تاریخ اور روشنی" (یہ کتاب بہت اچھی طرح سے فکشن ہاؤس نے دوبارہ چھاپی ہے) ڈاکٹر صاحب نے یہ مصرعہ لکھ کر دیا "شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات" ڈاکٹر صاحب نے خصوص کے کسی ایسے لمحہ قبولیت میں یہ لکھ کر کتاب دی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی بات، تاریخ کو، زندگی کو دیکھنے کا نظریہ اس طرح دہائی نہیں بلکہ روح میں اتر گیا کہ گردشِ دوراں سے ہوتا ہوا اب گردشِ خوش میں شامل ہے۔

کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو، نئی زندگی سے لے کر پروفیشنل لائف، سیاسی، سماجی وغیرہ کسی بھی مسئلے کو اس کے مخصوص زاویے سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ ناممکن ہے کہ ذہن ایک خودکار میکینزم (Mechanism) کی مدد سے گویا اُس مسئلے کو جب تک مارکسٹ زاویے (Markist Angle) کوئی پرندہ پرکھ لے، ذہن اس تحقیق اور تجزیے کو ادھور اور تھوڑے محسوس کرتا ہے۔

ہمارے یہاں بہت سی اچھی روایات کے جاری نہ رہ سکنے کی طرح آگہی پبلی کیشنز جاری نہ رہ سکا۔ آگہی پبلی کیشنز سے کتابیں چھپنے کا عمل رُک جانے کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے ہمت نہ ہاری اور

کسی ایک اینڈ ڈاکٹر صاحب سے ملنے ان کے گھر جائیں گے اور ڈیروں باتیں کریں گے۔
یہ 82-1981ء کی بات ہے پھر ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں بڑھتی ہی گئیں یہاں تک کہ کبھی ہفتے میں دو بار بھی ان سے ملاقات رہنے لگی۔

ڈاکٹر مبارک علی ایک واضح نہ خصوص نظریاتی انسان ہیں، اپنے نظریات کے حوالے سے پٹی تعینات و عملی زندگی میں واضح دو ٹوک رویہ رکھتے ہیں۔ نظریاتی اور عملی زندگی کو فرق کے ساتھ کسی دوسرے پن سے گزرنے کے لئے نہیں نے خود کو کبھی مدبرانہ یا دانش ورانہ ایدیت کی مدد سے حق بجا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی یا یوں کہے کہ انہیں اس کو ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی ہست تا ضرور ہو ہے کہ گزرے ہوئے وقت کے تلخ تجربات کے نتیجے میں کبھی کبھی تلخ ہو جاتے ہیں اور اب مجموعی طور پر ایک مستقل نقطہ رویہ رکھتے ہیں۔

زندگی اور نظریات کے بارے میں مسلسل دو ٹوک رویہ رکھنا سماجی زندگی میں (بالخصوص ہمارے سماج میں) خود کو تہہ کرنے کا ایک مستقل عمل بھی بن جاتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب تہہ رہ جانے کے خوف کو برسوں پہلے بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

ان کے ساتھ اور بہت قریب رہنے والے لوگوں میں بہت کم لوگ یہ حقیقت پوری سچائی کے ساتھ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب وقت گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ بہت اکیسے ہو چکے ہیں مگر آج بھی نہایت کامیابی اور خوشی کے ساتھ اپنے نظریاتی کٹ منٹ کی ترویج و شاعت میں ہی طرح ثابت قدم ہیں، اور پرانے نظریات کی آپہرری میں مصروف آج بھی اس سوچ کے حامل نوجوانوں کے لئے انتہائی پُرکشش اور قابل تقلید ہیں۔ 1980ء کی دہائی سے لے کر آج (جنوری 2013ء) تک، تقریباً تین دہائیوں یا اس سے کچھ زیادہ وقت کو سمیٹنے یہ دورانیہ بہتری سیاسی، سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے۔ بہت کچھ بدل گیا، وہ نشیں، بیٹھکیں اور نظریاتی گروہ اور ان میں جاری تعمیری مسابقت، کچھ بھی وہ نہ رہا ہے نظریاتی ہم آہنگی برائے سہولت کے اس دور میں پرانے نظریہ پرستوں/پسندوں میں سے کسی ایک کی ایک دوسرے سے اور آپس میں بنی ہوئی نہ رہی، بعض کی تو زندگی ہی سے بگڑ گئی اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے نظریاتی کٹ منٹ سے ہی تاب ہو چکے ہیں مگر اس دور کے وہ نوجوان جو انجمن مصنفین حیدر آباد، طیف آباد سرت نمبر جمہور ماہریری میں ہونے والے اجلاس میں شریک ہوا کرتے تھے (سرت نمبر میں جہاں اب موجود حسین شایگ سینٹر اور چارہ موجود ہے) یا "قاران ہوٹل" میں بیٹھنے والے ان دانشوروں سے علم حاصل کرتے ان جلسوں میں پیش کی

جسے والی تصنیفات، گفتگو، تجزیات اور زندگی کے مختلف مسائل دوران پر ہونے والے بحث و مباحثے، ان بزرگانہ دانش کی پھیرائی ہوئی ترقی پسندانہ سوچ کی وہ روشنی ہے جو اس وقت کے مستقبل یعنی آج کے بہترے Radical Socialist (حیدر آباد میں) پیدا کرنے کا سبب بنی (بقول ڈاکٹر انور سجاد 70 سے 80ء کی دہائی پاکستان میں ریڈیکل سوشلسٹ پیدا کرنے کا زمانہ ہے۔)

1990ء کے موسم خزاں کی ایک شام جب کبھی ہنگلی سرد ہوا کا کوئی جھونکا آنے والے مرغ موسم کو پار کر دیتا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی بیگم کے ساتھ موٹر سائیکل پر میرے گھر آئے، میری شادی سے ایک دن پہلے، بیٹھنے کے لئے صراحت کیا تو کہنے لگے۔ ابھی تم مصروف ہو گے۔ کل ضرور آؤں گا مگر زیادہ دیر بیٹھوں گا نہیں ان تقریبات میں عام طور پر میں اس لئے شریک نہیں ہوتا کہ ان میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب میری ہونے والی بیوی کے لئے ایک سوٹر اور ایک خوبصورت مٹائی لمپ جتنے میں لائے تھے۔

گردش دوراں میں وہ سوٹر اور بیوی دونوں ہی ساتھ نہ رہے مگر وہ سب آج بھی میرے پاس ہے اور روشنی دیتا ہے۔

1980ء سے لے کر آج تک ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقاتیں جاری رہیں، فون، خط اور پھر موبائل ٹیکسٹ اس کے علاوہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات کے لئے کی گئی تقریبات میں شرکت اور کبھی کبھی ان تصنیفات پر مضامین پڑھنے کا بھی اتفاق رہا۔ اس میں وہ دور بھی شامل ہے جب ڈاکٹر صاحب ہمارے شہر کو چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور شفٹ ہو گئے جہاں وہ آج بھی مقیم ہیں۔

مجھے میں جن صاحب کا وہ مکان جہاں اوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب تقریباً سات برس بطور کرایہ دار مقیم رہے اور جہاں ڈاکٹر صاحب سے اولین ملاقاتیں رہیں وہ مکان برائے نام تہریلی کے ساتھ اب بھی ویسے ہی موجود ہے۔

30، 32 برس پہلے کا نوجوان اور آج کا ادیب عمر پروفیسر، شام کے وقت، واک کے دوران، اس گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے، اپنی بیوی کو وہ گھر دکھاتا ہے۔ جہاں بیڑھیں چڑھ کر ایک مختصر براہ منہ ہے (جو باہر سے بھی دکھائی پڑتا ہے) اس کے پیچھے ایک بڑی سی کھڑکی جس کے ساتھ بنے کمرے میں اندرونی جانب ڈاکٹر صاحب کا بڑا سا ریڈنگ ٹیبل لگا ہوا ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب نظر آئے۔

تیل دینے پر، جو گرہ پہنے، جنز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہشاش بشاش، سیزمیں تر کے آئے، مسکراتے ہوئے بولے ”کیسے ہو صہرائی؟“

12 دسمبر 2012ء، آئرس کاؤنسل کراچی میں ہونے والے سرورز فیسٹیول میں آج کے دن کا ایک پروگرام، ابھی کچھ ہی دیر بعد ملک کے مہینہ ساز محقق، دانش ور و تاریخ داں، تقریباً 70 کتبوں کے مصنف، بین الاقوامی سطح پر جانے مانے، ڈاکٹر مبارک علی کو آج ایوارڈ دیا جاتا ہے۔

آئرس کاؤنسل کے مرکزی دروازے کے باہر کارر کی، خوش آمدید کہنے والے کچھ لوگ دروازے پر بھی موجود تھے۔ کارر سے ڈاکٹر صاحب، ان کی بیگم اور بیٹی برآمد ہوئے۔ بوڑھے ہوتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی، ہال کی جانب اپنے ایک دوست کے بازوؤں کا سہارا لے سیزمیاں چڑھ رہے تھے۔

قریب ہی کھڑے ادیب عمر حسین صہرائی اور اس کی ہم عمر بیوی یہ منظر دیکھ گئے۔۔۔!

ڈاکٹر مبارک علی — ایک معروضی (Objective) مؤرخ

جہاد صدیقی

عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ برصغیر علی طور پر ایک منجر علاقہ رہا ہے۔ تاریخی طور پر اس میں کچھ ج بھی ہے۔ اس میں کوئی چنبیہ کی بات بھی نہیں ہونی چاہئے خاص طور پر جب ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ اس قدر وسیع و عریض قطعہ اراضی ہونے کے باوجود اس علاقے کے لوگوں نے انسانی ذہن کی ترقی میں شاید ہی کوئی خاطر خواہ کردار کیا ہو۔ اس تناظر میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ماضی حال کو ختم دینا ہے اور حال مستقبل عطا کرتا ہے۔ اگر ہم تاریخ سے نا بلند ہوں اور جھوٹ کے ساتھ زندہ رہیں تو ہم تاریخ کو مسخ کر دیتے ہیں یا پھر زبردہ تر ہم تاریخ کو رومانوی کہانیوں (Fairy tales) کے طور پر تخیل کرتے ہیں۔ پھر اس کے نتیجے میں حال پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ امید حوصلہ ہار کر تصوراتی قلعوں (Fictional Castles) میں بدل جاتی ہے۔ پاکستان میں ایسا ماحول ہے کہ یہاں لکھی جانے والی تاریخ میں بمشکل ہی سچ ل ل سکے گا۔ اس مقدس سیاست کے وجود میں آنے کے بعد سے لے کر آنے والے سالوں میں دانستہ طور پر تاریخ کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ جھوٹ ایک عالمگیر حقیقت (Universal truth) اور سچ باہمی فہری حقیقت کے زیر دست و ب کر رہ گیا ہے۔ اس طرح کے تاریک ماحول میں جہاں روشن خیالی (renaissance) اور reformation تحریکیں عم (Intellectual) کے کناروں کو نہ چھونگی ہوں ایسے میں ڈاکٹر مبارک علی کا نام ان ذہنوں کو جو حقیقت کو فہم سے سمجھ کر کے دیکھنے کے خواہشمند ہیں ان کے لئے روشنی کی کرن کا کام کرتا ہے۔ وہ ایک ”معروضی تاریخ دان“ ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں ان کے علمی کام پر روشنی ڈالوں میرا دماغ ماضی کے درپوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ ماضی سے وابستگی چاروں ہیوں قبل کی ان یادوں میں چلی جاتی ہے جب 60ء کی دہائی میں ہم سندھ یونیورسٹی میں شامل ہوئے۔ ہم دونوں کا ضمیر جد ڈھانچوں سے ٹھٹھتا تھا۔ وہ

ایک خاموش اور سنجیدہ طبیعت کے، مک تھے جو شور مچانے اور ہلکے کرنے والے شہرزدوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ میراثانوی گروہ (secondary group) سے تعلق ہونے کے باعث میں ان سے دوستی کا احویدار ہونے کا اعدن تو نہیں کر سکتا لیکن یقیناً احترام کا رشتہ پیدا ہوتا رہا۔ طالب علمی کے دنوں میں میں نے ان کو مذہب کے قریب پایا جس کے باعث ہمارے درمیان قربت تو نہ ہو سکی لیکن پھر بھی یہی احترام کا رشتہ قائم ہو گیا۔ لیکن وہ بات جو کہ ہم لوگوں کو قریب لانے کا باعث بنی وہ تھی کالجوں کے ہائی تقریری مقابلے۔ یہ مقابلے ان دنوں کاجوں اور یونیورسٹیوں میں بڑی ہی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ ان نثر کا لحاظ مقابلوں میں ہم دونوں نے مل کر یونیورسٹی کی اچھی ٹیم ترتیب دی۔ مجھے ان مقابلوں میں سے یہ ایک مقابلہ آج بھی بڑی اچھی طرح یاد ہے جو کہ چاند کراچی میں منعقد ہوا۔ یہ 60ء کی دہائی کی بات ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اور میں نے مل کر چاند سندھ کی اس مقابلے میں نمائندگی کی۔ زمانہ ماضی کا یہ ایک نہایت بڑا وقار (prestigious) واقعہ ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم اس مقابلے میں سربیک سب سے کم عمر مندوبین تھے۔ اس مقابلے میں دیگر کئی کالجوں اور جامعات کے بہترین مقررین شریک تھے۔ یہ تقریری مقابلہ بہت رست گئے تک جاری رہا اور بڑا دلچسپ رہا لیکن آخر میں ہماری مسرت اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے یہ مقابلہ جیت کر اپنی جامعد کے لئے تالیفوں کی گونج میں شرفانی حاصل کی۔ یہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد یادگاری تقریری مقابلہ تھا۔ یہ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ میرا ابتدائی تعارف تھا۔ اس تعلق کے بعد ہمارے تعلقات میں ایک طویل وقفہ آیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر مبارک علی نے ہنا ایم اے کرنے کے بعد چاند سندھ میں ملازمت اختیار کر لی جبکہ میں نے ملازمت کے حصول کے لئے کراچی کا رخ کیا اور ابتدائی طور پر سٹیٹ بینک آف پاکستان اور رسول سروس میں عارضی ملازمتیں کرنے کے بعد بالآخر دولت کا مستقل شعبہ اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے کے لئے ڈاکٹر مبارک علی سے رابطہ بالکل ہی منقطع رہا۔ جرمنی سے تارخ میں ڈاکٹر ایٹ کر کے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر مبارک علی سے جب رابطہ ہوا تو پتہ چلا کہ اب ان کے اندر ایک اعلیٰ درجے کا عالم بنے گا تھا۔ اب ان کے خیالات اور یوں چار میں عامانہ رنگ جھلکے لگتا تھا اور تحقیق کی دلچسپی بن گئی تھی۔ ان کی اخبارات میں شائع ہونے والی تخلیقات اور کتب ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی تھیں جو کہ اب تک جھوٹ اور گمراہی کی باتیں پڑھتے اور اس کو ہی سچ سمجھتے آئے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں نے ان جھوٹ کے پلندوں کو کھول کر عریں کر دیا۔ مگر "تارخ کی درستی" کی بات ہوگی تو یقیناً یہ بات کہی جائے گی کہ ڈاکٹر مبارک علی نے یہ کام کیا کہ انہوں نے رومانوی (Fictional)

طرز تارخ کو حقیقی تارخ نویسی سے بدل کر رکھ دیا اور خاص طور پر برصغیر میں مسلمان معاشرے کے ایسے پرانہوں نے بڑے حقیقت پسندانہ طریقے کے تحت لکھا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں ان واقعات کی سچائی اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے جھوٹ اور لغو کے گہرے سمندروں سے بچ کر تلاش کر کے نکال پڑا۔ ان کی ریاہت تحریریں تارخ کو "درست" کرنے کے عمل کے بارے میں ہیں اور ان کی یہ کاوشیں اب رنگ بھی ماری ہیں۔ ایسی کاوشیں صرف ایک ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو کہ اپنی سوچ میں ہمیں طور پر سکور ہوا اور وہ بعض اور غفروں سے بالاتر ہو خاص طور پر مذہبی منافرت کے عمل سے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے سکولر سوچ کا اختیار بڑی سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کی اس راہ پر چلنے کے پس پشت سب سے اہم وجہ ان کا جرمنی جیسے روشن خیال معاشرے میں طویل عرصے تک قیام ہے۔ جرمن رہبان میں مہیا ہونے والے علم نے ان کے اندر ایک حقیقی عالم کو جنم دیا جس کی دلچسپی تارخ کو حقیقت پسندی کی نگاہ سے تلاش کرنا تھا۔ انہوں نے اس طرح سے اس علم سے استفادہ کیا اور اس طرح اپنے قارئین کو اس سے مستفید کرنے کا سوچا اس کی جھلک ان کی تحریروں میں ہمیں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کا زیادہ تر تحقیقی کام برصغیر میں مسلمانوں کے دور حکمرانی کے متعلق ہے۔ درحقیقت برصغیر میں کوئی اور شخص ڈاکٹر مبارک علی کی علمی مرتبت کے قریب سے بھی نہیں گزر سکتا۔ درحقیقت یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی سے قبل کوئی تارخ نہ تھی۔ یہ بات میں کیوں کہہ رہا ہوں اس کا اندازہ صرف وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں جنہوں نے کہ مغربی روایات کے تحت رقم کی جانے والی تارخ کا تجربہ حاصل کیا ہو۔ مورخ کون ہے؟ مورخ ایک ایسا شخص ہے جو کہ ماضی کے متعلق پڑھتا اور لکھتا ہے اور اس پر مکمل دسترس بھی رکھتا ہو۔ مورخوں کی دلچسپی تاریخی واقعات کے سلسلے، ان کے متعلق طریقہ تحقیق و ران فی نسو کے ماضی سے تعلق رکھنے والے واقعات کے متعلق تحقیق کرنا ہوتا ہے۔ ان کا کام ماضی اور حال کے واقعات کو معروضی طریقہ کے تحت پیش کرنا ہوتا ہے۔ تارخ کے ان واقعات کو تجربہ کار اور نئے آنے والے محقق بھی بڑے عمدہ طریقے کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔ کچھ مورخین بہر حال اپنی شائع شدہ تخلیقات، تربیت اور تجربے کی بنیاد پر شناخت کئے جاتے ہیں۔ "مورخ" انیسویں صدی میں باقاعدہ طور پر (Professional) مورخ اس وقت بنے جب انیسویں صدی کے اختتام پر جرمنی کی جامعات میں عمدہ تحقیق ہونے کے بعد تارخ کے نئے پہلو سامنے آنے لگے۔ ڈاکٹر مبارک علی مورخ کی اس تعریف میں بالکل فٹ آتے ہیں۔ جدید دنیا کے تناظر میں تارخ اب صرف ماضی کے واقعات کو بیان کرنے کا نام نہیں رہی جو کہ ماضی کے متعلق کہانیاں ورفس نے سنائی

ہو بلکہ یہ اب مکمل طور پر ایک منفرد مضمون بن گیا ہے۔

میں حسب یہ بات کرتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک ایک معروضی (Objective) مورخ ہیں تو یہ بات اس تاریخی فیصلے (Judgement) پر مبنی ہے جو کہ ارونگ مقابل چٹگوئین کتب اور لپ سٹڈ (Irving Vs Penguin Books and Lipstadt) کے مقدمے میں عدالت کو "معروضی مورخ" کیا ہے کہ سوال کے جواب میں دینا پڑا۔ یہ بات بالکل اسی طرح مناسب (reasonable) لگتی ہے جس طرح کہ انگریزی عدالت کو استعمال کرنے کا کوئی شخص انگریزی قانون میں استعمال ہونے والی ترتیب "The Man on the Clapham Omnibus" کا اندازہ رکھتا ہو۔ اس کی وجہ سے یہ ہے کہ ہمیں حقیقت جاننے کے لئے کسی ایک قانونی نشان (Benchmark) کی ضرورت ہوتی ہے جس کی بنیاد پر ایک معروضی مورخ کی تحریر کا سوزن اور مقابلہ کر سکیں۔ ڈیوڈ ارونگ کی طرف سے Irving Vs Penguin Books and Lipstadt میں اپنائے جانے والے اصول سے قبل اس سسٹم میں ہمیں کوئی اور نظریہ نہیں ملتا جس کو کہ ہم قانونی مثال قرار دیتے ہوئے اسے معروضی مورخ کے طریقہ "تاریخ" کا نام دے سکیں!

جسٹس چارلس گرس نے ہولوکاسٹ (Holocaust) کے مفکرین کی تحقیقات کا جائزہ دیتے ہوئے ایک تجربہ کار یعنی شاہد چرڈ ایونز کی تحقیق پر بڑی حد تک انحصار کیا جس نے تاریخ کو تاریخی تحقیق کے عمل میں مستحکم کرنے کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ وینڈی اسکینر (Wendie E. Schneider) جسٹس گرس کے تاریخی فیصلے کی بنیاد پر ویل کے تحقیقی جریڈ سہ (Yale Law Journal) میں درج ذیل سات نکات کو بیان کرتا ہے جو کہ ایک معروضی مورخ ہونے کے لئے نہایت ضروری ہیں

- 1- ایک مورخ کو تمام مواخذ کو تمام مناسب خدشات کے ساتھ دیکھنا چاہئے۔
- 2- مورخ کو تمام ضدی شواہد (Counter evidence) کو تحقیق کے سامسترو نہیں کر دینا چاہئے۔
- 3- مورخ کو شواہد اور صالح شدہ اکٹھے مواد (eschew cherry-picking) کو یکساں نظر سے دیکھنا چاہئے۔
- 4- مورخ کو کسی بھی قسم کے قیاس کو بالکل واضح طور پر بیان کرنا چاہئے۔
- 5- مورخ کو مسودات کو کسی بھی طرح غلط ترجمہ یا پھر کچھ حصوں کو حذف کر کے قاری کو گمراہ نہیں کرنا چاہئے۔

6- مورخ کو تمام واقعات کی صحت کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لینا چاہئے نہ کہ صرف ان

مقتضی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا چاہئے جو کہ ایک مخصوص نقطہ نظر کی تائید کرتے ہوں۔

7- مورخ کو تاریخی کرداروں کے اس مقاصد (motives) کو ضرور زیر غور لانا چاہئے۔

اسکینر (Schneider) معروضی مورخ (Objective Historian) کی اصطلاح

استعمال کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ یہ اصطلاح مورخ کو امریکی ڈیو برٹ معیار (Daubert Standard)

کے مقابل آنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اسکینر اندر کا خیال ہے کہ اس کے خیال میں ارونگ

(Irving) ڈیو برٹ معیار کے امتحان کو اس وقت پاس کر سکے کہ جب عدالت کو "مورخوں کی

طرف بڑی بھرپور معاونت" فراہم کی جاسکی۔ میرے خیال میں ڈاکٹر مبارک علی "معروضی

مورخ" کے اس امتحان سے بڑی خوبی سے پاس ہو کر گزر رہے ہیں کیونکہ ان کی تحریروں نے جدید

مورخین کوئی راہیں دکھائی ہیں اور خاص طور پر ان عدالتوں میں جہاں پہلے سے ایسی کوئی روایات

موجود نہ تھیں۔

ڈاکٹر مبارک کی کتب اور دیگر تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے اور خاص طور پر ان کے "تاریخی

تجزیے" کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی بات جو کہ تاریخی تحریروں میں بڑی تاہید نظر آتی ہے وہ ہے ان کی

تحریر کا "تاریخی عمل" کا تجزیہ ہے جو کہ تفتیش و تقابلی خیالات کا بھرپور جائزہ ہے جو کہ حقائق کے

جائزے اور ایک مربوط طریقے سے حقائق کا جائزہ لیتے ہوئے ان معامات کی وضاحت کرتا ہے کہ "کیا

ہوا" (What happened) اور "کیوں یا کیسے یہ ہوا" (Why or how it happened)۔

جدید مورخ اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے سماجی علوم کے دیگر شعبوں مثلاً سیاسیات، اقتصادیات،

بشریات، عمرانیات، فلسفے اور لسانیات کو بھی زیر غور رکھتے ہیں۔ قدیم مورخ جدید مورخین کے

طریقہ کار سے عمومی طور پر مطابقت نہیں رکھتے لیکن پھر بھی ان کا کام اپنے وقت کے تناظر میں

واقعات کے متعلق بڑی اندرونی معلومات فراہم کرتا ہے۔ جدید مورخین کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے

کہ نئی آنے والی تحقیق اور حاصل ہونے والی اضافی معلومات کے نتیجے میں تاریخی بیان کردہ حقائق

کو یا تو قبول کرنا یا پھر ان کو مسترد کرنا ہے۔ جدید مورخین کی یہی خصوصیت بڑی منفرد خوبی ہے جو کہ

ڈاکٹر مبارک علی کے یہاں بڑے بھرپور انداز سے نظر آتی ہے۔ یہ انتہائی مشکل عمل ہے کہ ڈاکٹر

مبارک علی کی کسی خاص کتاب کا نام یہاں جائے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تمام تحریروں تاریخی تناظر

کے عمل کے زمرے میں آتی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی جدید مورخوں کی فہرست میں وہ نام ہیں جو کہ برصغیر کی تاریخ اور خصوصاً
 غزیا میں مسلمانوں کی تاریخ کو ایک خاص حوالے سے بالکل نئے طریقے سے لکھنے کی کوشش کر
 رہے ہیں۔ ان کے کام کا وہ پہلو جو کہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان
 کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو سیکور نڈاز سے لکھنا ہے اور یہی چیز اس وقت سب سے زیادہ
 اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی — جدوجہد کی ایک کہانی

سلمان عابد

ڈاکٹر مبارک علی پاکستان کے سیاسی، سماجی اور علمی حلقوں میں ایک بڑے معتبر نام کی حیثیت سے
 جانے جاتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے خیالات سے فکری طور پر
 اتفاق کرنے والے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ پایا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں ان کے
 خیالات سے اتفاق کرنے والوں کا حلقہ ہے وہیں ان سے اختلافات کرنے والے لوگوں کی کوئی کمی
 نہیں۔ ہمارے یہاں شخصیات سے اختلافات کرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ ان وجوہات میں علمی
 اور تحقیقی بنیاد بھی ہوتی ہے اور شخصیات کے بارے میں کچھ جانے بغیر تعصب اور گمراہ کن تصورات بھی
 ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں 90ء کی دہائی میں پہلی بار ڈاکٹر مبارک علی سے گوئے انسٹی ٹیوٹ
 لاہور میں ملا۔ ڈاکٹر مبارک علی یہاں بطور ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اس ملاقات سے
 قبل میرا بھی ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں وہی روایتی تصورات جو دائیں بازو کے مذہبی لوگوں کے
 خیالات ہوتے ہیں۔ ہمیں ابترہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ لبرل وریٹیکولر خیالات کے لوگ لادین ہوتے
 ہیں۔ مذہب اور خدا کے بارے میں ان کے تصورات گمراہ کن ہیں اور ان سے دور رہنا چاہیے۔ اس
 خیال کو مضبوط بنانے میں ہمارے کچھ برسر، روشن خیال اور سیکور دوستوں کا بھی کام تھا، جو ہمیشہ سے
 مذہب اور خدا کے بارے میں تعصب پر مبنی گفتگو کیا کرتے تھے۔ پہلی بار ہمیں سیکولر ازم کا مطلب خدا
 کے وجود سے انکار کا دیا گیا تھا۔ اس لیے جب میری ڈاکٹر مبارک علی سے ابتدائی ملاقات ہوئی تو
 کچھ اسی طرز کے خیالات میرے ان کے بارے میں بھی تھے۔

میرے مرحوم والد عہد الکریم عابد جو دائیں بازو کی پاکستانی صحافت کے چند بڑے صحافیوں میں
 شمار ہوتے تھے۔ دائیں اور بائیں بازو کے صحافتی اور دانشوروں کے حلقوں میں ان کی رسائی خوب تھی۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے ڈاکٹر مبارک علی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر ان سے بھی کیا تھا۔ میرے لیے یہ بات بڑی حیرانگی کی تھی کہ میرے والد کے خیالات ان کے بارے میں بہت شاندار تھے۔ مجھے انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر مبارک علی پاکستان اور ہندوستان میں تاریخ نویسی کے حوالے سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے۔ ان کے بقول میں ڈاکٹر مبارک علی کے بہت سے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا، لیکن ان کی علمی صداقت کا اعتراف کرتا ہوں کیونکہ وہ لکھتے وقت کسی شخصیت اور ادراہ سمیت کسی کے بارے میں تعصب کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ میرے والد کے خیالات نے مجھے عملی طور پر ان کے قریب کرنے اور بار بار سننے میں حاضی تحویت دی۔ اور میں ڈاکٹر مبارک علی سے پہلی ملاقات کے پیچھے ایک ہنس منظر بھی ہے۔ ہمارے دوست پروفیسر ڈاکٹر ندیم عمر، بلال احمد اور اسد جہاں ایڈووکیٹ جو اس وقت 90ء کی دہائی میں ہماری سرگرمی کے سبب علم تھے۔ ان دوستوں نے لوجوانوں کی سطح پر کام کرنے کے حوالے سے بیک تھنکرز فورم کی بنیاد ڈالی۔ اس فورم کے اجلاس کو سنئے انسٹی ٹیوٹ میں ہوتے تھے اور ہمیں بھی ان اجلاس میں شرکت کا موقع ملتا تھا۔ اگرچہ بعض اوقات ان فورمز میں، مگر بڑی زبان کا بہت زیادہ استعمال ہوتا تھا، جو میرے جیسے لوگوں کے لیے سمجھنا خاصہ مشکل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی بھی ان اجلاس میں خصوصی پیچکرز دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اردو زبان میں اور وہ بھی آسان انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی کو سنئے انسٹی ٹیوٹ میں ہمیں اجوکا تھیز کے ڈرامے بھی دیکھنے کو ملے جو ڈاکٹر مبارک علی کی مدد کے ساتھ اس ادارے میں ہوتے تھے۔ یہیں پر ہماری ملاقات اقبال احمد خان سے بھی ہوئی جو ڈاکٹر مبارک علی کے دوستوں میں سے تھے۔ وہ ڈاکٹر مبارک کی خواہش پر پاکستان آئے اور ڈاکٹر صاحب کے بقول وہ تو بھارت چانا چاہتے تھے، لیکن میں نے انھیں پاکستان میں کام کرنے پر آمادہ کیا۔ ڈاکٹر مبارک علی ان لوگوں میں سے تھے جو نو جوانوں کی ہمیشہ سے حوصلہ افزائی کرتے اور جہاں بھی نوجوان طبقہ ان سے مدد مانگا، انھیں دعوت دیتا وہ بالکل فلف آجایا کرتے تھے۔ آج جب میں پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بیک تھنکرز فورمز جیسے دروں کی راہنمائی کر کے ہمیں آگے بڑھنے اور کچھ سیکھنے اور سمجھنے کے خوب مواقع فراہم کیے۔ لیکن یہ فورمز اپنے داخلی مسائل کی وجہ سے زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا اور ڈاکٹر مبارک علی سے رابطے کا سلسلہ بھی ٹوٹا گیا۔

میرے اور ڈاکٹر مبارک علی کے مشترکہ دوست عزیز سندھی مرحوم بھی کمال کی شخصیت تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ہر ہفتے باقاعدگی سے مزنگ میں فلکشن ہاؤس میں بیٹھتے ہیں اور کوئی

بھی اس محفل کا حصہ بن سکتا ہے۔ یہاں پھر ڈاکٹر مبارک علی سے رابطوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا اور کثرتِ وقت یہاں آنے کے لیے مجھے عزیز سندھی ہی پابند کیا کرتے تھے۔ یہیں فلکشن ہاؤس سے ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کیا، اکثر کتابیں رانا عبد الرحمن مجھے گفت میں بھی دیا کرتے تھے۔ میری دلچسپی کا، ہم محور کیونکہ سیاست تھا، لیکن ڈاکٹر مبارک علی بہت کم عملی سیاست اور روزمرہ کے سیاسی مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ زیادہ علمی موضوعات کو اپنی گفتگو کا حصہ بنایا کرتے تھے، لیکن وہ ہماری سیاسی معاملات پر گفتگو سنتے بھی تھے اور اس پر مختصر تبصرہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی ہفت روزہ نشست فلکشن ہاؤس سے امجد سیم منہاس کے سانچہ پیپیشنر میں منتقل ہوئی اور اب یہ نشست ہفت روزہ نیرنگ گیسٹری میں جاری ہیں۔ اس محفل میں رقم سمیت سیم گورد سپوری، قاضی جاوید، شہزاد احمد، رفاقت علی، شہرہ دیشیر ایڈووکیٹ، زمان خان، ڈاکٹر انیس، مام محمود مرزا، ڈاکٹر صاحب کی سربراہی میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر مبارک علی کا ہی کام ہے کہ یہ محفل ان ہی کی وجہ سے قائم و دائم ہے۔ وہ اس محفل کی حقیقی رونق ہیں اور اس کا تسلسل کے ساتھ آتا بہت سے لوگوں کو بھی آنے پر پابند کرتا ہے۔ میں، ہور میں ہوں اور ہفتے کا دن ہو تو پہلی کوشش ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقات ہی کی ہوتی ہے۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ اس محفل کے دوستوں اور بالخصوص ڈاکٹر مبارک علی سے بہت کچھ سیکھنے کو مل اور مل رہا ہے جس نے عملی زندگی میں مجھے کافی مدد فراہم کی ہے۔ یہ نشستیں اگرچہ غیر رسمی ہوتی ہیں، لیکن کچھ نوک محمود کے باوجود سیاسی، سماجی، تاریخی، مذہبی، سائنسی اور بین الاقوامی تعلقات کا مد کے موضوعات پر گفتگو بہت خوب ہوتی ہے اور بالخصوص ڈاکٹر صاحب کی موجودگی مکالمہ کی فضا کو برقرار رکھتی ہے۔ ایک نیا سلسلہ ڈاکٹر مبارک علی کی خواہش پر ایک منتخب کردہ کتاب پر گفتگو کا بھی رکھا جاتا ہے۔ اس گفتگو میں حصہ لینے کے لیے یقیناً پہلے کتاب پڑھنا ہوتی تھی اور کتاب کو پڑھتے بغیر اگر کوئی تبصرہ کرے تو ڈاکٹر صاحب کی ناراضگی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی بنیادی طور پر مکالمہ کے حامی ہیں۔ وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کسی دھم کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ان کی شخصیت کے پہلو میں ان کی عاجزی کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ وہ دوسروں پر اپنی رائے ٹھونسنے کی بجائے ہر طرح کے خیالات اور افراد کا احترام کرتے ہیں۔ مجھے ڈاکٹر مبارک علی کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مکمل سچ نہیں سمجھتے، بلکہ اپنے خیالات کی اصباح میں بھی پیش پیش ہوتے ہیں۔ وہ گفتگو اور مکالمہ میں جذباتی انداز اختیار نہیں کرتے، بلکہ ان کا انداز منطقی اور دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی دل کی بات سے اتفاق نہ کرے تو وہ اس سے اٹھنے کی بجائے خاموش رہتے

ہیں۔ ان کے بقول ہمیں اس طرز عمل سے گریز کرنا چاہیے کہ ہر کوئی ہماری بات کو سچ سمجھے۔ بہت سے لوگ ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں غلط تصورات رکھتے ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ ان کے بارے میں سنی سنائی باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن جب لوگ ان سے ملتے ہیں تو کچھ وقت گزارتے ہیں تو ان کے خیالات اور تصورات میں فرق بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ کسی بھی مذہب، فرقہ، برادری اور سنیات کی بنیاد پر شخص اور عقائد پر یکجہرا چھلانے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ جو لوگ ادنیٰ آدمی میں ان سے بات کرتے ہوئے جھگڑے کا انداز اختیار کرتے ہیں اس پر ڈاکٹر صاحب کی خاموشی بھی کمال کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے خیالات کو پیش کرتے ہوئے کسی عیسیت کا شکار نہیں ہوتے۔ جو لوگ ان کی تحریریں پڑھتے ہیں وہ یہ اعتراف کریں گے کہ ان کی زبان و فہم بہت سادہ اور آسان ہے۔ حالانکہ وہ تاریخ کے استاد ہیں، لیکن اس سے باوجود وہ مشکل بات کو آسان انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھوں نے تاریخ نویسی کا جو انداز بنایا ہے وہ کم تاریخ دانوں کے حصہ میں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ 2011ء میں مجھے ان کے ساتھ کوئٹہ جانے کا موقع ملا وہاں جس انداز میں کوئٹہ کے لوگوں اور بالخصوص نوجوان طبقہ نے ان کی بڑی پزیرائی کی۔ اہم بات یہ تھی کہ نوجوانوں نے ان کی بیشتر کتابیں پڑھی ہوئی تھیں اور ان کا حوالہ بھی ان لوگوں نے اپنی گفتگو میں کیا۔ ڈاکٹر مبارک علی کوئٹہ کے اس دورے میں خود بھی حیران تھے وہ ان کے بقول انھیں اندازہ نہیں تھا کہ لوگ ان کو پڑھتے بھی ہیں اور محبت بھی کرتے ہیں۔ کسی طرح گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں ایک ٹی وی ٹاک شو کی ریکارڈنگ سے ہم اکٹھے ہا ہر نکلے، تو ڈاکٹر صاحب نوجوان طبقہ کا تہنیت کرنے لگے کہ یہ لوگ ہر ایک کی باتوں پر توجہ دیتے ہیں۔ اسی شام میں آجہ نوجوان ہمارے پاس آئے اور ڈاکٹر صاحب سے "ٹوگراف" مانگے، لیکن ان کے الفاظ مجھے یاد ہیں ان کے بقول ڈاکٹر صاحب آپ ہال میں موجود لوگوں کی جذباتیت و رتائیوں کو زیادہ اہمیت نہ دیں۔ ہم آپ کے قاری ہیں اور بہت شوق سے آپ کی تحریروں کو پڑھتے ہیں اور آپ ہمارے قومی عملی اگاہ ہیں۔ یہ الفاظ ڈاکٹر مبارک علی کی علمی صلاحیتوں کا عملی اعتراف تھا جو بہت کم لکھنے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ بہت ہی بات کر کے اپنا مقدمہ پیش کرنے کے عادی نہیں۔ ان کے مضامین، ورن میں موجود تحریریں مختصر اور جامع ہوتی ہیں، در زبان کی شگفتگی کا بھی وہ خاص خیال رکھتے ہیں۔ جو بھی قاری ان کی کتاب کا مطالعہ شروع کرے گا وہ ایک ہی سانس میں کتاب پڑھنے کو ترجیح دے گا، کیونکہ کتاب کا ربط آپ کو مکمل کتاب پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ طلبہ سیاست، سیاسی جماعتوں کے

داخلی مسائل، جمہوری تشادات، بیرونی امور، چاگیردارانہ طبقہ کے مسائل، موروٹی سیاست، مزاحمت کی سیاست، انتخابی پینڈی، دہشت گردی، تعلیمی زوال، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، طرز حکمرانی، عورت اور تاریخ، سماج معشرے کا لہجہ، دانشوروں کا بحران، تاریخ کے نئے زوایے، پاکستانی معشرہ پر ان کی تحریریں، جواب ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان کی بیشتر کتابیں ہمارے تعلیمی نصاب کا حصہ نہیں۔ ہم نے بہت سے ایسے مجھے کہنے والوں کو اپنی تعلیمی زندگی سے دور کیا ہو ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کیونکہ ریاست کے دانشور یا مصنف نہیں، وہ عوام کو سامنے رکھ کر اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہم نوجوانوں پر لوگ ان کو بطور مقرر دیتے تو ہیں، لیکن ان کی صاف گوئی سے ناراض بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بات کرتے وقت کسی بھی مصمت پسندی کا شکار نہیں ہوتے۔ جو بات وہ سچ سمجھتے ہیں اس کا اظہار کرنا بھی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب بہت سے لوگ ان کو جاننے سے میل خوب سوچتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی بنیادی طور پر بریں اور سیکور خیالات کے حامی ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ دائیں اور بائیں ہارو کے بہت سے لوگ انھیں اپنے لیے خطرہ بھی سمجھتے ہیں۔ دائیں ہارو کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن بائیں ہارو کے لوگ ان کی سچی اور کھری باتوں سے اکثر ناماں رہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر مبارک علی ان باتوں میں انھیں کی بجائے اپنے کام میں تگن رہتے ہیں ورنہ اپنے اوپر ہونے والی تنقید کو بھی کھسکے دس سے قبول کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے بہت سی کتابیں اردو میں لکھی ہیں جو ہم جیسے لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں، لیکن آج کل ان کی ہفتہ وار تحریریں زیادہ تر مگر بڑی اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اردو اخبارات میں اس طرز کے لکھنے والے لوگوں کے لیے بہت زیادہ حادہ حالت سازگار نہیں۔ حالانکہ اگر اردو اخبارات میں ان کے مضامین تواتر سے شائع ہوں تو یہ لوگوں کی علمی و فکری صلاحیتوں کو بڑھانے میں کافی مدد فراہم کر سکتی ہے۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی ادارت میں ایک مجلہ "تاریخ" کے نام سے بھی گزشتہ کئی برسوں سے جاری رکھا ہو ہے۔ اس مجلہ میں بہت ہی تحقیقی مضامین ہوتے ہیں اور موضوعات کی بنیاد علمی اور فکری ہوتی ہے۔ اس مجلہ کی کم وسائل کے باعث تشہیر بہت زیادہ نہیں ہوتی لیکن مجلہ بہت کماں کا ہوتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر مبارک علی برسوں کا قاعدگی سے کسی نہ کسی شہر میں تاریخ کے موضوع پر قومی کانفرنس کا انعقاد بھی کرتے ہیں جو ان کی بڑی قومی خدمت کے زمرے میں آتی ہے۔ میں نے ۱۹۸۰ء مبارک علی کو ہمیشہ اس وقت بہت زیادہ دکھی پایا جب وہ پاکستان کے تعلیمی زوال کی کہانی پیش کرتے

ہیں اور جس انداز سے ہماری یونیورسٹیوں میں بگاڑ پیدا ہو اس کی ایک وہ کھل کہانی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کے بقول پاکستان میں نوجوان طبقہ کے ساتھ تعلیم میں بہت ظلم ہوا ہے۔ ایک دفعہ میں نے پاکستان میں ڈاکٹر عطاء الرحمن کے تاحظر میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن کا ماتم کیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب جس ملک میں پرائمری نفاذ میں پچھڑا ہو وہاں ہائیر ایجوکیشن کمیشن نہیں بلکہ پرائمری کمیشن کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے میری بات سے اتفاق بھی کیا اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر پرائمری ایجوکیشن کی بندر بانٹ کا بھی خوب ماتم کیا۔ وہ تعلیم کی بیکاری پر بھی اپنا سخت موقف رکھتے ہیں اور ان کے بقول "مران کے دور میں تعلیم اتنی مٹی ہوئی تو شاید ان کے ویران نہیں تعلیم نہیں دے سکتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ پاکستان کی ریاست اور حکمران طبقات ڈاکٹر مبارک علی کی علمی صلاحیتوں سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکے جس کے ڈاکٹر صاحب مستحق تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی بنیادی طور پر سمجھوتے کے آدمی نہیں۔ وہ اپنے اصول، خیالات اور نظریات پر کھڑے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ان کے حالات زندگی پر مبنی آپ بیتی پر دونوں کتابیں "دردِ رٹھو کر کھائے" اور "میری دنیا" پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اپنے اصول اور نظریات کی اس جنگ میں علمی طور پر انھوں نے کیا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ایک در سے دوسرے در کا سفر میں اپنی ناپستی اور خود ری سمیت دیانت کو سنبھالنا ان کے جانے والوں کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ وہ محققین میں کام کرنے کے عادی نہیں اور جہاں انھیں محققین کا احساس ہوا وہاں انھوں نے ہٹا ستر تبدیل کرنے میں کسی بھی طرح کی کوئی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سادگی اور قناعت پسندی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور ان کے بقول اگر انسان کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اسے حالات و واقعات کے دائرہ کار میں رہ کر جینا سیکھنا چاہیے۔ ہمارے یہاں بہت سے اچھے دانشور موجود ہیں، لیکن مجھے جو چیز ڈاکٹر مبارک علی میں متذکر کرتی ہے وہ ان کی اخلاقی معیارات اور قدریں ہیں۔ آج اخلاقیات کے سوال کو ہمارے اہل دانش نے محض مذہب کا مسئلہ سمجھ لیا ہے در جب کبھی کوئی اخلاقی پہلو پر بات کرے تو اسے مذہبی ہونے کا طعن دیا جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر مبارک علی کے بقول اخلاقیات اور دیانت کے پہلو کے بغیر آپ کچھ بھی ٹھیک نہیں کر سکتے، کیونکہ معاشرے کو بنانے کے لیے جو بنیادی اصول درکار ہوتے ہیں ان سے خرف کر کے آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے علم کے فکری میدان میں جو عملہ دارہ گردی کی ہے اس کی تعداد مثالیں ہمیں ان کی دونوں آپ بیتی میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ ایک اور اہم پہلو ڈاکٹر مبارک علی ہمارے ان اہل دانش میں سے نہیں جو مغرب سے بہت

زیادہ مرعوب ہیں۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں نظاموں کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکے ہیں اور کسی تعصب کے بغیر دونوں نظاموں کے اچھے اور برے پہلوؤں کو کھلے عام تسلیم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ میرے تعلق کا یہ سلسلہ جاری ہے اور ہمیشہ ان سے مل کر ایک انجانی سے خوشی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس احساس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اپنی کم علمی کے باعث میں ان خوش نصیبوں میں ہوں جو ڈاکٹر مبارک علی کی قربت سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر مبارک علی کا رویہ میرے ساتھ بہت شفیق کا ہے اور جب کبھی ان سے ڈانٹ بھی پڑی تو اس میں بھی محبت اور شفقت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ بڑے آدمی کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ عجزی کے ساتھ اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ خوبی ڈاکٹر مبارک علی میں موجود ہے۔ میں اپنے آپ کو اس لحاظ سے بھی خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میں ڈاکٹر مبارک علی کی شخصیت پر کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ ہمت اور حوصلہ بھی ڈاکٹر مبارک علی نے ہی دیا ہے، ورنہ ان کے بارے میں کچھ لکھنا بہت مشکل ہوتا۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ میرا تعلق ہمیشہ برقرار رہے اور میں ان کی صحبت سے اور بہت کچھ سیکھ سکوں۔ پٹی بات ڈاکٹر مبارک علی کی اس تحریر پر ختم کرتا ہوں جو ان کی عظمت کی دلیل دیتی ہے۔ ان کے بقول "میرا سرا یہ میری تحریریں ہیں۔ ان تحریروں کے پس منظر میں میری جدوجہد اور میرا علم ہے۔ علم کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں تکمیل حاصل کر لی ہے کیونکہ بقول کارل پوپر My Knowledge Increase my Ignorance یعنی جتنا علم حاصل کیا جاتا ہے اسی قدر اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر مبارک علی کا تاریخی کارنامہ

افضل رحمان

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی فرد ہو یا قوم، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کوئی لکھ کہے کہ ہمیں ماضی سے نکل کر محض حال کی بات کرنی چاہئے، افراد کے لئے تو شاید اس کی کچھ گنجائش ہو، لیکن قوم کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ یہ تینوں ادوار آپس میں گہرے مربوط اور باہم پیوست ہوتے ہیں۔ بہر حال زندہ قوم کی یہ خوش بختی ہوتی ہے کہ وہ ماضی کے تجربات سے روشنی میتے ہوئے اپنا حال اس طرح بہتر بناتی ہیں کہ نظر مستقبل کے ٹارگٹ پر رہتی ہے، جبکہ پسندہ اقوام کی نظر ماضی کی طرف اور پیچھے مستقبل کی جانب ہوتی ہے۔ وہ یہ تو ماضی کے معذرت و مسائل پر الجھتی اور جھگڑتی رہتی ہیں یا اسے افسانوی رنگ دے کر اس پر اتراتی اور داد و تحسین کے ڈنگے بجاتی رہتی ہیں، جس کی آؤٹ پٹ سوائے قومی تفاخر کے اور نیچے اقوام دیگر سے آویزش کے اور کچھ نہیں ہوتی۔

ایسی اقوام جی ٹی نسلوں کے نئے تاریخ بناتی ہوں یا نہ بناتی ہوں، اہستہ تاریخ بگاڑتی ضرور ہیں، جس میں حسب ذوق و ضرورت من پسند نمک مصالحوں کو خوب لگائے جاتے ہیں۔ قومی ذوق کی مطابقت میں جو شخص اس مصالحوں بازی کے فن میں زیادہ مہارت رکھتا ہے، وہ اس قوم کا بڑا محقق تسلیم کر لیا جاتا ہے اور جو حقائق کو حقائق مانتے ہوئے، اس ہیرا پھیری کی بجائے صہیت سامنے رکھ کر اپنی قوم کو کچھ کی کے آئینے میں اصل چہرہ دکھاتا ہے، وہ ناپسندیدہ قابل مذمت قرار پاتا ہے۔ کسی کی خواہشات اور آرزوؤں سے حقائق بظاہر سرخ تو کئے جاسکتے ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ اپنی جگہ موجود رہتے ہیں، جب بھی تاریخ کا کوئی محقق تحقیق کی بازی لگائے گا تو وہ نہیں حاضر موجود پائے گا۔ مگر جذباتیت سے ہٹ کر حقیقی کارکردگی کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو وطن عزیز میں اس نوع کا تاریخی محقق ہمیں ڈاکٹر مبارک علی کے نام کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، جنہوں نے تاریخ نگاری میں حقائق کو جانچنے کے نئے

سائنسی نکتہ منسوب کو بھی اپنا روحنا اصول بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

”ہمارے ہاں تاریخ نویسی تین قسم کی روایات پر مبنی ہے، ایک وہ جو صوفیاء کے کشف و کرامات کے زیر اثر لکھی جاتی ہے، اس کے ابتدائی نمونے ہم ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں بھی دیکھتے ہیں، جب مریدوں نے اپنے مرشدوں کی تاریخ لکھی تو ہر کارنامہ ان سے منسوب کر دیا۔ محمود غزنوی شہاب الدین غوری اور بعد میں آنے والے سلاطین کی تمام فتوحات اس قسم کی تاریخ میں ان ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں۔ ان تاریخوں میں خواب بھی ہیں، فیسی اشارے بھی ہیں اور پیروں کی روحانی طاقت و قوت کا اظہار بھی۔ دوسری قسم کی تاریخ وہ ہے جو داستانوں، افسانوں اور شاعری کی صورت میں ہے۔ اس میں شاعر و افسانہ نگار اپنے تخیل کی مدد سے حقائق کو افسانوی بنا کر لوگوں کے لئے دلکشی کا باعث بنادیتے ہیں۔ اس میٹھ میں اس قدر جا ذہیت ہوتی ہے کہ لوگ اصل حقائق کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے ہیں۔ تاریخ کی تیسری قسم وہ ہے، جسے سائنس کہہ جاتا ہے۔ اس میں اول واقعات کا تعین کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی شہادتیں اکٹھی کی جاتی ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا شہادت اس واقعہ سے کوئی مطابقت رکھتی ہے یا نہیں“

پسماندہ معاشروں کی تاریخ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے، وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں ”پسماندہ معاشروں کا یہ یہ ہے کہ ان کے ہاں نظریات و افکار اور خیالات سے زیادہ شخصیات پر زور دیا جاتا ہے اور انہیں اس قدر مقدس و متبرک بنالیا جاتا ہے کہ ان کا کہہ ہوا ہر غلط درست تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخصیت اس مرحلے پر پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے نام سے منسوب کر کے یا اس کے بیانات و خیالات کو سر کے یہ ستاروں اور رہنما اس سے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ یہی صورت پاکستان میں قائد اعظم کی ہے، جنہیں دائیں اور بائیں بازو کے لوگ اپنے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ دونوں کی تقریروں اور بیانات سے اپنے مطلب کی باتیں ڈھونڈ لیتے ہیں، جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ شخصیت سے علیحدہ ہو کر نظریات و افکار کی بنیاد پر لوگوں کے ذہنوں کو بدلا جائے، کیونکہ شخصیت ایک عہد و وقت کی پیداوار ہوتی ہے، جبکہ زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ نظریات و افکار بھی وقت کے تقاضوں کے

تحت تشکیل پاتے رہتے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخصیت معاشرے کے ذہن و دماغ پر چھا جائے تو پھر نئے خیالات تخلیق نہیں ہوتے اور معاشرہ محض تقلید کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔“

ہمیں ڈاکٹر صاحب کے متذکرہ بالا نتیجہ و فکر سے اس وجہ سے بھی اتفاق ہے کہ ہمارے سماج میں شخصیات کے بت بنانے کی ریت ختم ہونے کا نام ہی نہیں ہے رہی۔ مرد واقعہ یہ ہے کہ ایک بت اگر پرانا ہو کر ذرا سی صدی پڑتا ہے تو بہت سی دیگر ”ہستیاں“ اس نظر میں بیٹھی ہوتی ہیں، بلکہ ان کی زندگی بھر کی کاوشوں کا محور ہی یہ اپروچ رہتی ہے کہ انہیں بھی قوم میں ایک بڑے بت کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اپنی شخصیت بنانے اور منوانے کا داعیہ و چمکا یہاں نظریہ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ان دیکھی

الوہی وحدت کے دعویداروں نے بت تراشی کے فن میں ہر قوم کو مات دے دی ہے۔ مغرب کی ترقی پر ہزار تنقیدوں کے باوجود کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی سوسائٹی سے ایسے ہر بت کو پاش پاش کر دیا ہے، اپنی پوری تاریخ میں کوئی بھی شخصیت تنقید سے بااثر نہیں رہے دی، حتیٰ کہ Jesus Christ جیسی ہستی کی الوہیت کو بھی کھسے عام چیلنج کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ شخصیات کا احترام، اپنی جگہ لیکن تنقیدی جائزہ دیتے ہوئے وہ کچھ کہہ جاتا ہے، جس کا ہمارے ہاں تصور کرتے ہوئے بھی روح کا پھٹے لگتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ وحدت کا سب سے بڑا چارک اس وقت مغرب بن چکا ہے جو کسی الوہی شخصیت کا عکس انسانی وحدت کی صورت میں سامنے لا رہا ہے، اگرچہ ہنوز اس کے اہداف محدود ہیں، لیکن آزادی، اظہار اور حرمت فکر نے نظریاتی اذہاں سے شخصیتوں کا مقایہ کرتے ہوئے عظمت نسبی کا وہاں منوا سیا ہے، جبکہ اپنی حالت یہ ہے کہ ہم آج بھی تاریخ کے پیروکار ہیں، ہم تاریخ کی فداں بڑی ہستی کے دشمن ہو، اس لئے میں تمہارا دشمن ہوں، تمہیں برداشت نہیں کر سکتا، جمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم ”جمل“ اور ”صفین“ کے معرکے آج بھی اپنی مساجد اور امام بارگاہوں میں لڑ رہے ہیں۔ گزرے ہوئے علقہ کرداروں کے لئے زندہ انسانوں کو مار رہے ہیں۔ مظلوم دکھی عورتوں کو بیوگی، در معصوم بچوں کو یتیمی بانٹ رہے ہیں یا پھر مخصوص دوار کے نظریات کو بزرگ منوانے کے لئے پوری دنیا کا سکون برباد کئے ہوئے ہیں۔

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو ہمیں موجودہ تمام فتنوں اور فسادات کی جڑیں ماضی کی اس تاریخ میں ملیں گی، جو ہم نے اپنے مخصوص مقصد کے تحت بڑی افسانوی بنا رکھی ہے، جس پر کئی نادان و فساد نگاروں، عالمی ذاکروں اور قومی مشاہروں نے جذباتیت کے تہہ در تہہ چڑھا رکھے ہیں اور مرجع مصالحت سے حقائق کو کیا سے کیا بنا رکھا ہے اور اقوام دیگر کے خلاف نفرتوں کے طوفان اٹھا رکھے ہیں۔

اگر آج بھی ہم اپنے بچوں کو یہ پڑھائیں گے کہ مہاتما گاندھی مکار تھا اور ہندو بحیثیت قوم دھوکے باز، تو پھر اپنی نئی نسلوں کو کون سی رواداری و انسان نوازی سکھا رہے ہوں گے؟ اور یہ تاریخ کی کون سی خدمت ہے؟ ظاہر ہے جب کسی خطے میں دو مخصوص اقوام کے مفادات کا حریف نہ کرنا ہوگا تو اس میں اپنی بہتری کے لئے سیاسی چالیں بھی چلی جائیں گی۔ خود مسلمانوں کے اندر عربوں، مسیحیوں اور عجمیوں (ایرانیوں) کے درمیان کچھ نہیں ہوا؟ تو کیا دوسری قوم کو ابدی حریف بنانا ضروری ہے؟ باز قراردادے دیا جائے، جبکہ پہلے، دھوکے تو ہر قوم میں ہر وقت موجود ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کی بھی کی نہیں ہوتی۔ کیا مہاتما گاندھی وہی ہندو رہنما نہیں ہیں، جنہوں نے پاکستان اور مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دی، اس کے باوجود ہمارے بچوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ گاندھی جی مکار تھے، بلکہ ”جی“ نکلتا بھی ہماری طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔ اس اصول پر دنیا بھر کی باہم حریف اقوام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اظہار من اظہار ہو کر ہمارے سامنے آئے گی کہ محض سیاسی و مذہبی مفادات و اختلافات کے کارن اکثر و بیشتر تاریخ کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فلسطینی بچوں کو پہلی کلاس سے ہی جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، اس کے مطابق یہودی دنیا کی ذلیل ترین اور خداوند کی ہمیشہ کے لئے مغضوب قوم ہیں۔ پیسے دن سے جن کے کھاتے میں نیکی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

جب تاریخ کی کتابوں کو اپنے مخصوص مقصد کے رنگ میں رنگتے ہوئے اپنے بچوں کے معصوم ذہنوں میں اتارا جائے گا تو وہ اذہان بھی کبھی نارمل انداز میں با مقابل قوم کی خوبیوں اور خامیوں کا سائنٹفک جائزہ نہیں لے سکیں گے۔ بلاشبہ یہ عمل دو طرفہ ہے، با متقابل بھی یہی کارنامے سرانجام دیئے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً امریکہ جیسی طاقت کا اقوام عالم کی معاونت میں وہاں ہاروڑ میپ بھی سپینڈ پکڑے سے قاصر رہ جاتا ہے اور بزرگ کردائی گئی، کسی کسی کامیابی کے بعد ”گے چل کر یہ ابدی نفرت با معصوم کون سا روپ دھارے گی؟۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم تاریخ کو سچ کرنا چھوڑ دیں۔ ہر قوم کے ساتھ جہاں ماضی کی تغیاں ہوتی ہیں، وہاں کچھ شیرینیاں بھی ہوتی ہیں، کچھ امن کے معاہدے اور دوستی کے وعدے بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں ہر وقت گندمی مکھی کی بجائے کبھی شہد کی مکھی جیسا طرز عمل بھی اپنا کر دیکھ لینا چاہئے۔ اس سے آؤٹ پٹ خود بخود دیکھی ہو جائے گی۔ پھر ہر وقت ماضی میں جھگڑنے کی بجائے کبھی مستقبل کی جانب بھی اپنی منزل تلاش کرنے کے لئے دیکھنا چاہئے کیونکہ منزل ماضی میں نہیں، ہمیشہ مستقبل میں ہوتی ہے۔ ہماری نظر میں ڈاکٹر

مبارک علی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جنوبی ایشیاء کی تاریخ کو بگاڑنے یا سنوارنے کی بجائے، جیسی وہ ہے بلا کم و کاست، بغیر کسی قطع و برید، کاٹ چھانٹ یا صیغہ کاری کے نئی نسلوں کے سامنے پیش کرے کی کوشش کی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس خطے کی تاریخ کو صیغہ ہونے سے بچایا ہے اور ہماری یہ آرزو ہے کہ وہ مختلف متنوع ادوار کی اسلامی تاریخ کو بھی اسی اسلوب اور نقطہ نظر کے ساتھ نوجوان نسلوں کے سامنے لائیں۔ موجود تو سب کچھ ہے، اصل مسئلہ خالص اور نایاب موتیوں کو کھنگال کر اپنی اصلی حالت میں سامنے لانا ہے۔

مجھے ن کے اس نقطہ نظر سے بھی پوری طرح اتفاق ہے کہ ہم نے قائد اعظم کی شخصیت کو بھی اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر تحریف کے زور سے صیغہ کر کے قوم کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسے معصوم نہیں کہ قائد انگریزی زبان بولتے تھے، انگریزی لباس پہنتے تھے، مغربی اطوار اسلوب رکھتے تھے اور روایتی معنوں میں کوئی مذہبی شخصیت نہ تھے لیکن ہم اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گویا وہ سوتے بھی شہروانی میں تھے اور ان کے ماتھے پر ہی نہیں مصلے پر بھی خراب پڑ گئی تھی۔ قائد تو سننے بچے اور کھرے انسان تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی سیاسی مفادات کے لئے بھی پارسیائی کے دھوے نہیں کئے۔ قائد اعظم کے متعلق یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپوزیشن کو قطعی برداشت نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کے ارد گرد جو لوگ تھے، وہ ان کے رعب میں رہتے ہوئے اکثر خاموشی ہی اختیار کرتے تھے۔

اسی وجہ سے پاکستان بننے کے بعد ہر ایک نے یہی کہا کہ پاکستان محض ان کی ذہانت اور وکاست کی بناء پر بنا۔ پاکستان بننے کے بعد جب وہ گورنر جنرل بنے تو انہوں نے اس کا صاف طور پر اظہار کیا کہ وہ برائے نام گورنر جنرل نہیں رہنا چاہتے، اس لئے 1935ء کے ایکٹ میں تبدیلی کر کے اس کے اختیارات کو وسیع کیا گیا۔ ورنہ اختیارات کو استعفا کرتے ہوئے انہوں نے سرحد کی صوبائی حکومت کو توڑا اور ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ اسی کے تحت سندھ میں کھوڑو کو چیف منسٹری سے معزول کر دیا۔ وہ گورنر جنرل بھی تھے اور دستور ساز اسمبلی کے صدر اور مسلم لیگ کے سربراہ بھی کچھ لوگوں نے تو انہیں ”شہنشاہ پاکستان“ کہنا بھی شروع کر دیا تھا اور کراچی میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، ورنہ انہیں امیر المومنین کا خطاب دیا گیا۔

ہم ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹر عصفور محمود سے ہونے والی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ قائد نے یہ کہا تھا یا نہیں کہ ”پاکستان انہوں نے اور ان کے نائب رائٹر نے بنایا تھا“ یا یہ کہ ”ان کی جیب میں چند

کھوئے پتے ہیں۔“ علی نقطہ نظر سے دونوں صاحبان نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے قومی، خبرات میں شائع ہو چکا ہے، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے کوئی بھی شخص اس بحث کو پڑھ سکتا ہے، اب اسے عوامی سطح پر ہم نے ان دونوں فقروں کو زبان زد عام و خاص پایا ہے، بالخصوص ایوان کارکنان تحریک پاکستان کی مختلف تقاریب میں ہم نے تحریک پاکستان کے جن کارکن کو بھی شہ ہے، وہ اپنے خطاب میں ان ہر دو فکروں کا استعمال بہتات کے ساتھ کرتے رہے ہیں، لیکن یہ کوئی کارآمد موضوع نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ شخصیات کو صیغہ کرنے کی بجائے واقعات و حقائق کے تناظر میں پرکھا اور سمجھا جائے اور شخصیات سے زیادہ نظریات پر غور فرمایا جائے۔

نوٹ: افضل رحمان صاحب نے ڈاکٹر مبارک علی کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اور تاریخ کے بارے میں جو اپنا نقطہ نظریہ بیان کیا ہے، اس میں کئی شکلتے ایسے ہیں جنہیں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ قائد اعظم کی شخصیت کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بھی تاریخی حقائق سے لگا نہیں کھاتا۔ افضل رحمان صاحب نے جو بھی لکھا ہے، اسے خط بحث کی مثال ہی کہا جائے گا۔ اس بارے میں انشاء اللہ جلد میں اپنی معروضات بھی پیش کر دوں گا۔ (ایڈیٹر)

ڈاکٹر مبارک علی — تاریخی دنیا کا درویش

امرتا تھ مونٹول ایڈووکیٹ
وائس چیئر پرنسپل ایچ آر سی پی سندھ

میں ڈاکٹر صاحب کو درویش نہ کہوں تو کیا صرف تاریخ دان کہوں۔ جو شخص ناصر فیض کی تاریخ لیکن ساتھ میں یورپ اور باقی دنیا کی تاریخی مصوہات کا بے بہ خزانہ اپنے سینے میں سموئے ایک پھل درویش کی طرح بڑے ہی پیارے جھکاؤ کے ساتھ چل رہا ہو، وہ ایک درویش ہی ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے نام نہاد اسکالروں کیلئے لیکن ڈاکٹر جیسا تاریخ دان اور ادب کی جانکاری رکھنے والا نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا شرف مجھے میرے دوست سید شمس الدین کے ذریعے حاصل ہوا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بڑے دھیمے درویشوں کے واسطے بچے میں باتیں کرتے ہوئے تے۔ جو بھی تاریخی بات کی بڑی اصل، صداقت اور حقیقت سے بھرپور تھی۔ پہلے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں چھپنے والے مضامین کو بڑے غور سے مطالعہ کیا جب میں نے ڈاکٹر صاحب کی روزنامہ ڈان میں پاسٹ اینڈ پریزنٹ کالم کے تحت مختلف عنوانوں سے آرٹیکلز پڑھے تو ان کی تاریخی اور ادبی مصوہات کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ 16 اپریل 2008ء کے آرنیکل "Why we need heroes?" (ہمیں ہیروز کی کیوں ضرورت ہے؟) 28 جون 2009ء کے آرنیکل "Shades of Violence" 23 ستمبر 2009ء کے آرنیکل "دی سلاطین"، 30 دسمبر 2012ء کے آرنیکل "Conflict and Change" جیسے آرنیکل پڑھ کر ڈاکٹر صاحب کی تاریخی و ادبی معلومات کی گہرائی اور جانکاری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دل تو چاہتا ہے ڈاکٹر صاحب کے ہر آرنیکل کے اوپر ایک وسیع تبصرہ کروں اور صدقہ دل سے ان کے تاریخی اور ادبی مصوہات کی گہرائی کو سر آنکھوں پر رکھوں، لیکن میں یہاں پر صرف 2 آرنیکل پرکتفا کرتا ہوں۔ ایک تو آرنیکل "چرچل سید، تاریخ از پور" چرچل کی کہی ہوئی باتیں اور تاریخ کے پھیلاؤ کا

دھیما پن جن حسین غفلوں میں ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے، میں نہیں سمجھتا اس سے بہتر انداز میں کوئی کر سکتا ہے۔ سینا انہما کو متحد و کرت ہوئے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے متعلق اور لکھی ہوئی کتابوں کے متعلق یا کہی ہوئی باتوں کے متعلق بھی کچھ کہنے کو دل چاہتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی ہندوستان کے علاقے راجستھان کے شہر ٹونک میں پیدا ہوئے اور تقسیم ہند کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان منتقل ہوئے۔ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم انہوں نے حیدرآباد میں ہی حاصل کی۔ 1976ء میں انہوں نے جرمنی سے PHD کی ڈگری حاصل کی ان کا موضوع مغل دور کا سندھستان تھا۔ وہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبہ تاریخ کے سربراہ بھی رہے۔ بعد ازاں وہ لاہور منتقل ہوئے۔ جہاں 1995ء تک گولڈ سٹڈیٹ کے ڈائریکٹر رہے۔ ڈاکٹر مبارک علی 70 سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کا شمار پاکستان کے ان مورخین اور محققین میں ہوتا ہے جنہوں نے ناصر فیض پاکستان بلکہ برصغیر کی تاریخ کو سچ کرنے کے اسباب کو تحریروں کے ذریعے، چاہے کہ ان کی تحریریں پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حکمرانوں نے اپنی حکومتوں کو طوطوں دینے کے لئے کس طرح تاریخی حقائق کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اب ان حکمرانوں کا تعلق دور قدیم سے ہو یا دور جدید سے ان کا مطلع نظر ایک ہی تھا اپنے اقتدار کو کس طرح مضبوط بنایا جائے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے پاکستان کی درسی کتابوں میں تاریخی حقائق کو سچ کرنے کے حوالے سے شدید تنقید کی ہے ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی درسی کتب میں ہیرو وازم کو فروغ دیا گیا جس کے ذریعے ان مسال حکمرانوں کو جو صرف حکمران تھے وہ ان کا مذہب سے کوئی پیمانہ بنائیں تھا کو بہت بڑے مذہبی مفکرین کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ مسلمان حکمران ہندو امراء سے بھی بہت اچھے تعلق رکھتے تھے اور انہیں جاگیریں اور مراعات عطا کرتے تھے، تاکہ ان کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ انہوں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے پاکستان اور ہندوستان میں تاریخ کی کتابوں کے ذریعے ہندو مسلم نفرت کو فروغ دینے کی کوششیں متواتر جاری ہیں۔ دونوں ملکوں کی درسی کتابوں میں ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت تاریخ کو اپنے مقصد کے حصوں کے لئے منسج کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو نظام ظلم استبداد اور آمریت کی بنیاد پر موجود ہو اس میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کو اپنے مفاد میں کس طرح استعمال کیا جائے۔

2007ء میں پٹی کتاب قدیم ہندوستان کی تقریب رونمائی کے موقع پر انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی درسی کتب میں اشوک، عظیم کاؤٹی ڈکٹیشن ہے دراصل پاکستان اور ہندوستان یا ہندو

اور مسلمانوں کے درمیان نفرتوں کے بیج برطانوی استعمار کی جانب سے بونے گئے تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں میں تبدیلی کا آغاز 1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہوا جب مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کو لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ بعد ازاں فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے اس میں مزید اضافے کئے اور پاکستانی بچوں کو یہ پڑھایا جانے لگا کہ پاکستان مذہب کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ غالباً پاکستان میں دوسرے مذہب کے بارے میں نفرت اور عدم برداشت کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ”تاریخ اور نصابی کتب“ میں لکھتے ہیں

”کہا جاتا ہے کہ علم طاعت ہے اسی وجہ سے ریاست کوشش کرتی ہے کہ علم پر پٹی اجارہ داری قائم کر کے اس کے ذریعہ معاشرہ کو کنٹرول کیا جائے۔ یہ سرکاری علم خاص طور پر نصاب کی کتابوں کے ذریعہ نوجوان نسل کے ذہنوں کو تبدیل کرنے اور انہیں ریاستی نظریات کے تحت ڈھانسنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر ریاست نظریاتی ہوتی ہے تو اس صورت میں سرکاری اور ریاستی علم کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔ درس علم کے ذریعہ ریاست معاشرے کے ذہن کو یکساں سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن جمہوری معیثوں میں ریاست کے اس علم اور اس کے نظریات کو سیاسی، سماجی و مذہبی گروہ چیلنج کرتے ہیں اور عمومی دہائے تحت ریاست کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نصاب کی کتابوں کو ان کے نظریات کے تحت تبدیل کرے۔ مگر ریاست جمہوری نہ ہو اور نظریاتی ہو تو اس صورت میں ترقی پسند تحریکوں کا شکم ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی تحریروں میں بارہا اقلیتوں کی پاکستان میں موجود صورتحال کا ذکر کیا ہے اور اس بات کا تجزیہ بھی کیا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی وجوہات کیا ہیں اپنی کتاب ”تاریخ کیا کہتی ہے“ میں وہ لکھتے ہیں

”آخر اقلیتوں کو قومی دھارے اور قومی تاریخ سے کیوں نکالا جا رہا ہے اس کی وجوہات کیا ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ کسی نئے ملک کی تشکیل نہیں بلکہ فتح تھی اور جس طرح فاتح فوج ملک کی فتح کے بعد خود کو اس کا حقدار سمجھتے تھے اسی طرح اس ملک کی ماں و دولت کو مال غنیمت

سمجھ کر اس کی بوٹ مار میں مصروف ہو جاتی ہیں یہی کچھ ہمارے ملک میں ہوا۔ تحریک آزادی کے کارکنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس ملک کے ذرائع کو کم سے کم کر دیا۔ اب ہر ایک کی یہ کوشش ہے کہ خود کو تحریک آزادی کا کارکن ثابت کرے اور اس کے معاوضہ میں ملک کے ذرائع کو لوٹے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں محنت وطن اور غنہ وطن کی اصطلاحات اس قدر عام ہیں اور جو بھی اقتدار میں ہوتا ہے وہ مخالفین کو غنہ و فقر زدے کر لوٹ کھسوٹ کے سارے حقوق اپنے لئے محفوظ کر بیٹا ہے۔“

پاکستان کا اس وقت ایک بہت بڑا مسئلہ ملک میں جاری دہشت گردی کی ہر ہے جس میں اب تک چالیس ہزار (40,000) سے زائد افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ دہشت گردی کی وجوہات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ”گمشدہ تاریخ“ میں رقم طراز ہیں ”دہشت گردی کی ایک شکل وہ ہے کہ جس میں فرقہ وارانہ اور سیاسی جماعتیں موٹ ہوتی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تشدد کے واقعات کے ذریعہ حکومت کو کمزور کریں تاکہ عوام میں یہ تاثر ہو کہ حکومت ان کے تحفظ میں ناکام ہو گئی ہے۔ ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ یہ دہشت گردی کے اقدامات عمومی جگہوں پر کرتے ہیں۔ مثلاً بسوں میں یا مارکیٹ میں بموں کے دھماکے کرنا، ریوے پڑیوں کو اکھاڑنا، یا ریل گاڑی میں بم رکھ کر اسے اڑ دینا، عام طور سے اس قسم کے واقعات غریبوں کی آبادیوں، منڈیوں، یا بس اڈوں پر ہوتے ہیں جن میں مرنے والے غریب لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سے خوف و دہشت تو پھیلتی ہے مگر بہت زیادہ شور نہیں مچتا ہے اور نہ احتجاج ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو ان حادثات سے حکومت کے اعتماد پر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ اخباروں میں بیانات آ جاتے ہیں، وارننگ دے دی جاتی ہے اور پھر ہر چیز کو بھل دیا جاتا ہے۔“

مسلمانوں میں فرقہ بندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے بارے میں ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ برطانوی دو حکومت میں سیاسی آزادیوں کا نا ہونا تھا کیوں کہ برطانوی حکومت سمجھتی تھی کہ اگر انہوں نے ہندوستان میں سیاسی آزادیوں کا آغاز کیا تو اس کے نتیجے میں ان کی حکومت ختم

ہونے کے خدشات تھے اس کے برعکس انہوں نے مذہبی سرادوں پر کوئی قدم نہیں کھائی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں فرقہ بندی کو فروغ حاصل ہوا اپنی کتاب ”تحقیق کے لئے رجحانات“ میں اس صورتوں کا تجزیہ انہوں نے ان حوالوں میں کیا ہے۔

”غزالیوں صدی کے ہندوستان میں سیاسی حالات کے پیش نظر اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ مسلمان معاشرہ میں مذہبی فرقوں اور صوفیاء کے سلسلوں کے اختلافات کو ختم کر کے یکگنا کر انہیں باہم ملایا جائے لیکن کولونیل دور میں کہ جہاں سیاسی آزادی تو نہ تھی، مگر مذہبی آزادی تھی، وہاں مسلمانوں کے فرقوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے عداوہ دوسرے فرقوں کو عیدہ کر کے صرف اپنی بارادستی قائم کی جائے۔ اس سلسلہ میں بعض فرقے اس حد تک گئے کہ انہوں نے اپنے مخالفین کو گمراہ اور کافر تک قرار دے دیا۔ چنانچہ ان اختلافات کو ہم دیوبندیوں، اہل حدیث، احمدیوں، تہیہی جماعت کے پیروکاروں، اور بریدیوں میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام جماعتیں اور تحریکیں اسلامی تھیں اور انہوں نے اپنے خیالات و افکار کی تشہیر کے لئے تمام جدید ذرائع کو استعمال کیا جن میں چھپے خانے، رسالے، مساجد، مدارس، اور اجتماعات شامل تھے۔ ایک خاص بات اس عہد کی یہ بھی ہے کہ ان میں اکثر فرقے اپنے نفوذ کی تصدیق مکہ کے علماء سے کراتے تھے تاکہ ان کے فیصلوں میں وزن ہو جائے۔“

فائدہ عظیم محمد علی جناح کی قیام پاکستان کے بعد 11 اگست کو ہونے والی پہلی قانون ساز سبلی میں کی جانے والی تقریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں ایک سکولر پاکستان کا تصور تھا جس میں تمام مذاہب اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی مذہبی رسومات آزادی سے دکر سکتے تھے لیکن ”خبر وہ کیا جو بات تھیں کہ قائد عظیم کے انتقال کے بعد لیقنت علی خان مرحوم کو قرار داد مقاصد سبلی میں پیش کر کے منظور کروانی پڑی۔ اس کی وجوہات یہاں کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ”تاریخ وراثت کی دنیا“ میں لکھتے ہیں کہ

”جب مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں سے ایک عیدہ ملک کا مطالبہ کیا تو اس کی زبردست مخالفت کرنے والوں میں مذہبی جماعتیں تھیں، جن میں جمعیت علماء ہند، جماعت اسلامی اور حرر قائل ذکر ہیں۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ مسلم

لیگ کے راہنما معر فی تعلیم یافتہ ہیں، ان کی مذہبی معلومات بہت محدود ہیں، اس لئے وہ اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کی راہنمائی کریں اور ان کے سے ایک عیدہ ملک کا مطالبہ کریں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ حق صرف علماء کو ہے کہ وہ مذہبی طور پر مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ اس میں جب 1947ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا تو جمعیت علماء ہند ہندوستان میں رہی مگر جماعت اسلامی کے جس کا ہیڈ کوارٹر پٹنن کوٹ میں تھا، وہ فوراً پاکستان چلی آئی اور لاہور میں اپنا صدر مقام قائم کر لیا، تاکہ نئے بننے والے ملک کو اسلامی بنانے کی جدوجہد کی جائے۔ مجلس احرار کہ جس کے کٹر راہنماؤں کا تعلق پنجاب سے تھا، انہوں نے اپنی توجہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے میں کر دی۔ اس طرح پاکستان بننے کے بعد جماعت اسلامی وہ مذہبی اور سیاسی جماعت تھی کہ جس نے عملی طور پر پاکستان کی سیاست میں حصہ لیا، اور ابتداء ہی سے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ پاکستان کے دستور کو اسلام کی روشنی میں تیار کیا جائے۔

ان حالات میں لیقنت علی خان (وفات 1951ء) نے یہ فیصلہ کیا کہ علماء کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ریاست مذہب سے متعلق کرے تاکہ مذہبی راہنمائی کے لئے عوام علماء کے بجائے ریاست کی جانب دیکھیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہندوستان سے بھی اہم علماء کو دعوت دی جن میں سید سلیمان ندوی اور پروفیسر حمید اللہ قائل ذکر ہیں کہ یہ ایک ایسا دستور بنائیں جو کہ پاکستان کے لئے مناسب ہو۔ ان علماء کے مشوروں اور بحث و مباحثہ کے بعد تو دستور تو نہیں بنایا جا سکا لیکن ”قرارداد مقاصد“ کے نام سے ایک دستاویز ضرور تیار ہوئی جسے 1949ء میں دستور ساز سبلی نے منظور کر لیا۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا کہ قائد اعلیٰ خدا کے پاس ہے، کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ آگے چل کر قرارداد مقاصد نے پاکستان کی دستور سازی میں ہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کے تینوں دستور میں، ”اسلامی ریپبلک“ کہا گیا اور ان میں کئی مذہبی دفعات کو شامل کیا گیا، ضیاء الحق کے دور حکومت میں مقررہ قرارداد مقاصد کو 1973ء کے دستور کا ایک حصہ بن لیا گیا۔“

غرض کہ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی تحریروں کے ذریعے نہ صرف تاریخی حقائق کا سائنسی تجزیہ کیا ہے بلکہ اُن کی جمہوریت اور روشن خیالی کے ساتھ وابستگی بھی اُن کی تحریروں سے عیاں ہے ایک وقت وہ بھی تھ کہ ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتابیں خود بٹریچ پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر پھپھواتے تھے کیوں کہ کوئی ناشر ان کی کتابیں چھاپنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آج اُن کی 70 سے زائد کتابیں ملک کے ہر چھوٹے بڑے بک سٹال پر با آسانی دستیاب ہیں اور ان کتابوں سے تاریخ کے طالب علموں کے علاوہ سیاسی کارکن روشن خیال اور انسانی حقوق کے ہم بردار استفادہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی .. سماجی علوم اور تاریخ نویسی

رؤف نظامانی

کسی بھی سماج میں سماجی علوم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ نہ صرف ایک ایسی اساس فراہم کرتے ہیں جس پر سماج اور اس کے اداروں کی تعمیر ہوتی ہے بلکہ ان اداروں کو چلانے اور سدھارنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ فطری علوم کو بڑھاد دینے میں بھی لوگ متحرک کار کردار ادا کرتے ہیں۔ سماجی علوم سماج کے ادروس، نظریات، خیالات و عقائد کے متعلق مختلف سوالات کو جنم دیتے ہیں جن کی تحقیق اور جوابات کی تلاش فطری علوم کے ذمہ آتی ہے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ جس سماج میں سماجی علوم پس منظر میں چھپے جاتے ہیں اور ان کی ترقی و ترویج پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی وہاں نہ صرف فطری علوم زوال پذیر ہوتے ہیں بلکہ مجموعی طور پر پورا سماج جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔

پاکستان کے تعلیمی نظام میں سماجی علوم کو ثانوی بلکہ اس سے بھی کم تر حیثیت دی جاتی ہے۔ اکثر ایسے طلباء ان مضامین کا انتخاب کرتے ہیں جن کے لیے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فطری علوم پڑھنے کے اہل نہیں ہیں اور بس چھوٹی موٹی نوکری کر کے اپنے خاندان کا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خاص طور پر ملک کے حکمران طبقے اس کی نہ صرف یہ کہ ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لحاظ سے ملک کے سرے سرے مورطے شدہ ہیں اور نظریات، معاشی و سیاسی مفاد سے کسی بھی تبدیلی کی ضرورت تو کچھ اس متعلق سوال اٹھانے اور بات کرنے کو بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ اسی وجہ سے تعلیمی ادروس اور جماعت میں کرپشن اقربا پروری اور بیسوں کے عوض ڈگریوں کا حصول تو ایک معمول ہے اور اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ تحقیق اور عاموں کی تربیت کا عمل ہے۔ یہ صرف سماجی علوم تک محدود نہیں ہے بلکہ اس نے پورے تعلیمی نظام کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔

سماجی علوم کے حوالے سے بھی جن علوم کو دور بھی کم تر حیثیت دی گئی ہے ان میں تاریخ کا علم

سرپرست ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں روزگار حاصل کرنے کے مکانات محدود ہوتے ہیں جو کہ تعلیمی نظام کا بنیادی خاتمہ ہے۔ تاریخ صرف ماضی کا علم نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا تسلسل ہے جو کہ حاض کو سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ سماج کے نظریاتی ڈھانچے میں تاریخ کا کلیدی کردار ہے۔ تاریخ اور تاریخ دان کا کردار غیر جانبدار نہیں ہوتا۔ واقعات کی تشریح، تفسیر اور روایت کی ترتیب اس طرح کی جاتی ہے جو کہ یا دست پر قابض طبقات سے غریبیت کو مستحکم اور جائز ثابت کر سکے۔ نصابی کتب اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

پاکستان کے تعلیمی اداروں میں جس طرح کی تاریخ پڑھائی جاتی رہی ہے اس نے کئی نسلوں کے ذہن کو اس طرح خراب کر دیا ہے کہ اگر اس وقت کوئی اسے رد کرے یا اس کے متعلق سوالات اٹھائے تو اسکا کیڑے باز روزگار اور یہاں تک کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود بھی سوالات اٹھتے رہے ہیں۔ سیاسیات اور معاشیات وغیرہ کی طرح تاریخ سمیت دوسرے سماجی علوم میں بھی ایسے سرمہ بر سوالات اور تجویز کے ساتھ آتے رہے ہیں جنہیں اس بات کا اندازہ پسنے سے تھا کہ اس طرح سے وہ پناہ سب کچھ ہی ادا پر گزارہ ہیں۔ انفرادی کاوشوں کے ساتھ یہ ٹوٹ س بات کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے کہ ملک میں ایسے دنوں کا قیوم ضروری ہے جہاں نہ صرف سماجی بنیادوں پر ملک ان علوم کی ترویج ہو سکے بلکہ ایسے ماحول کی تربیت بھی ہو جو تحقیق میں پناہ کر دار ادا کر سکیں۔ ملک میں ایسے ماہرین کی کمی کا اندازہ اس سلسلے کے س بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت ملک کی جامعات میں تاریخ پڑھانے والے استاد تو موجود ہیں لیکن کوئی تاریخ دان نہیں ہیں۔ اس طرح ملک کی جامعات میں جس طرح کی صورت حال ہے اس کا اندازہ ان کے اس بیانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ جامعات پنجاب نہیں ہے یہاں استاد رکھنے۔ ایسے اس سے تیار نہیں ہے کہ وہ ان کے نظریات سے متفق نہیں ہیں۔ ایسے تدریس دنوں کے قیام کا ایک خواب ڈاکٹر، قہس احمد نے اسام آباد میں ابن خلدون یونیورسٹی کے قیام کی صورت میں دیکھا لیکن وہ زندگی سے وفانہ کر سکنے کی وجہ سے اسے پورا نہ کر سکے جبکہ دوسرا خواب ڈاکٹر مبارک علی کالہ نور میں سماجی علوم کے کالج کا قیام ہے۔ اس وقت دس سال کے علاوہ ایسے اداروں کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ملک کی نظریاتی اور سیاسی صورت حال ہے۔ سماج میں انتہا پسندی، جنون اور عدم برداشت گمراہیوں تک پھوسٹ ہو گئے ہیں۔ سوالات، اختلاف، ورٹک کا ظہور ممنوع، ور قبل تعذر جرم قرار پائے ہیں۔ اس صورت حال کا اندازہ ملک کی جامعات میں ان استادوں کی حالت زار سے لگایا جاسکتا ہے کہ جو کہ

اختلافی مباحث تو کبھی صرف اپنے آپ کو علمی مسئلے تک محدود رکھتے ہیں۔ نہ صرف طلباء بلکہ ساتھی اساتذہ کی جانب سے ہراساں کیا جانا اور دھمکیاں دینا بھی ایک معمول بن گیا ہے۔ اس صورت حال میں جہاں اپنے نظریات کی برتری کو برقرار رکھنے اور کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے بجائے وائل اور تاریخی حقائق کے طاقت کے استعمال کو جائز سمجھ جائے وہ اپنے اصولوں پر کاربند رہنا اور ان سے بے قراری اپنا کی جہاد سے کم ہے۔ یاد ہے کہ بچپن اور سٹڈی انڈیا میں بھی ایسے ہی حالات تھے لیکن اب یہ واضح فرق یہ ہے۔ مخالف خیالات اور نظریات کو ماننا اور ختم کرنا صرف ریاست کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ ایک لحاظ سے سماج کی مجموعی ذمہ داری کا حصہ بن گیا ہے۔ ملک اور اہم بات یہ ہے کہ ایک سیاسی جماعتیں اور دوسرے بھی کمزور حالت میں ہیں جو متبادل اور مخالف نظریات کے حامل افراد کے لیے ایک محافظ کا کردار ادا کرتے تھے۔ خاہر ہے یوں تو یہ صورت حال ایک سیاسی اور نظریاتی انقلاب کا تقاضا کرتی ہے لیکن اس سے انظار میں ہاتھ پر ہاتھ نظر سے بھی نہیں بیٹھا جاسکتا۔ کچھ افراد سماج کی جانب سے یا پناہ فرض سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں اپنا مقدر بھر حصہ ادا جائے۔

ڈاکٹر مبارک علی ایک تاریخی اہل ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی تاریخ کے حوالے سے ہوئی ہے اور ان نے اپنی ماضی عمر تاریخ کے علم پڑھانے اور سے پھیلاتے میں ہی گزاری ہے۔ میرے علم کے مطابق نہ وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ رہے ہیں ورنہ ہی ان کا عملی سیاست سے کوئی تعلق رہا نہ پاکستان کی تاریخ کو تنقیدی اور ماضی میں نظر سے دیکھنے اور پرکھنے والے چند ایک اور مورخ بھی ہیں لیکن مبارک علی کی نظریات یہ ہے کہ وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ میں عاموں سے بے گیند ہوں بلکہ عوام سے بے گیند ہوں۔ یہ ایک نظر سے بہت ہی معصوم سی خوش ہے لیکن تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حکمران طبقات کے لیے بالکل ہی ناقابل قبول ہے۔ وید، گیتا، برہمنوں کے دور میں تو جہاں کی ضرورت نہیں ہے جب مقدس کتابوں کے الفاظ غلطی ذات کے لوگوں کے کانوں میں پڑنے سے ان کے کانوں میں کچھ ہوا سیسہ گھون دیا جاتا تھا اس وقت پاکستان میں انگریزی جرائد اور خبرات میں بہت ساری باتیں برداشت ہو جاتی ہیں لیکن اردو اور ملک کی دوسری قومی زبانوں میں وہی مواد قابل تعذر قرار پاتا ہے۔ مبارک علی کی چابیس سے ڈاکٹر کتب ہیں جن میں سے کچھ انگریزی اور زیادہ تر اردو میں ہیں۔ لیکن وہ صرف یہاں تک ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ تاریخ کو نہ صرف ہکا بکا کر پیش کیا گیا ہے بلکہ حکمرانوں نے اپنے مفادات کو مد نظر رکھ کر اس کی تشریح کی ہے۔ اس لیے ان کا کام لوگوں تک صحیح معنوں میں پہنچانا اور اس صحیح تشریح کرنا ہے۔ جہاں تقلید یک عقیدے کی صورت رکھتی ہو

وہاں اپنی آزاد رائے کا اظہار ایک جرم اور گنہ گن جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا کسی ادارے میں ہونا بذات خود اس ادارے کے لیے اعزاز کا باعث ہوتا ہے اور وہ ادارے ان افراد کے حوالے سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اس طرح مبارک علی کا سندھ یونیورسٹی کے تاریخ کے شعبے کا سربراہ ہونا یونیورسٹی اور تاریخ کے شعبے کے لیے اعزاز تھا۔ لیکن سندھ یونیورسٹی بھی اتنی پسند، ناپسند، خوشامد اور ایک دوسرے کی ناگک کھینچنے کے عمل میں اس حد تک آگے بڑھ گئی ہے کہ اس کے لیے علمی شخصیات کو ہضم کرنا اور ان کی قدر کرنا ایک ناممکن سی بات بن گئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ حاجی موم کے عالم ڈکٹر فیروز احمد جب وطن ہونے تو نہیں سندھ یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی پیش کش کی گئی تھی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر اسسٹنٹ پروفیسر ہونا قبول کیا تھا کہ وہ جہاں سے آ رہے ہیں وہاں بھی وہ اسی حیثیت میں پڑھا رہے تھے اس لیے وہ کوئی ناچاز فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن وہ اس ماحول کو حصہ نہ بن سکے اور اپنے ساتھیوں اور افسروں کی سازشوں سے تنگ آ کر آخر کار انہیں یہ نوکری چھوڑنی پڑی۔ یہ کہانی مشہور سندھی لکھک حیم بروہی اور بہت سے دوسرے لوگوں کی بھی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ بھی یہی ہوا کیونکہ وہ نمک کی کان میں پڑ کر نمک بننے کے عادی نہیں تھے۔

گوئے انسٹی ٹیوٹ لاہور کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی ان کا تجربہ زیادہ خوش گوار نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شروعات میں جو ڈائریکٹر تھے ان کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار اور باہمی عزت و احترام پر مشتمل تھے۔ بعد میں آنے والے ڈائریکٹر کا رویہ ان کے ساتھ غیر مہذبانہ تھا اور وہ ان کے ساتھ باس اور ماتحت والا رویہ رکھنا چاہتے تھے جو انہیں قبول نہیں تھا۔ اور انہوں نے صاف طور پر انہیں کہا تھا کہ ہم دونوں ساتھی اور کلاسیک ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی باس اور ماتحت نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مزید کہنا ہے کہ اپنے ملکوں میں تو یہ لوگ ایک مڈل کلاس کی زندگی گزارتے ہیں اور چھوٹے فیملیوں میں رہتے ہیں اور اس طرح سے ان کے رویے بھی ایک عام انسان کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جیسے ہی پاکستان جیسے ملکوں میں پہنچتے ہیں تو یہاں کے جاگیردارانہ پچر کی چمک دمک، امراء کے ٹھانٹ بھانٹ افسران کی عیشیں اور سب سے بڑھ کر خوشامدی دانشور انہیں اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اس طرح ان کے رویے اور طور طریقے بھی وہیں ہو جاتے ہیں جو یہاں کے ایدیٹ کے ہوتے ہیں۔ اپنی عزت نفس کی قربانی نہ دینے کی بناء پر ڈاکٹر صاحب کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ اس معاملے میں مدیحہ گوہر اور اجوا کا تیسرے لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب مقامی دانشوروں میں سے وہ کسی کو مورد الزم نہیں ٹھہراتے بلکہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ بہت سوں نے ان کے ساتھ روار کھے گئے سلوک

پر احتجاج اور مظاہرے بھی کیے لیکن ساتھ ساتھ انہیں یہ شکایت بھی ضرور ہے کہ ان دانشوروں نے بجائے اپنے موقف پر قائم رہنے کہ دو پارہ گوئے انسٹی ٹیوٹ کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ ان کی یہ شکایت بالکل سچا ہے کہ پاکستان کے دانشوروں کی اکثریت اپنی ہی خط سے کرپٹ اور اپنے ذاتی معادات کے پیچھے سرگرداں ہے۔ اسی وجہ سے ان کے دوستوں کا حلقہ ایسے لوگوں تک ہی محدود ہے جو ذاتی طور پر اس سے ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ پاکستان کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ یہاں کے لوگوں اور خاص طور پر نئی نسل کو صحیح حقائق سے آگاہ کیا جاسکے جو چیز آگے چل کر تو ہم پرستی، مذہبی منافرت، اور فرقہ واریت وغیرہ ختم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ایسے تاریخ دان نہ ہونے کے برابر ہیں جو عمری اور فارسی زبانوں سے واقف ہوں۔ جو ورکنگ ماخذوں سے استفادہ کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے اس سلسلے میں وہ تاریخ دانوں کی تربیت پر زور دیتے ہیں اور مختلف مواقع پر انہوں نے متعلقہ حلقوں کی توجہ بھی اس جانب دلائی ہے۔ مختلف حکومتوں نے نئے سرے سے تاریخ لکھنے کے لیے کمینیاں وغیرہ بھی تشکیل دی ہیں لیکن تاریخ دانوں کی تربیت کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اسی کچھ کمینیاں میں ڈاکٹر صاحب کو بھی نامزد کیا گیا ہے لیکن ڈکٹر صاحب کا ہمیشہ سے یہ اعتراض رہا ہے کہ جب ان کمینٹیوں کے ارکان تاریخ دان ہی نہیں ہیں اور اصل ماخذوں تک پہنچانے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں ہے تو وہ تاریخ کیسے لکھ سکتے ہیں۔

چاروں جانب گپ اندھیرے کے باوجود اگر روشنی کی ایک کرن بھی ہے تو اندھیرا ختم ہو جاتا ہے اس وقت ملک میں ہر جانب فرقہ واریت، دہشت گردی اور مذہبی انتہا پسندی زوروں پر ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ سانج کی جڑوں تک سرایت کر گئی ہیں۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر مبارک علی یقیناً ایک روشنی کی کرن اور ایسی امید ہیں جو بہت سوں کو اپنی منزل تک پہنچنے کا حوصلہ بخشتی ہیں۔ یہ بات صرف اس کے منفرد تاریخ دان ہونے جنہوں سے عوام کے لیے لکھنے کو ترجیح دی اور ایک تہوں اپروچ کو متعارف کر دیا جو بات بھی یقیناً اپنی جگہ بہت اہم ہی نہیں ہے لیکن ان کے کردار کی مضبوطی و رکت منہ اگر اس سے زیادہ نہیں تو اتنی اہمیت تو ضرور رکھتی ہے۔ ایک مڈل کلاس کے فرد ہونے کی حیثیت سے اپنے موقف اور عزت نفس کی خاطر ہر کشش عہدوں اور مختلف مواقع پر سرکاری پیش کشوں کو ٹھکرا دینا اور جو سردی سے مالی مشکلات کو جھیننا اور اپنے کام کو جاری رکھنا یقیناً ایک قابل ستائش بات ہے۔

تھا تو اس میں بہت ساری نئی باتیں تھیں جو دلچسپ بھی تھیں، بلکہ وہ انکشاف بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے قارئین میں سے سندھ کے ایک حلقہ کو یہ دہلی دہلی کی شکایت بھی رہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے برصغیر میں سندھ کے مقابلہ میں عہد مغلیہ پر زیادہ توجہ دی ہے وغیرہ۔ مگر یہ حضرات شاید اس حقیقت سے چشم پوشی کر جاتے ہیں کہ سندھ کی تاریخ کے حوالے سے جو بھی معیاری تحقیق ہوئی ہے اس میں ڈاکٹر صاحب کی تحقیق صوبہ اول میں ہی شامل ہے۔

لاہور سے ڈاکٹر صاحب نے سہ ماہی "تاریخ" کا اجراء کیا تھا۔ اس میں "سندھ نمبر" بھی شامل تھا جس میں سندھ کی تاریخ کے اخذات کے حوالے سے بیچ نامہ، تختہ انکرام، تاریخ معصومی، تاریخ مظہر شاہجانی کا جس طرح روایتی تاریخی و سماجی پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے وہ آج تک کسی بھی محقق کے حصہ میں کم سے کم ان اخذات کے حوالے سے نہیں آیا ہے، اور عربوں کے نقطہ نظر سے جو بیچ نامہ لکھا گیا تھا ڈاکٹر صاحب نے اس کو صمدی ادوار کا وہ نقطہ نظر مظہر یا تھا جس میں ملتوحین کی آواز دہ کر رہ گئی تھی اور اس طرح ڈاکٹر صاحب نے تمشدہ تاریخ کے اوراق پر سے صدیوں کی چڑھی ہوئی خاک کو ہٹانے کی کوشش کی اور اس موقف کو ایک تاریخی سند فرہم کی ہے کہ عربوں کا سندھ پر حملہ کس منظر نامہ کو پھیلاتا نہیں بلکہ وہ استعماری ذہن تھا جو اپنی تجارت کے لئے عرب کے رستے محفوظ بنانا چاہتا تھا۔ تاریخ میں یہ بھی سول انہم بن جاتا ہے کہ کسی بھی مذہب کے پھیلانے کے لئے، کسی آراء ملک و قوم پر حملہ جائز بنتا ہے یا نہیں؟ شاید تاریخ میں جائز و ناجائز کا تصور کچھ الگ ہے! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تاریخ اخذ قیوت سے دورا رہے!!

اسی شمارے میں ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی پاکستان سے پہلے کی معیشت و تجارت کے حوالے سے در بھی بہت سارے مضامین شامل کئے تھے جو مستند محققین کے لکھے ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے "سندھ کی سماجی اور ثقافتی تاریخ" کے زیر عنوان کتاب کی ترتیب و تدوین کا خوبصورت کام کیا۔ اس کتاب کے اخذات میں سترہویں صدی سے انیسویں صدی کے یورپی سیاحوں کی ڈائریاں، تاثرات، مشاہدات ہیں اور تقریباً چار صدیوں کا سندھ ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں قارئین تک پہنچ جاتا ہے۔

سندھ کے حوالے سے "سندھ خاموشی کی آواز" کے عنوان کے تحت ان کی لکھی گئی کتاب میں سندھ کے سیاسی و سماجی پس منظر کے حوالے سے تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور سندھ میں لسانی بنیادوں پر کی جانے والی سیاست کے علاوہ دوسرے ان سماجی حوالوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو اس سندھ

کی ترقی و خوشحالی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ جس سندھ کو ڈاکٹر مبارک علی با رہا اپنی تحریروں اور تاثرات یا انٹرویوز میں پاکستان بننے کے بعد صوبہ سے زیادہ تکلیفیں برداشت کرنے والا صوبہ کہتے ہیں، در خاص طور پر سندھ کی ثقافتی تباہی کو درد کی آنکھ سے دیکھتے رہتے ہیں۔ روایتی تاریخ کے حوالے سے ہمارے ہاں ویسے بھی لوگوں میں سطحی تصورات پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تاریخ کو بادشاہوں یا حکمران طبقوں کی سرگرمیوں کا ریکارڈ ہی سمجھا گیا ہے۔ لیکن مؤرخ کی حیثیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب وہ تاریخ نویسی کے مرحلہ کے دوران تاریخ کے حوالے سے سوالات اٹھائے، اور ان سوالات کے جوابات تحقیق کے حوالے سے پیش بھی کرے یا وہ مفروضات جن کو بیچ سمجھا گیا ہے ان کو مفروضات ثابت کر کے لوگوں کو حقائق کی طرف لانے کی کوشش کرے۔ میں یہاں ایک بار پھر سندھ پر عربوں کے حملہ کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لئے مثال پیش کرنا چاہوں گا کہ سندھ پر عربوں کے حملہ کی جو جو بات بیان کی گئی ہیں یا جو جو بات نصیبی تاریخ میں درج ہیں اس میں ایک وجہ عرب تاجروں کے جہازوں کا بحرب میں قزاقوں کے ہاتوں لوٹا بھی جاتی گئی ہے، اور ایک ایسی عورت کا کردار بھی سامنے آیا گیا تھا جو قزاق بن یوسف کو مدد کے لئے جذباتی انداز میں فریاد کرتی ہے اور قزاق بن یوسف اس عورت کو انصاف دمانے کے لئے آزاد سندھ پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس قسم کی باتیں نسیم چوہدری کے ناووں تک تو سمجھ میں آ سکتی ہیں مگر جب ایسے واقعات ڈاکٹر مبارک علی جیسے محقق اور ہنرمند پر فکر کے زیر نظر آتے ہیں تو یہ واقعات تحقیق کے دائرہ میں آ جاتے ہیں ورنہ سول کر بیٹھتے ہیں کہ جنگ یا حملہ کا ایک محرک کردار۔۔۔ وہ عورت۔۔۔ حر تاریخ کے صفحات میں کیوں گم ہو گئی؟ کہیں یہ تو نہیں کہ حملہ کے بہانہ کے طور پر وہ عورت ہی ایک فرضی کردار کے طور پر درباری مؤرخ نے بنائی ہو!! اور یہ بات کسی تحریر میں ڈاکٹر صاحب اس نارنگی کے حوالے سے بھی تحریر کے دائرہ میں لے گئے ہیں جو انارنگی ہندوستان میں محبت کی علامت بن گئی تھی۔ تاریخ بھی کیا عالم چیز ہے!!

مجھے یاد ہے کہ دسمبر 2012ء میں جب ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کی حیدر آباد پریس کلب میں تقریب رونمائی "تاریخ کے پچاس سال" کے عنوان کے تحت ہوئی تھی تو اس میں سولت و جوبت کی نشست میں ہمارے دوست گوہر نیکھوڑ کا اس سے ایک سول یہ بھی تھا کہ "ڈاکٹر صاحب! کیا تاریخ خام ہوتی ہے؟" تو اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر مبارک علی نے کہا تھا کہ "ہاں! تاریخ دودھاری کھو رکی طرح ہوتی ہے۔ جو مفلوم بھی ہوتی ہے اور خام بھی ہوتی ہے۔" ایک طرح سے تاریخ واقعی یہ ظلم بھی کرتی ہے کہ لوگ برسوں تک کچھ کرداروں کا سہارا لئے چلتے ہیں۔ ان کو آئیڈیل بناتے ہیں۔

ن پر لکھتے ہیں۔ شعراء حضرات خوبصورت شاعری کرتے ہیں۔ ناول نگار ناول لکھتے ہیں۔ جب وہ کردار پاپور کچھر کا حصہ بن جاتے ہیں تو تاریخ بیدردی سے آکر یہ بتاتی ہے کہ اس کردار کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔

تاریخ خود کس طرح مظلوم ہوتی ہے؟ شاید جب اسے حقائق تک پہنچنے سے حکمران طبقات روکتے ہوں!! ہو سکتا ہے یہ رکاوٹ عام لوگوں کی صورت میں بھی تاریخ کو پیش آتی ہو!!

ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے سامنے عقائد کا بند باندھنے سے تاریخ مظلوم بن جاتی ہو، اور ان المیوں سے تاریخ گزرتی ہو، اور ہمارا ذہن ڈاکٹر صاحب کی کتاب ”المیہ تاریخ“ کی طرف کھینچ جاتا ہے، اور قاری کے ذہن میں یہ سوال گردش کرنے لگتا ہے کہ ”کیا تاریخ اتنی مظلوم ہے کہ اسے بھی المیوں سے گزرنا پڑتا ہے؟“

جب تاریخ میں فلسفہ کی بات آتی ہے تو یہ کچھ پیچیدہ ہی بات لگتی ہے کیونکہ ہمارے تعلیمی نظام سے ایک تو تاریخ کے مضمون کی طرح فلاسافی کے مضمون کو بھی خارج کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں فلسفہ کا شعبہ برائے نام ہی رہ گیا ہے، تو جب تاریخ کو فلسفہ کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے تو فلسفہ نہ سوائے وجوہات میں قاری یا پڑھنے والے کی ذہنی بحثوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں اس حوالہ سے کوئی پیچیدگی اور الجھن نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے تاریخ نویسی میں جس اسلوب کو اپنایا ہے وہ انتہائی سادہ، خوبصورت اور عام فہم ہے۔ چونکہ وہ تاریخ میں عام لوگوں کی شمولیت کے بڑے ذکیل رہے ہیں اور اپنے قلمی سفر میں وہ اپنی اس بات کو حرف بہ حرف ثابت کرتے آئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں کو اپنے پڑھنے والوں پر ”تخریر کا بوجھ“ ڈالنے سے پرہیز کرتے ہوئے اہل اور آسان اسلوب اس طرح اپنایا ہے کہ عام پڑھنے والا بھی اسے سمجھ سکے۔

میں سندھ کے ایسے کئی سندھی بولنے والے نوجوانوں کو جانتا ہوں کہ جن کے گھروں میں کوئی اور کتاب نہ ہو۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی کوئی کتاب ضرور ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو پڑھنے والے مجھے ایسے کئی نوجوان ملتے ہیں جنہوں نے برسوں سے ڈاکٹر صاحب کے وہ مضامین محفوظ کر رکھے ہیں جو وہ بڑے عرصہ سے روزنامہ ڈان میں ہفتہ وار لکھتے آئے ہیں۔ ایسے نوجوان آپ کو جبکب آباد سے بدین اور کراچی سے قہر پار کر تک ملیں گے۔

برصغیر میں خاص طور پر ہندوستان، پاکستان میں دہائیوں سے کشمکش میں تاریخ کو امن کے لئے کیا کردار دیکرنا چاہئے؟ دونوں ملکوں کے لئے تاریخ امن اور خوشحالی کا پیغام کیسے ماسکتی ہے؟ پوری

دنیا سمیت ڈاکٹر صاحب طویل عرصہ سے برصغیر میں پائیدار امن کے خواہاں رہے ہیں۔ اس لئے وہ حکمران طبقات سے کوئی توقع رکھنے کے بجائے دونوں ملک کے عام لوگوں کی تاریخ میں شمولیت پر زور دیتے ہوئے کام کر رہے ہیں، اور برصغیر کے عام آدمی کی ثقافتی تاریخ کے پس منظر میں امن کا وہ خواب دیکھ رہے ہیں جو چار جنگوں سے زخمی دونوں ملکوں کے لئے خوشحالی اور امن کا پیغام ثابت ہو سکتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہ فقط نوجوان نسل کو ایک فرد اور اپنی ذات میں ادارے کی حیثیت میں تاریخ کے نئے راہیوں، ورثی جہتوں سے روشناس کرا رہے ہیں بلکہ ہماری آنے والی نسلوں میں بھی وہ تاریخی شعور پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو تاریخی شعور تمام تعصبات سے پاک ہو، اور اس بات کی گواہی ڈاکٹر صاحب کی تاریخ پر بچوں کے لئے لکھی گئی ”تہذیب کی کہانی“ کی وہ سیریز ہے جو ڈان اخبار کے بچوں کے میگزین میں ہفتہ وار شائع ہوتی رہی ہے۔ تاریخ کے حوالہ سے بچوں کے لئے لکھی گئی یہ کہانی ایک طرف تو ہماری آنے والی نسلوں میں تاریخی شعور پیدا کرنے کی بڑی کاوش ہے تو دوسری طرف اس بات کی گواہی بھی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب ہماری آنے والی نسلوں سے ”امید بھار“ رکھے ہوئے ہیں۔ جو خوش آمد بات ہے۔

میر احسن — ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر ظہور چوہدری

اب یہ تو یاد نہیں پڑتا کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی ابھی یہ ضرور یاد ہے کہ پہلے پہل میں نے انہیں فلکشن ہاؤس میں بیٹھے دیکھے تھے۔ ان کے ہمراہ قاضی جاوید، طاہر کامران، مرحوم رشید ملک، مرحوم فاروق قریشی اینڈ وکیٹ اور مرحوم عزیز سندھی بھی موجود تھے۔ میں نے ان دنوں محکمہ تعلیم میں بطور پیکچر شعبہ سیاست فرائض انجام دینا شروع کئے تھے اور ریڈیو پاکستان، ماہور کی پروگرام پروڈیوسری کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ ریڈیو پر ملازمت کے دوران جب کبھی تقاریر، مباحثوں یا Talks کے لئے سماجی علوم کے ماہرین کے پینل تشکیل دیئے جاتے تو کسی کو نہ ٹھہرے سے ”ڈاکٹر مبارک علی“ کا نام بھی سنا جاتا جس کو بڑے انگراہ سے زد کر دیا جاتا اور آئی پروڈیوسرناک بھول چڑھا کر کہتے ”میں تو کوری سے نکلنے کا ارادہ ہے کیا“ اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا نام نامی میرے لئے کشش کا محور بنتا گیا اور پھر فلکشن ہاؤس میں ان سے ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اب تک جاری و ساری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اعتبار سے نہ صرف میرے بلکہ کئی قابل ذکر دوستوں کے بھی محسن ہیں اور تو اور جس نوجوان وکیل نے ان کو راج کرنے کے لئے قانونی جنگ شروع کی تھی اس کی دہی پرداخت اور نشوونما میں بھی ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ تھا۔ رشید ملک صاحب برہمنا کہہ کرتے ”بس جی فیصلہ ہو گیا ڈاکٹر مبارک میرے استاد ہیں۔“ انہوں نے ہی مجھے تاریخ کی نئی راہیں بھائی ہیں ورنہ میں جیشر رومیلا تھا پر، ہرٹس کھیا، پرکاش ٹنڈن، حمزہ صوفی اور پروفسر عرفان حبیب کو نہیں جانتا تھا۔“

فلکشن ہاؤس کی ن گھفلوں میں گرم گرم بحثیں بھی ہو جاتی تھیں جن کی وجہ سے بعض صاحب بد مزہ ہو کر آنے کا سلسلہ بھی ترک کر دیتے تھے۔ آخری دنوں میں طاہر کامران اور رشید ملک مرحوم نے بھی

نامعلوم وجوہات کی بناء پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ خیر بات ہو رہی تھی ڈاکٹر صاحب کے ان احسانات کی جو وہ وفا و وفا احباب پر کرتے رہتے تھے کسی کو ترجمہ کرنے کے لئے کوئی مضمون تھما دیا۔ کسی کو ”تاریخ“ کا پروف پڑھنے کو دے دیا۔ کسی کو تحقیق کرنے کے لئے موضوعات تجویز کر دیئے۔ موسیقی سے میرا شغف دیکھ کر مجھے تھقی کی کہ موسیقی کے شعبے میں تحقیقی کام کرنے کی بہت ضرورت ہے چنانچہ ان کی تحریک پر میں نے ”ہنامہ“ بدلتی دنیا“ میں گلوکاروں اور موسیقاروں پر تحقیقی مضامین کا سلسلہ شروع کیا جو ”بدلتی دنیا“ کی آخری اشاعت تک جاری رہا اور اس کے نتیجے میں 70 کے قریب مضامین شائع ہو گئے جو برادر مظلوم احمد خاں کی فرمائش پر ”جہان فن“ کی کتابی صورت میں یکجا کر کے چھاپ دیئے گئے۔ اسی سلسلے کی دوسری کتاب ”جہان آہنگ“ بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کے سامنے آئے والی ہے۔ اگر ڈاکٹر مبارک علی مجھے ان مضامین کو تحریر کرنے پر آمادہ نہ کرتے یا میری تحریروں کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تو میں کبھی نثر نگار نہ بن سکتا۔ یہی نہیں ”تاریخ“ کے لئے کئے جانے والے میرے بعض تراجم کو بھی انہوں نے سراہا اور یوں مجھے زندگی میں پہلی بار ترجمے کی خازن ارادگی کا تجربہ حاصل ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک احسان عظیم اس خاکسار کو ملی۔ ایچ۔ ڈی کرانا ہے۔ 2004ء میں فلکشن ہاؤس اور اردو یونیورسٹی کراچی کے تعاون سے برادر مظلوم ملک نے کراچی کے ایک معیاری ہوٹل میں تاریخ کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں یونیورسٹی کے ریکٹر جمیل مدین علی بھی شامل تھے۔ رات کے کھانے سے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی کہ عالی جی سے کہہ کر مجھے اردو یونیورسٹی سے بطور ریسرچ اسکالر رجسٹریشن لے دیں کیونکہ میں پنجاب یونیورسٹی ماہور کے تقریباً تمام جیئر مین حضرات کا دھتکارا ہوا تھا۔ منیر الدین چغتائی، سجاد نصیر، حسن عسکری رضوی اور فاروق حسناں غرض کون ایب صدر شعبہ سیاست تھا جس نے مجھے پنجاب یونیورسٹی ماہور کی غلام گردشوں سے بے نیل و مرام واپس نہ کیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ہائی بھری اور عالی جی سے پُر زور سفارش بھی کی جنہوں نے برادر عزیز تو صیف احمد خاں (شعبہ صحافت اردو یونیورسٹی) کی ڈیوٹی لگادی کہ میں ان صاحب کو تمہیں سونپا۔ ”اب تم جاو اور تمہارا کام۔“ تو صیف خان نے اس ڈیوٹی کو خاطر خواہ طور پر سرانجام دیا اور مجھے میرے مستقبل کے گائیڈ ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری سے ملوایا یوں 10 سال پنجاب یونیورسٹی ماہور کے صدر شعبہ سیاست کا عزیز و یار رہا۔ یہ راقم اردو یونیورسٹی کراچی ریسرچ اسکالر بنا اور 2009ء میں میری ڈاکٹریٹ مکمل ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب اور دیگر مہربانوں کی کاوشوں سے مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہو کہ میں اردو یونیورسٹی کے شعبہ سیاست کا پہلا پی۔ ایچ۔ ڈی تھا جس کا تصدیق کراچی کی بجائے پنجاب سے تھا۔ دوران تحقیق مجھے طریقہ تحقیق اور

بنیادی و ثانوی ماخذوں کی پرکھ، ترتیب اور جانچ سے بھی ڈاکٹر مبارک علی نے ہی روشناس کرایا وگرنہ میرے جیسا کندہ نارتاش اس کام کی ایجاد سے بھی واقف نہ تھا۔ پنجاب میں قائم مختلف لائبریریوں کے مواد تک راہنہ کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے نام تعارفی خطوط پھر برادر یوں کے موضوع پر بھرپور انٹرویوز، غرض اس ڈاکٹر بیٹ کا کونسا حصہ ایسا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کی جھلک موجود نہ ہو۔

اپنی گھریلو پریشانیوں اور مجبوریوں کی بناء پر میں آہستہ آہستہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کی محفلوں سے دور ہو گیا لیکن اُن سے احترام اور شگرت کی کارشتہ ہمیشہ باقی رہا ہے گا۔ اس کتاب کے دیگر مضمون نگاروں کی طرح میں بھی ان سے بہت ڈرتا ہوں کیونکہ پڑھنے کی کس وقت بھری محفل میں مخاطب کر کے کہیں گے ”ہاں تو“ جو ہری صاحب! کیا ہو رہا ہے آج کل؟ بس پڑھتے دھڑکتے تو آپ ہیں نہیں۔ نہ کچھ لکھنے لکھنے میں دلچسپی ہے۔ اب ایسا تو ٹھیک نہیں صاحب!“

تاریخ کا چھوٹا شعور دینے اور مجھے ایسے اندھے کی مانگی ثابت ہونے تک ان کا کردار میرے لئے ناقابل فراموش ہے۔ میرا محسن، میرا مورخ۔ ڈاکٹر مبارک علی۔ زندہ و پائندہ باد!

ڈاکٹر مبارک علی۔ جیسے میں نے ان کو دیکھا

عجاز احمد قریشی

یہ 1960ء کی دہائی کا زمانہ ہے جب میں نے سندھ یونیورسٹی کے اقتصادیات کے شعبے میں داخلہ لیا۔ اُسی قیور پر شعبہ تاریخ، شعبہ جغرافیہ اور شعبہ سیاسیات ہوا کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں کافی گہر گہمی ہوتی تھی۔ مختلف مضامین میں بہت، جتنے اساتذہ مقرر تھے اور وہ ہمیں بڑے اچھے طریقے سے پڑھاتے تھے۔ بی۔ اے۔ آنرز میں میرا مہجر مضمون اقتصادیات تھا اور آنرز میں تاریخ و سیاسیات تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی صاحب شعبہ تاریخ میں لیکچرر تھے۔ میں انہیں اپنے ایک دوسرے دوست سید ظفر حسن، جو کہ جغرافیہ میں لیکچرر تھے کے ساتھ اکثر دیکھا کرتا تھا، وقت گزارتا رہا، پڑھائی ہوتی رہی۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر محمد بشیر صاحب جو کہ شعبہ تاریخ کے سربراہ تھے اور ڈاکٹر مرزا امجد علی بیگ جو کہ شعبہ اقتصادیات کے سینئر استاد تھے، مل کر نوجوان اساتذہ اور طلبہ کیلئے اور ان کی معلومات عامہ کو بڑھانے کے لئے ایک ”گریٹ بک اسٹڈی سرکل“ (Study of great book circle) قائم کیا۔ یہ ایک پڑھائی کے حوالے سے سب کیلئے ایک کلب تھا جہاں کافی طلبہ اور اساتذہ بیٹھے ہیں ایک بار میں بجے سے پانچ بجے تک بیٹھ کر لیکچرر سنتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک نئی کتاب پر لیکچرر و مباحثہ بھی ہوتا تھا۔ میں اس کلب کا ریگولر ممبر بن گیا اور ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے اس سرکل میں ریگولر آنا شروع کر دیا۔ تب تک میری اُن سے صرف سلام دعا تھی۔ وہ اس سرکل میں کافی حصہ لیتے تھے۔ مجھے ان کو سن کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔

1970ء کے مارچ میں، میں شعبہ اقتصادیات کا لیکچرر بن گیا تھا۔ میرے دوست سید ظفر حسن

نے ڈاکٹر مبارک علی صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ اس طرح تقریباً روزانہ یونیورسٹی بس میں آتے جاتے وقت ہماری سلام دعا ہوتی رہی۔

ڈاکٹر صاحب، سید ظفر حسن اور میں صبح ساڑھے سات بجے ایک ہی بس میں سوار ہوتے تھے۔ جو لطیف آباد سے شروع ہوتی تھی۔ 1970ء کے اواخر میں یونیورسٹی کے کافی اساتذہ، اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ اور امریکہ چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب رک علی صاحب پی۔ ایچ ڈی کرنے کیلئے مغربی جرمنی چلے گئے اور وہاں سے پی۔ ایچ ڈی کر کے غالباً 1974ء میں واپس آئے اور سندھ یونیورسٹی میں اسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ میں بھی لندن یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر کے 1974ء میں واپس آیا۔ نئی دلوں میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے لگا، درباری اچھی جان پہچان ہوئی جو گے چل کر دوستی میں تبدیل ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب اور ایم نے سندھ یونیورسٹی جامشورو میں کافی اچھا وقت گزارا۔ ڈاکٹر صاحب نے شعبہ تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ وہاں رہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے طلبہ کو تاریخ کے صحیح زاویے بتائے۔ انہوں نے تاریخ کو ایک ترقی پسند سوچ کے تحت متعارف کروایا۔ انہوں نے تاریخ کی پرانی اور فرسودہ تحریروں کو رد کیا اور یہ بتایا کہ اصل میں تاریخ کا تعلق عوام کیساتھ ہے۔ کیونکہ تاریخ صرف بادشاہ، وزراء اور بڑے آدمی نہیں بناتے۔ یہ لوگ ہمیشہ تاریخ اپنی مرضی سے لکھواتے ہیں جس میں عوام کا ذکر بالکل نہیں ہوتا۔ کئی تاریخوں میں بادشاہوں نے اپنے تاریخ دانوں کی معرفت عوام کو باغی، جاہل، ظالم اور غدار بتایا۔ دراصل یہ عوام ہی ہیں جنہوں نے تاریخ بنائی اور جو ہر وقت تاریخ بناتے رہتے ہیں۔ کئی بھی تاریخ میں ہاری (کسان) اور مزدور کا ذکر نہیں ہے۔ دراصل بادشاہ، وزراء اور امراء ہی ہوتے ہیں جو تئیرے اور ظالم واقع ہوتے ہیں۔ جیسے اوپر کہا گیا ہے کہ دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں جن کی تاریخ کا عوامی زاویہ نظر نہیں کیا گیا۔ جب تک ان ممالک میں ہستہ ہستہ تبدیلی آتی۔ ان ممالک میں انٹی ور یونان کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ پھر بھی مغربی ممالک نے جدید ترقی کی ورتاریج کا ذکر وسیع ہو گیا۔

روم میں جب شہر کی تعمیر ہوئی تو انہوں نے کچھ ایسی کھلی جگہیں بنائیں جہاں شہر کے عوام کیساتھ سیاست دان، عسکران، فوجی جرنیل اکٹھے ہو جاتے تھے۔ جہاں کھلی فضا، میں بحث و مباحثہ ہوتا تھا اور حالات حاضرہ کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ اسی طرح یورپ کے کئی ممالک میں ایسے فورم بنے جہاں سب مل کر بیٹھے حتیٰ کہ موسیقار، رقاص اور تماشہ کرنے والے بھی آ جاتے تھے۔ اسی طرح اگر ہم اپنے مشرقی ممالک میں دیکھیں تو عوام اور حکمرانوں میں بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ ہمارے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں امیر اور غریب مل کر بیٹھیں اور سیاسی یا سماجی مسائل پر بات کریں۔ یہاں عوام کو وزراء اور

امراء سے الگ رکھ رکھ گیا ہے اور جہاں کافی طبقاتی فرق نظر آئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے ہمیں مندرجہ بالا چیزوں کا علم ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں ڈاکٹر صاحب وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ ”تاریخ“ کی نئے سرے سے تشریح کی۔ چنانچہ تاریخ کو انہوں نے ایک نئی زندگی دی۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ تاریخ کا موضوع جو کسی زمانے میں ایک مخصوص طبقے کی شناختی کے لئے مختص تھا وہ تاریخ کے حقیقی معنوں میں ہاریوں، مزدوروں، چرواہوں، ہنرمندوں، استادوں، شاگردوں، عورتوں، بچوں کے زواہوں سے مرتب ہونے لگا۔ اس طرح انہوں نے تاریخ کو آمریت کے کبر و خانے سے نکال کر جمہور کے سر کا تاج بنادیا جو کہ میری نظر میں ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب رک علی نے تاریخ کے ہر پہلو کو عوامی رنگ میں ڈھال دیا اور اس سلسلے میں اب تک انہوں نے کوئی ”گھنٹہ“ (75) کے قریب کتابیں تحریر کی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نہ صرف پاکستان کے سب سے بڑے تاریخ دان ہیں بلکہ برصغیر ہندو پاک کے تاریخ دانوں میں بھی سرفہرست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ہم چند دوستوں نے مل کر جن میں اے۔ آر۔ ناگوری صاحب، ڈاکٹر بیسی داؤد پوٹ، ڈاکٹر محمد علی میسر اور ظفر حسن شاہ شامل تھے۔ ایک فورم بنایا جس کے تحت ہر چند ہویں دن لکچر اور سیمینار کراتے تھے جس میں یونیورسٹی کے مقامی اسکالر اور کچھ اور یونیورسٹیوں سے مہمان مقررین آتے تھے اور یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔ اسی طرح یونیورسٹی ہی میں لکچر ”سندھ ریسرچ سوسائٹی“ قائم کی، جس کے تحت چند کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے سندھ یونیورسٹی میں دوران ملازمت سندھ کی تاریخ کو جدید طرز اور اسلوب سے قلم بند کیا اور انہوں نے سندھ کے در و کور زمین سندھ کے ایک عام باشندے کی طرح محسوس کیا لہذا انہوں نے سندھ کی تاریخ پر قلم اٹھایا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی چار کتابیں سندھی زبان میں ترجمہ کیں۔

ڈاکٹر صاحب جتنا عرصہ سندھ میں رہے وہ سندھ کی تہذیب، ثقافت، سیاست، اقتصادیات کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرتے رہے۔ اس دور میں سندھ میں قوم پرست سیاست کا عروج تھا۔ اس کو انہوں نے بڑے قریب سے دیکھا۔ سندھ کی سیاست کی داخلی و خارجی الجھنوں کو سمجھ دران کا صلہ پیش کیا۔

شروع شروع میں ان کی کتاب ”سندھ کی تاریخ“ کیلئے لکھنی چاہئے، کو میں نے جب سندھی میں ترجمہ کیا تو اس کے کم از کم تین یڈیشن شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ کئی ناؤل غدار تھے اور بھی چھوٹے

جھوٹے کتابچے ڈاکٹر صاحب کے اس دور کی یادگار ہیں۔ ان کتابوں کو سندھ کے نوجوانوں نے ہاتھوں ہاتھیں اور پڑھا اور اس طرح کافی نوجوان طلبہ کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رابطہ ہونے لگا چنانچہ روزانہ ڈاکٹر صاحب کے پاس سندھ کے کئی شہروں سے طلبہ، اساتذہ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ آتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہم دوستوں کے ساتھ مل کر سندھ کے مختلف شہروں اور دیہی علاقوں میں گئے۔ جہاں کے لوگوں نے ان کے کئی لکچرز کا پروگرام بنایا۔

ڈاکٹر صاحب کے سندھ کی تاریخ پر کام کرنا صرف یہ کہ تاریخ سندھ کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں جاری کام میں تیزی پیدا ہوئی بلکہ تحقیق و ترتیب کے نئے درجے بھی کھلنے لگے۔

گوکہ ڈاکٹر صاحب بعد میں ناہور چلے گئے، لیکن وہاں جانے کے بعد بھی انہوں نے سندھ کی تاریخ کے حوالے سے اپنے کام کو جاری رکھا۔ سہ ماہی ”تاریخ“ کا ایک ضخیم ”سندھ نمبر“ ان کے قیام ناہور کے دوران کی محنت کا ثمرہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب موجودہ دور کے ایک بہت بڑے عالم، محقق اور باعمل مورخ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جہاں سرزمین سندھ کی تہذیب و ثقافت کی تعریف کی ہے وہاں انہوں نے سندھ کی سیاست میں وڈیروں کے موقع پرستانہ کردار کو بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کو اگر ایک دردمند نقاد کے زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو یقیناً سندھ کے نوجوان نس کی ترقی کے نئے ڈاکٹر صاحب کے خیالات ایک موثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لہذا میں امید کر چاہوں کہ ڈاکٹر صاحب سندھ کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے اپنی مزید کاوشوں سے اہل سندھ کو بہرہ مند رکھیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کے احساس کے ساتھ

زبیرہ مصطفیٰ

ہمارے ڈاکٹر مبارک علی کے معاملے میں شاید داخلی دکھ و ایک دھوکہ ثابت ہو۔ یہ ایک ناقابل یقین لگتا ہے کہ ایک بزم گفتار شخص نے سیمینٹسٹ کے نظریہ تاریخ کو روشن خیالی (برل) نقطہ نظر سے بدل کر رکھ دیا ہے وہ ان تمام لوگوں کے لیے ناپسندیدہ شخص قرار پاتے ہیں جو کہ سیاست اور علم و دانش میں کسی بھی تبدیلی شدہ نقطہ نظر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

لیکن اس کے باوجود مبارک علی آج پاکستان میں کثرت سے لکھنے والے (prolific) اور تواتر رکھنے والے تاریخ نویسوں میں سے ایک ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں انہوں نے کئی موضوعات پر بڑی گہرائی سے لکھا ہے یہ موضوعات یورپ کے نشاۃ ثانیہ سے لے کر جنوبی ایشیا میں خواتین کی تحریکوں کی تاریخ سے متعلق بھی ہیں ایک ایسا شخص جو کہ تاریخ نویسی میں کسی بڑی سوچ و بچار یا پھر اپنے کسی بچپن کے خواب کو پورا کرنے کے لیے داخل نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود اس مضمون سے ان کی وابستگی (commitment) بڑی حیران کن ہے انہوں نے تاریخ کے مضمون کو اس چیلنج کے نتیجے میں اختیار کیا جو ان کے ایک دوست کی طرف سے تھا۔ ان کے دوست نے ان کو چیلنج کیا کہ وہ اپنے ایم اے کی ڈگری کے لیے تاریخ کا مضمون اختیار کریں اور اچھے نمبروں سے اس میں کامیابی بھی حاصل کر کے دکھائیں۔

لیکن جب وہ ایک بار تاریخ کے شعبے میں داخل ہو گئے تو پھر ان کو ان کے اساتذہ اور بالخصوص پروفیسر تفعل داؤد اور پروفیسر احمد بشیر شامل ہیں یہ بڑے اچھے اساتذہ تھے لیکن اپنے خیالات میں بڑے رجعت پسند (orthodox) تھے۔ ”بعد ازاں میں نے ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا اور بالکل ہی جدا راہ اپنائی۔“ مبارک علی کہتے ہیں وہ بات جو کہ مبارک علی کو دلچسپ اور relevant بناتی ہے اور ان

کو پڑھنے اور اس کے متعلق بات کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ ہے ان کا ماضی کو حال سے جوڑنے کا فن۔ ان کی تحریروں میں تاریخ ایک زندہ حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے نہ کہ مردہ اور dull واقعات کے طور پر جو کہ عمومی طور پر دیگر تاریخ نویسوں کے یہاں وضع طور پر دیکھا جاسکتا ہے سی طرح نہ تو ان کی کتابیں بادشاہوں اور حکمرانوں کے دیگر گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں جو کہ قوموں کے فیصلے کرنے والے ہوتے ہیں، کسی روایات کے زیر اثر تربیت پانے کے باعث وہ عام لوگوں کی طرز زندگی، ان کی نفسیاتی کیفیت، طبقاتی تضادات اور عمرانی تبدیلیوں کو تاریخی تناظر میں بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

”ہم پاکستان میں عام طور پر بڑی سادگی سے صرف تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں یہ تاریخ صرف دہائیوں اور ان کی فتنہ خیز حیات کے متعلق ہے ہم نے کئی معاملات میں نوآبادیاتی پہلو (perception) اپنا لیا صرف حکمرانوں کی تاریخ رقم کرتے ہوئے ہم نے درحقیقت اپنی تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا بہت ضروری ہے کہ ہم تاریخ کو دوبارہ جاننے کی کوشش کریں اور اس میں عام آدمی، اس کی ثقافت کا ذکر ہو جو کہ اب تک ہم بڑے بڑے طریقے سے نظر انداز کرتے آئے ہیں معاشرہ کے کسی بھی گروہ کو اگر تاریخ میں کوئی جگہ نہ ملے تو پھر وہ بالآخر اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے بحیثیت تاریخ دانوں کے ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم تاریخ نویسی کے اس روایتی طریقے کو ختم کر دیں جس کے تحت مخصوص شخصیات اور واقعات کے گرد توہمات کے کڑے حصار کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ بالآخر سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ جو ماضی پر کنٹرول رکھتے ہیں، وہی مستقبل پر تسلط رکھتے ہیں۔“ مبارک پر بات کرتے ہیں بڑے احساس conviction کے ساتھ۔ وہ بات بڑے دکھ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ساتھ کی دہائی کے اوّل میں جب ہارڈ کی ٹیم کے مشورے پر یوب خان نے تاریخ کے پڑھائے جانے کو ختم کرنے کا اعلان کیا تو دراصل یہ عمل بچوں کو اپنے ماضی سے کاٹ کر دکھ دینے کا آغاز تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امریکیوں کی پٹی کوئی تاریخ نہیں ہے ایک جوں قوم کی طرح ان کی تاریخ نئی دنیا کی تلاش کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے ”اسکولوں میں تاریخ کو نہ پڑھائے جانے کے باعث ہم نے پاکستان کے اسکول جانے والے بچوں کو تاریخ کے احساس سے ہی محروم کر دیا ہے جو کہ ان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اس مضمون کی دیگر مضامین کے مقابل اہمیت کا درست اندازہ لگا سکیں“ وہ کہتے ہیں ”تاریخ کے مضمون کو مطالعہ پاکستان سے تبدیل کر کے رکھ دیا گیا ہے اور یہ مضمون طلبہ کو بڑی ہی محدود (tunnel view) آگاہی فراہم کرتا ہے۔ یہ مضمون نظریہ بندی کا شکار ہے اور نوجوانوں کے ذہنوں کو علم کے ذریعے کنٹرول کرنا چاہتا ہے اس کا واضح نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم عدم برداشت اور تنگ نظر نوجوان نس پیدا کر رہے

ہیں جو کہ تسلسل و ترتیبی کے عمل سے مکمل طور پر سے ناواقف ہے“ وہ کہتے ہیں کہ بحیثیت تاریخ دان انہیں اپنی بات کہنے کی آزادی حاصل رہی جس کو انہوں نے بڑے پسند بھی کیا بحیثیت استاد سندھ یونیورسٹی کا معاملہ ہوا پھر ایک لکھاری کے طور پر ان پر کبھی بھی پابندیاں عائد نہ ہو سکیں ”لیکن شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ماضی کے متعلق بات کر رہا تھا اور اپنی بات کی وضاحت کے لیے میں دستاویزی ثبوت بھی فراہم کر رہا تھا“ وہ یہ بات کرتے ہیں تاریخ کا پنا سفر انہوں نے سدری تاریخ کے معاملے کے ساتھ شروع کیا اور اس مقصد کے لیے انہیں عربی اور فارسی زبانیں سیکھنا پڑیں۔ بعد ازاں ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ اور خصوصاً عہد وسطی کی تاریخ پر زیادہ توجہ دی، بحیثیت ایک حقیقی اور عوامی تاریخ دان کے نہ کہ ایک بسکہ بند نظریاتی (ideologue) ہونے کے باعث مبارک علی نے بڑے تواتر سے لکھنے کے آداب، نئی زندگی، عورت، مذہب، سیاست اور تاریخ میں ڈاکوؤں کے کردار پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے وہ اپنی دو کتابوں ”امیہ تاریخ“ اور ”برصغیر میں مسلمان معاشرے کا امیہ“ کو بڑی ہی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ انگریزی میں لکھی گئی کتاب ”historians dispute“ برصغیر میں مسلمان کمیونٹی کے متعلق ان کے خیالات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں تاریخ نویسی اور تحقیق کو ہماری درس گاہوں میں کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی ہو۔ وہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے پُر امید شخص کو ملک کے تعلیمی ماحول کے متعلق مایوس ہونے پر حیرت انگیز نہیں ہونا چاہئے جب وہ اپنی ڈکریٹ (PHD) کر کے کے لیے جرمنی گئے تو انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ تحقیق کے طریقوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور انہیں یہ بات بھی معلوم نہیں کہ کس طرح مآخذ کے متن کا جائزہ لیا جائے اور اس سے کس طرح کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے۔ ان کو ان بنیادی طریقوں کا فہم حاصل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہماری تاریخ غلطیوں سے بھری پڑی ہے ”ہم بڑی سادگی سے صرف سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں“ وہ کہتے ہیں ”حد تو یہ ہے کہ اسلامی تاریخ جس میں کہ ہم بڑے شوق ہیں اس میں بھی ہم نے کوئی خاص حصہ نہیں ڈالا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری انکمپٹمنٹ نہیں چاہتی ہے کہ ان معاملات میں بات چیت کی جائے جس کے نتیجے میں واقعات کی سچی ظاہر ہو“ وہ دیگر ممالک میں تاریخ نویسی کے رجحانات پر بھی بات کرتے ہیں جہاں اس مضمون میں بڑی ترقی دیکھنے کو ملی ہے مثلاً فرانس میں تاریخ کے غز (annals) نظریے کے مطابق کوئی بھی معاملہ تاریخ کی دسترس سے باہر نہیں ہے لکھاریوں نے تاریخ کے ہر پہلو کو جاننے اور اس کے بارے میں لکھنے کی کوشش کی ہے چاہے وہ لکھنے پڑھنے کی تاریخ ہو، چاہے رونے اور گرہ کرنے کی، خدا کی یا ابلاغ عامہ وغیرہ۔

اغریا میں سبالٹرن (subaltern) نقطہ نظر نے نوآبادیاتی دور کی تاریخ کا نئے معروضی (objective) طریقے سے جائزہ لینے اور ان کی نئی توجیح پیش کرنا شروع کی ہیں۔ تاریخ دانوں کو یقین ہے کہ نوآبادیاتی دور میں لکھی جانے والی تاریخ تعصبات پر مبنی نامکمل تاریخ ہے اب وہ تاریخی حقائق کا از سر نو جائزہ لیتے ہوئے اسے نئے اور معروضی انداز میں رقم کر رہے ہیں لیکن سبالٹرن اسٹڈیز کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ یہ تخلیقی طور پر اس قدر دقیق اور عالمانہ طریقے سے لکھی جا رہی ہے جو کہ عام قاری کی فہم و سمجھ سے باہر ہے اس کے مقابلے میں پاکستان میں تاریخ نویس اب تک دقیق نویسی طریقوں سے تاریخ رقم کر رہے ہیں کیونکہ پاکستان کا حکمران طبقہ تبدیل شدہ اور جدید پیرائے میں لکھی جانے والی تاریخ کو قبول کرنے کو تیار نہیں اور اس کو اس کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ مبارک علی صاحب کے پاس تاریخ رقم کرنے کے دونوں مواقع مہیا تھے وہ انگریزی اشرفیہ کے لیے تاریخ لکھی یہ پھر اردو میں طبقہ عام کے لیے تاریخ رقم کی جائے اور یہ تاریخ "محرور حقیقت" کی تاریخ کے متعلق ہو۔ انہوں نے اشرفیہ کے بجائے عوام کے لیے لکھنے کو ترجیح دی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کبھی کبھار اور بس اوقات انگریزی میں بھی لکھا ہے۔ لیکن ان کی انگریزی میں لکھی گئی تحریروں نے انہیں "سٹیبلشمنٹ" کے حلقوں میں مزید ناقابل قبول بنا دیا۔ رجعت پسندوں کی نظر میں ان کے خیالات بہت زیادہ روشن خیال، مفرد افروز اور لبرل ہیں۔ اسی طرح وہ "طالبان تریشن" کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے رجعت پسند مسلمان مذہب اور تہذیب کو ایک ہی چیز سمجھ بیٹھے ہیں۔ اسی لیے طالبان جدیدیت کو مکمل طور پر مسترد کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ عمل اسلام کی صدیوں پرانی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش ہے۔ کیونکہ ان کی تربیت میں مغرب سے آنے والے علوم کو پڑھنے اور سمجھنے کی تربیت شامل نہیں اس لیے وہ ان کو اخلاقیات کے منافی سمجھتے ہوئے ان کو مکمل طور پر مسترد کر دیتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ مغرب کے ان جدید علوم کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں جو کہ ان کی ضروریات کو پورا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ پاکستان میں کام کرنے والی مذہبی جماعتیں جو کہ اس ملک میں طالبان کے طریقہ حکومت دانے کی خواہش مند ہیں اور اس کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایسی جماعتیں کوئی بھی علمی (intellectual) روایت نہیں رکھتیں۔ مذہبی یہ جدید سائنسی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں اور مذہبی اپنی ارد گرد پائی جانے والی دنیا کے متعلق کوئی گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ یہ قبل از اسلام کی تہذیب کے بھی انکاری ہیں کیونکہ یہ تاریخی شعور سے مکمل نااہل ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کو اس بات پر پورا اعتماد ہے کہ افغانستان کی طرح پاکستان کو طالبان نہیں کیا

جاسکتا۔ کیونکہ پاکستان کا متوسط طبقہ علمی (intellectual) طور پر زیادہ ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہیں اور وہ افغانستان میں طالبان کے طرزِ نگاہ کو پاکستان میں متعارف کرانے کی نئی سے مخالفت کرے گا۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان کے پسماندہ اور دیہی علاقے وہ جگہیں ہیں جہاں توہمات اور علم کی کمی کے باعث ایسے خیالات کو قبولیت کا موقع مل سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خدشہ اپنی جگہ پر موجود ہے کہ متوسط طبقہ پٹی گرفت کمزور کرنا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکومت پر بیرونی ممالک سے امداد دینے جانے والے اداروں کا دباؤ بھی ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ وقت ان لوگوں کے لیے بڑا ہی تکلیف دہ ہے جو کہ اس وقت حکمرانی کر رہے ہیں۔ ان پر دو اطراف سے دھڑکاؤ ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں "میرا خیال ہے کہ بیرونی طاقتوں کا دباؤ اور اقتصادی صورتحال کی وجہ سے بیرونی امداد فراہم کرنے والے اداروں کا دباؤ زیادہ مضبوط ہوگا اور اس کے کامیاب ہونے کے زیادہ امکانات ہیں" زیادہ تر لوگوں کی خواہش ہے کہ ان کی یہ بات ایک لطیف خواہش ہی نہ رہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات تاریخ کے وسیع مطالعے کے تناظر میں کہی گئی بات ہے۔ لیکن ایک حقیقی اور عوامی تاریخ دان کی طرح ڈاکٹر مبارک علی ایک سواں پر زور دیتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ہر با شعور شخص بھی یہ سواں اٹھائے کہ "آخر یہ مذہبی گروہ کس طرح ابھر کر سامنے آئے؟"

ڈاکٹر مبارک علی اس سواں کا جواب سوچنے کے لیے کافی مواد فراہم کرتا ہے۔ اس ملک کا حکمران ملک کے تمام وسائل، دوست اور مراعات پر قابض ہے اور عام آدمی کو کوئی بھی چیز دینے کے لیے تیار نہیں۔ غربت نے جہادیوں کو بزار رخیز میدان فراہم کیا ہے۔ یہ جہادی سمجھتے ہیں کہ وہ سیک نظام کو نظر انداز کرتے ہوئے اس ملک پر اپنا نظام مسلط کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس ملک کا سیک نظام جاگیردارانہ جمہوریت یا پھر فوجی تسلط کو جنم دیتا ہے اور انتخابی عمل میں عوام ان کو منتخب نہیں کریں گے۔ ان مذہبی گروہوں کا خیال ہے کہ کیونکہ وہ انتخابی عمل میں ووٹ حاصل نہیں کر سکتے اس لیے ان کے لیے مسلح جدوجہد کا واحد راستہ رہ جاتا ہے۔

ہجرت اور تقسیم کے تکلیف دہ محاسن سے گزرنے کے بعد زندگی کچھ رواں ہوئی تو مبارک علی حیدر آباد کے علاقے ہیر آباد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ 1956ء میں ادیب کا امتحان پاس کیا۔ اُس زمانے میں ادیب کا امتحان پاس کر لینے کے بعد میٹرک پاس کرنے کے لیے صرف گمریزی کا پرچہ پاس کرنا ضروری تھا چنانچہ 1957ء میں انہوں نے میٹرک کر لیا اور شی کانچ حیدر آباد میں داخلہ لیا۔ یونیورسٹی میں داخلہ کا وقت آیا تو مبارک علی نے تاریخ عمومی کا انتخاب کیا جسے مشکل مضمون مانا جاتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس وقت سندھ یونیورسٹی کے اس شعبے میں محض پانچ طلبہ و سہ داخلہ ہوئے تھے جب کہ اس کے مقابلے میں شعبہ اسلامی تاریخ میں کثیر تعداد میں داخلے ہوئے۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ عمومی میں داخلے کے نتیجے میں اس کا سامنا ڈاکٹر حمد شیر سے ہوا جو شعبے میں تدریس کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔ مبارک علی بتاتے ہیں کہ احمد بشیر سیکور نظریات کے حامل تھے جن کا واحد شوق مطالعہ تھا۔ وہ جب بیکچر روم میں داخل ہوتے تو گویا علم کا ایک سیلاب رواں ہو جاتا۔ ڈاکٹر احمد بشیر کی شخصیت نے مبارک علی کو کافی متاثر کیا۔ ایم اے کے امتحانات میں اول پوزیشن لینے کے بعد ڈاکٹر مبارک نے سندھ یونیورسٹی میں ہی بہ حیثیت جونیئر ٹیچر کیریئر کا آغاز کیا۔ اُس وقت پروفیسر رضی امجدی صدیقی سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے جنہوں نے مبارک علی کو تقرری کے بعد مشورہ دیا کہ وہ کینیڈین میں بیٹھ کر طلبہ، نوان کے خلاف بھلاکانا چھوڑ دیں۔ سندھ یونیورسٹی میں مہزمت کے دوران انہوں نے بیرون ملک اسکا ریشپ کے حصوں کے لیے کوشش کی مگر اُس چانسز کی جانب سے اس کے رستے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ سندھ یونیورسٹی میں سندھی قوم پرستوں کے رویے نے بھی انہیں بہت مایوس کیا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ قوم پرستی میں انتہا پسندی شامل ہو جائے تو معشرے پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مبارک علی کے ساتھ سندھ یونیورسٹی میں امتیازی رویہ جاری رہا۔ ضیاء الحق کی آمریت میں یہ مسعد مزید شدت اختیار کر گیا اور ڈاکٹر مبارک کے خلاف ڈین وروی سیٹلس میں درخواست درج کر دی گئی کہ انہوں نے بے کمرے میں موجود مذہبی کتب جن میں طبری کی تاریخ اسلام، ابن کثیر و دیگر کتب شامل تھیں، مندرجہ ذیل کی ہیں۔ جب اُن سے جواب طلبی ہوئی تو ڈاکٹر مبارک نے مخالفین کو یہ کہہ کر جواب کر دیا کہ کتابیں جلانے کا کام مذہبی لوگوں نے کیا ہے۔ غیر مذہبی لوگ ایسے کام نہیں کرتے ہیں۔

مبارک علی نے سندھ کی تاریخ و ستاویز کی تو انہیں نوجوانوں میں مقبولیت حاصل ہونے لگی اور یوں سندھ یونیورسٹی کی نظامیہ کے ہاتھوں پریشاں مبارک علی سندھ کے مختلف شہروں میں پکچر دینے

ڈاکٹر مبارک علی

اسحاق سومرو

مبارک علی تاریخ کے شاگرد سے تاریخ دان تک پاکستان کے ایک ایسے لکھاری ہیں جنہوں نے تاریخ کو جس طرح سے بیان کیا اور لکھا ہے اس سے تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے میں عام قاری کو بہت مدد ملی ہے۔

مبارک علی نے صرف 11 سال کی عمر میں ٹونک راجستھان سے ہجرت کی جو دراصل برصغیر کے ہزارے کا سفر تھا اور شاید آگے جا کر یہی نکتہ مبارک علی کے تاریخ کے طالع علم سے ایک منفرد تاریخ دان بننے کا سبب بن گیا۔ تاریخ دان مبارک علی کی وادہ نے اُن کی تاریخ پیدائش سے متعلق کہا کہ وہ رمضان کے مہینہ تھا اور بہت زوروں کی برسات ہو رہی تھی چنانچہ انہوں نے خود 21 اپریل 1941ء کو اپنی تاریخ پیدائش قرار دے دیا۔ شاید وہ دنیا کا واحد تاریخ دان ہے جس نے اپنی تاریخ پیدائش خود منتخب کی اور اس کے چل کر پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا تاریخ دان بن گئے۔

مبارک علی اپنے والد کے ساتھ ٹونک سے ہجرت کر کے حیدر آباد آئے۔ اُن کے دادا بھی سنبھل سے ٹونک آئے تھا۔ اس خاندان کی ہر نسل نے ایک سے دوسرے ہجرت کی اور شاید یہی وجہ ہے کہ نہ تو ان کی کوئی بڑی برادری ہے اور نہ ہی کوئی آبائی قبرستان ہے۔ مبارک علی نے اپنے والد اور بیمار دادا کو ساتھ لے کر ٹونک سے موٹا باؤ اور کھوکھرا پار کا سفر کیا اور رات ریگستان میں چادروں کے غیمے میں بسر کی۔ وہاں سے آگے جانے کے لیے ہفتے میں صرف ایک بار ٹرین چلا کرتی تھی۔ یہ دل خراش منظر دیکھ کر مبارک علی سوچا کرتے تھے کہ یا خدا کیا یہ پاکستان ہے؟ انہوں نے وہ ایک ہفتہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزارا ایک سپاہی کی جانب سے گالی دے کر بھاگا دیئے جانے کا واقعہ مبارک علی کے ذہن میں آج بھی تازہ ہے کیوں کہ وہ اُن کے لیے ایک غیر متوقع تجربہ تھا۔

جانے لگے۔ ایم آر ڈی تحریک کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مبارک کے پیچھڑنے سندھی نوجوانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا لیکن ہمارے ملک و معاشرہ ڈاکٹر مبارک کی صلاحیتوں سے کھل کر فائدہ نہ اٹھا سکا۔ تاریخ عمومی میں طلباء کی دلچسپی نہ ہونے کے برعکس رہی۔ ایک بار سندھی قوم پرست گروپ سے تعلق رکھنے والا نوجوان شجے کے ایک طالب علم جو پورے سمسٹر کے دوران غیر حاضر رہا تھا، کے فارم دستخط کروانے آیا تو مبارک علی نے نکار کر دیا جس پر وہ نوجوان ہوا کہ تو ہوتا کون ہے فارم بھیجنے سے انکار کرنے والا اس رویے نے ڈاکٹر صاحب کو یونیورسٹی سے مکمل طور پر بددین کر دیا۔ یوں بہ طور طالب علم، پیچھڑ، پروفیسر اور صدر شجہ جمہوری تحریک چھل گزرنے کے بعد ڈاکٹر مبارک علی نے 1989ء میں سندھ یونیورسٹی کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سندھ یونیورسٹی کی بد نصیبی تھی کہ وہ ایک قابل فخر استاد سے محروم ہوئی اور انفرادی و اجتماعی تعصب کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے لیکن تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ایسے نادروں تا یاب افراد کی قدر و قیمت میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور نقصان صرف اداروں کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی دوسروں کی شرائط پر زندگی گزارنے کے قائل نہیں ہیں اور یہی اصول پرستی ان جیسے لوگوں کو منافق معاشروں میں سکون سے جینے نہیں دیتی۔ میں اُن بد قسمت افراد میں شامل ہوں جو سندھ یونیورسٹی میں دو رطب بھی کے دوران خواہش کے باوجود ڈاکٹر مبارک علی سے ملنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا اور اس خواہش کے پورا ہونے کے لیے مجھے 1995ء تک انتظار کرنا پڑا جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میری خوش نصیبی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے درخواست قبول فرمائی اور یوں راتوں میں اُن کی رہائش گاہ پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ سندھ میں انہیں پڑھا جاتا ہے اور یہ کہ سندھ کے عوام خصوصاً طلباء دیگر صوبوں سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ سندھ کے کئی شہروں اور قصبوں میں جا کر طلباء سے بات چیت کرتے رہتے ہیں تاکہ اُن کی ذہنی تربیت کی جاسکے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ اثر دوسرے روز نامہ ”الکھ“ نے صفحہ اول پر شائع کیا۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتابوں اور مضامین میں مسخ شدہ تاریخ کی اصل تصویر سامنے لاتے رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں 1965ء کے بعد قدیم تاریخ اور سندھ کی تہذیب کو سرکاری نصاب سے ہی خارج کر دیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ جو سرکاری نصاب سے باہر ہے وہ تاریخ کا حصہ ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے مضامین میں جبر کا استعمال کر کے اقوام و خطوں پر قبضہ کرنے والوں کو بھی ہیر و ہمانے اور خطا بات دینے جانے کی محاشہ کرتے ہوئے کہا کہ حمد و رکھی بھی ہیر و اور معزز نہیں

ہوتے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق تاریخی مقامات کی ایک علیحدہ پہچان ہے اور موہن جو دڑو کے آثار کے دریافت کے بعد یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ یہ خطہ بھی کسی زمانے میں دنیا کی عظیم تہذیب کا امین تھا اور اس حقیقت میں برصغیر کی آزادی نے بھی اہم کردار ادا کیا کیونکہ اس سے پہلے اس خطے میں رہنے والے لوگوں کو تہذیب یافتہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ ہندو پاک پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور اقتدار کے اصل مالکان سے ہٹ کر ایک غیر جانبدار مصنف اور مورخ کے طور پر خود کو منوایا۔ وہ کہتے ہیں کہ دونوں اطراف کے اسٹیمشنسٹ کے حمایت یافتہ مورخین اور دانشوروں نے تاریخ کو مسخ کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اب تک ہمارے پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ جانبدار اور تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ کا درست تجزیہ کر کے اس کو از سر نو ترتیب دیا جائے اور قاتحین کے بجائے عام لوگوں کا نقطہ نظر اچا کر کیا جائے۔ اب تک تہذیب کے لباوے میں لپٹی ہوئی تاریخ کو درست انداز میں لکھنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں اقتدار اعلیٰ کے اصولوں کے خلاف تاریخی جج آشکار کرنے پر پولیس نے بھی ڈاکٹر صاحب کو ہراساں کیا۔ تفتیش کے نام پر کئی مرتبہ ان کے گھر پر پولیس نے چھاپے مارے، گھر والوں کو ہراساں کیا اور ان کی تذبذب کی گئی۔ ڈاکٹر مبارک علی کے خلاف لہور پولیس نے چار ایف آئی آر بھی درج کیں جیسے وہ ایک عام نہیں بلکہ دہشت گرد ہوں۔ بین الاقوامی شہریت یافتہ تاریخ دان جو دنیا کی کئی نامور جامعات میں پاک و ہند کے تاریخ پر لیکچر دیتے رہے ہیں، ان کے گھر پر چھاپے مارے گئے اور ایک پولیس انسپکٹر تفتیش کے لیے چھاپے مارے تو کسی قوم کے لیے یہ ذوب مرے کا مقام ہے۔

روشنی اور روشن خیالی کا استعارہ — ڈاکٹر مبارک علی

محمد براہیم خلیل

تاریخ کے ہر دور میں چند ایک ایسی شخصیات ضرور موجود رہی ہیں جنہوں نے اپنے معشروں پر اثر ڈال اور تاریخ ساز ہوئے۔ یہ بات صرف حکومت اور سیاست تک محدود نہیں ہے بلکہ ادب، فلسفہ، تاریخ اور فنون لطیفہ میں ایسی صاحب کماں ہستیاں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہے جو کہ ایک مورخ ہوتے ہوئے بھی ایک تاریخ ساز شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی شناسائی اُن کی out of box تحریروں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ پشاور میں کتابوں کی ایک بڑی دکان میں کتابوں کی الٹ پھیر کے دوران اُن کی ایک کتاب ”برصغیر میں مسلمان معاشرے کا امیہ“ ہاتھ لگی۔ یونہی ہاتھ میں اُٹھ کر دیکھا کہ دیکھیں یہ صاحب معاشرے اور اُس کے ایسے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ یہ مختصر کتاب میں نے ایک ہی نشست میں حتم کر ڈالی۔ کتاب اگرچہ تاریخ کی دیگر ضخیم کتابوں کے برعکس مختصر تھی لیکن سوچنے کا جو طریقہ درمیان میں یہ کتاب دے گئی وہ بڑی بڑی کتابیں نہ دے سکی تھیں۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ کسی نے تاریخ کو ہمارے سامنے اُس کی اصل شکل میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد تو میں ڈاکٹر مبارک علی صاحب کی تحریروں کا باقاعدہ فہم ہو گیا۔ اس سے پہلے تو ہمارے دل و دماغ میں تاریخ کا بڑا روکھا ٹوکھا اور پھیکا تصور تھا۔ تاریخ کو ہم صرف بادشاہوں کے فتح و شکست اور فاتحین اور شکست خوردہ قوتوں کے درمیان آویزش کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن یہ پہلی دفعہ تھا کہ کسی نے ہتھیاز ہسٹری کو ہماری نگاہوں کے سامنے رکھا تھا اور ہمیں بتایا تھا کہ تاریخ صرف بادشاہوں کے کارناموں اور فاتحین کے شوکت و عظمت کا نام نہیں بلکہ عام آدمی بھی تاریخ کا اتنا ہی اہم کردار ہے جتنا کہ ایک بادشاہ یا فاتح ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری تقریباً ہر اتوار کو فون پر بات ہوتی ہے۔ جتنا چاہتا ہوں کہ قلم سے اتنا ہی

جامد رہتا ہوں۔ بلکہ اُس سے زیادہ اُن کا اخلاق اور لہجہ بھی ہے۔ ہر سوال کو نہایت صبر و تحمل سے سنتا اور پھر نہایت اطمینان سے اُس کا جواب دیتا اُن کا خاصہ ہے اور یہی ستر اعلیٰ طریقہ کار اُن کو اُن کے دوستوں اور چاہنے والوں میں مقبول بناتا ہے۔

پہلی ورس نے شاید مطلق سچائی کے متعلق کہا تھا کہ یہ ایک مدھیری رات میں روشنی ادا کی طرح ہے۔ جو کوئی جتنا اُس کے قریب ہوگا وہ اتنا ہی روشن ہوگا اور جو کوئی جتنا دور ہوگا اسی نسبت سے اُس کی روشنی کم دکھائی دے گی۔ لیکن روشنی ہر جگہ ضرور ہے۔ شک، اگرچہ اُس صاحب مکانی حساب سے ہم سے دور ہیں لیکن اُن کی روشنی اُن کی تحریروں کی صورت میں برابر ہم کو مل رہی ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن اور عقل و دانش کا کاروبار ہزاروں سال کی مسافت کے بعد موجودہ جگہ پر پہنچا ہے۔ ہمارا دور تاریخی کے عہد دنیا میں روشن خیالی اور خرد افروزی کی صبح ہو گئی۔ فرائس میں خرد افروزی کا سورج ایک نئی صبح کی نوید دے رہا تھا۔ ایک ایسی صبح کا وہ جس کو کہیں بھی زوال کا نشانہ نہ تھا؟ آج اکیسویں صدی میں دنیا جس مقام پر کھڑی ہے اُس کا آغاز فرائس کے اُس خرد افروزی کی تحریک سے ہی ہوا تھا ورنہ وہ جگہ بھی آج ہماری طرح تنویر گندوں سے کام چلنے کی ناکام کوشش کرتے نظر آ رہے ہوتے۔ برصغیر پاک و ہند میں خرد افروزی و عقل پرستی کا علم سب سے پہلے علامہ نیا فتح پوری نے لگایا تھا۔ اگرچہ اس نے پہلے سرسید احمد خان نے اس کا آغاز کر دیا تھا لیکن نیا صاحب درمیان میں اس کے رسالے ”گلزار“ نے صحیح معنوں میں روایات و معتقدات کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ اس نے بعد کے۔ میمر شرف، سید سبط حسن، علی عباس جد پوری، اور ڈاکٹر مبارک علی اس علم کو اٹھائے آگے کی جانب گامزن ہیں۔ اگرچہ تاریکی کے پجاریوں نے اس علم کو مٹا دیا اور اس جہاں کو بجھانے کی سبھی کوششیں کیں۔ لیکن بھلا سورج و طوفان ہونے سے کوئی روک سکتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کبھی بھی انجمنی مشمت کے لئے قابل قبول نہیں رہے۔ قدم قدم پر اُن کی رائے رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ اُن پر ملک کے تاریخی اداروں کے دو ذمے بند کئے گئے۔ انہیں جھوٹے مقدموں میں پھنسا دیا گیا تاکہ انہیں اپنی راہ سے ہٹنے پر مجبور کیا جائے۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ اس کے برعکس ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جو لوگ روشنی اور سچائی کے راستے پر چلے ہیں وہ گھپ اندھیروں کو بھی روشنی دے گئے ہیں۔ لہذا یہ ڈاکٹر صاحب بھی اسی راہ کے رہے ہیں۔

تیسری دنیا اور خاص کر عالم اسلام میں اور پھر پاکستان میں تاریخ نویسی کبھی بھی پھولوں کی بیج نہیں رہی ہے بلکہ یہ ہمیشہ کانٹوں کی بیج رہی ہے۔ یہاں پر ہر حکم و وقت نے تاریخ کو اپنے انداز سے

دیکھتے اور لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر کسی نے اپنے آپ کو ”زندہ پیر“ اور دوسروں کو ظالم و غاصب دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس دو تہذیبوں کے بیچ کسی نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے تو وہ ڈاکٹر مبارک علی ہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اعتدال اور غیر جانب داری کی اس تہی ہوئی رشتی پر بڑے یقین اور اطمینان سے چل رہے ہیں اور یہی اطمینان اور یقین وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے قاری کو منتقل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتابیں سندھی اور دیگر پاکستانی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک سہ ماہی رسالہ ”تاریخ“ کے نام سے بھی نکالتے ہیں۔ اس رسالے میں وہ خود بھی لکھتے ہیں اور اپنے دوستوں سے بھی مختلف موضوعات پر مضامین لکھواتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بھر میں ہونے والی تاریخ اور اس پر تحقیق کے موضوع پر چھپنے والے مضامین کو بھی ترجمہ کر کے شائع کئے جاتے ہیں۔ پاکستان میں عام طور پر سنجیدہ کتابوں کی اشاعت کم ہوتی ہے اور وہ کبھی بھی کم ہیں لیکن ڈاکٹر مبارک علی کی کتابیں ہٹ کیک کی طرح بکتی ہیں اور ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر مبارک علی اور اس کی تحریروں کی مقبولیت کی ایک بڑی دلیل ہے اور اس بات کی بھی ایک دلیل ہے کہ آنے والا دور روشنی اور روشن خیالی کا ہے۔ بقول شاعر۔

اک ذرا مہر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

ڈاکٹر مبارک علی — ایک دوست کا تاثر

راحت سعید

آج ڈاکٹر مبارک علی تاریخ نویسی کے حوالے سے پوری دنیا میں پاکستان کی پیچہ بن چکے ہیں۔ ان کی سادہ سے زائد کتابیں، سہ ماہی ”تاریخ“ کتابی سلسلے کی شاعتیں اور سیکڑوں علمی و تعلیمی کام اور مضامین ہیں جن کے باعث وہ ملک کے کثیر ترین تحریروں کے مصنفین کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔

مجھ سے ڈاکٹر مبارک علی کا پہلا تعارف سندھ کے ایک محترم سیاسی رہنما جناب جمال الدین بخاری نے 1985ء میں کراہ تھا۔ انہیں دنوں سندھ کے ایک مذہبی خانوادے کے رہنما مولوی شہاب الدین نے بھی ان کی دو ڈبلی پتلی کتابوں کے ذریعے ڈاکٹر مبارک سے ہم دوستوں کی ملاقات کرائی۔ ان کتابوں کی خطاطی بھی خود ڈاکٹر مبارک علی ہی کے ہاتھ سے کی ہوئی تھی۔

ان دونوں بزرگوں نے ڈاکٹر مبارک علی کی تعریف یوں کی تھی وہ ایک ایسے عالم اور استاد ہیں جو پاکستان میں تاریخ کی مسخ شدہ صورت حال کو اپنی تحریروں کے ذریعہ تبدیل کرنے اور صحیح تاریخ نویسی کے لئے جرأت آزمائی کر رہے ہیں۔

یہ کتابیں پڑھ کر یوں لگا کہ جیسے ڈاکٹر مبارک علی اپنے ہی جھنڈ کے پھڑے ہوئے آہوڑم خوردہ ہیں۔ طبیعت مفرح ہوئی اور ڈاکٹر مبارک علی کے لئے احترام کے ساتھ ساتھ محبت کا جذبہ بھی بیدار ہوا جو آج تک موجود ہے۔

بعد میں ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ میری ہر کاوش کو ڈاکٹر مبارک علی کی کم و بیش حمایت حاصل رہی۔ ارتقاء کتابی سلسلہ کا اجراء ہوا اور ارتقاء انسٹی ٹیوٹ کا قیام یا پھر اس ادارے کے پیٹ فارم سے مختلف النوع اجتماعات کا انعقاد ہوا، ڈاکٹر مبارک علی کا تہ دن شامل حال رہا۔

ہم دونوں کا باہمی تعلق خاندانی تعلق میں تبدیل ہوا۔ گھروں میں آنا جانا شروع ہوا۔ کئی بار کراچی

آنے پر وہ لاکھ زحمت کے باوجود غریب خانے پر قیام کرتے اور میں جب کبھی لاہور جاتا تو ان کی بے حد خلقی بیگم ذکیہ زیدی پر اپنی مہربانی کا بوجھ ڈالتا۔ بلکہ ایک سے زائد بار تو پورے خاندان کا بوجھ ہی انہیں اٹھانا پڑا۔ یوں محبت و خلوص کے رشتے ہمارے خاندانوں کے مابین استوار ہوئے۔

اگرچہ سب دنیا بھر کی طرح میں بھی ان کے مدائین اور چاہنے والوں کا ایک وسیع و عریض حلقہ سے جس میں گھر سے ہونے کے باعث ڈاکٹر مبارک علی سے پہلے جیسی کثرتِ ہمت و تڑپ سے مدد قاتیں نہیں ہوتیں۔ مگر ان سے ان محبت کے جذبات میں ذرا بھی کمی نہیں تھی۔ اپنی نسبت کے عجب رے طور پر ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی ایک کتاب بھی میرے نام معنون کی ہے جو میرے لئے سرمایہ ہے۔

حق بات یہ ہے یہ مختصر تحریر میں نہ تو ڈاکٹر مبارک علی کی تحریک و توصیف کا حق اداس ہو سکتا ہے، اور نہ ان کے علمی کارناموں کا اعتراف، ورنہ یہ کام آج ملک کے طلباء، اساتذہ اور روشن خیال حلقوں کی طرف سے کیا ہی جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ تحریر کے غازی ہیں۔ ان کی بے باک تحریروں سے بہت لوگ متاثر ہوئے ہیں ورنہ آج ملک میں مستحکم شدہ جھوٹ کے بخیہ دھڑلے کے تھوڑے بہت آثار دکھائی دیتے ہیں تو بلاشبہ ان میں ڈاکٹر مبارک علی کی مساعی کا بھی حصہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی باتواری خودنوشت میں لکھا ہے کہ "پاکستانی سوسائٹی کا امید یہ ہے کہ جیسے جیسے یہ سیاسی، معاشی اور سماجی طور پر غیر مستحکم ہوتا چلا گیا، اسی طرح اس میں قدامت پرستی کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ جب قدامت پرستی کی زنجیریں مضبوطی سے لوگوں کو اپنی رُفت میں لے لیتی ہیں، جب ذہن روایات کی جھلکیوں میں اسیر ہوتے ہیں، تو اس وقت مشکل ہوتا ہے کہ اس قید سے کیسے آزاد ہو جائے۔"

ڈاکٹر مبارک علی چونکہ اپنے ہی الفاظ میں "روایات اور قدامت پرستی کے مغر فہم میں سے ہیں" ہذا زندگی گزارنا انہیں مشکل بھی پڑا ہے اور مزہ کا بھی۔ مگر صریح دروغ پر مبنی کہیں جاسے، اہل تاریخ کی پرہیزگاری اور صحیح تاریخ نویسی کے لئے، تعداد مضامین و کتابت کو تحریر کرنا اور شرح کرنا کسی مجاہد سے کم نہیں۔

علمی و سماجی منافقتوں سے منظر اور اپنے نظریاتی موقف پر تمام تر مغلزنیافتوں، محامضوں کی ریشہ و دنیوں، ایذا دہنی، معاشی تکیفوں اور معاشرے کی عمومی ناقدی کے باوجود ثابت قدم رہنے، اپنے مشن کو جاری رکھنے اور علم تاریخ کا شعور عام کرنے کے سبب میرے دل میں ان کی محبت اور میری نظروں میں ان کا وقار اور احترام بڑھتا ہی گیا ہے۔

ڈاکٹر مبارک چونکہ علم کے ایک بچے رسیا اور اس میدان کے پتے کار گزار ہیں لہذا وہ جانتے ہیں کہ "مکمل تحریر یہ تقریر کے ذریعہ معاشرے میں تبدیلی نہیں آتی ہے، تبدیلی کے لئے سیاسی عمل ہی راستہ ہے اور اس کے لئے سیاسی جماعت یا جماعتوں کا تبدیلی کے لئے تحریک چلانا لازمی امر ہے۔ مگر تبدیلی کی ضرورت کا احساس دوانے والی تحریروں و تقریروں کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں کہ "پاکستان کو ایسے دانشوروں کی ضرورت ہے جو بدلتے ہوئے حالات میں سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کی نشاندہی کرتے ہوئے نئے خیالات اور افکار پیدا کریں۔"

باخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حمزہ علوی، سہیل حسن، علی عباس جلاپوری، ضمیر نیازی جیسے دانشوروں کی فہرست میں ڈاکٹر مبارک علی بھی ایک ایسے ہی دانشور ہیں جن کے دم سے جہالت، توہم پرستی، قدامت پرستی کے ٹھپ اندھروں میں روشنی کے جھمکے ہوتے ہیں اور امید کی کرن نظر آتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس عہد خرابی، ملک نا پرساں اور علم دشمن معاشرے میں مبارک علی ان خاص خالص ہستیوں میں ہیں جو اس عہد میں لوگوں کے لئے مثالیہ اور Role Model ہیں۔

تاریخ کا شعور اور ڈاکٹر مبارک علی

مقتدا منصور

1960ء کے عشرے میں تقریباً ہر پڑھنے لکھنے والے کلاس گھر نے میں نسیم جوری کے ناول پڑھنے اور رکھنے کا فیشن ہوا کرتا تھا۔ اس ناولوں کے پڑھنے پر عمر کی پابندی بھی نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ عام طور پر بچوں کو رومانوی ناول پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، لیکن نسیم جوری کے ناولوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی، کیونکہ والدین کا خیال ہوتا تھا کہ ان ناولوں کے پڑھنے سے بچوں کی ادبی تاریخ سے آگاہی حاصل کرے گی۔ حالانکہ تاریخ کے نام پر ان ناولوں نے بدل کلاس میں جو تہذیبی نزکیت ڈھنوں میں پیدا کی، آج وہ اس معاشرے کی جان کی سبب بنی ہوئی ہے۔ انھوں نے اور نویں جماعت کے دوران ہمیں بھی نسیم جوری کے ناول پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ابتدا میں ہم بھی ان ناولوں کے مٹھی رے سے محظوظ ہوئے اور ہمیں اپنی تاریخ سمجھنے لگے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہتا تو ہمارے ذہن میں بھی اس تہذیبی نزکیت کا خمار پانت ہو جاتا اور ہم بھی اسی راستے پر چل رہے ہوتے جس پر بہت سے ہم وطن کاغذات ہیں۔ وہ تو بھلا ہو NSF کا میٹرک پاس کرنے کے بعد جس کے رکن بنے اور جس نے ہماری ذہنی و فکری تربیت میں کلیدی کردار ادا کرتے ہوئے ہمیں حقیقت پسندانہ انداز میں معاملات و مسائل کے بارے میں سوچنے اور سمجھنے کا شعور بخشا۔

یہ س زمانے کی بات ہے، جب طلباء تنظیمیں سمجھنے کی بجائے بحث و مباحثہ اور دیل و مکار کے درجہ اپنے نظریات پر وہان چڑھنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ اس مقصد کے لئے ان کے یہاں باقاعدگی کے ساتھ ہفتہ وار اسٹڈی سرکلو کا انعقاد ہوا کرتا تھا، جن میں شرکت لازمی طور پر کتب بینی سے مشروط ہوتی تھی۔ NSF میں شمولیت اور سندھی سرکلو میں شرکت سے کئی فوائد ہوئے۔ اول یہ کہ صرف نصابی کتب پر تکیہ کرنے کی بجائے مختلف موضوعات پر کتب بینی کی عادت پڑی، جو آج تک قائم ہے۔ کیونکہ اسٹڈی

سرکل کی بر نشست میں کسی نہ کسی موضوع پر بحث ہوتی اور اس میں لازمی طور پر شرکت کرنا ہوتی تھی۔ بغیر پڑھنے ان مباحث میں شریک ہونے کا مطلب اپنی سبکی کرنا تھا۔ دوئم، سائنس کا طوطا مسموم ہونے کے باوجود سماجی علوم کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ سوئم، سماجی مسائل کو سمجھنے اور ان کا سائنسی انداز میں تجزیہ کرنے کی ہیئت میں مصروف ہوا۔ ان اسٹڈی سرکلو میں تاریخ پر خصوصی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس سے تاریخ کے مطالعہ میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ سکھر میں دو بڑی پبلک، بھیریری تھی۔ ایک معصوم شاہ میونسپل لائبریری اور دوسری جنرل لائبریری۔ ان دونوں لائبریریوں میں تاریخ پر خاصی کتب تھیں، جن میں گمریزی، ردو اور سندھی میں بھی کتب شامل تھیں۔ لیکن یہ زیادہ تر بیاہ تھیں۔ جنرل لائبریری میں ابن حلدون کے مقدمہ، پنج نامہ اور باری سٹیٹ مرحوم کی "کھنٹی بہادر کی حکومت" پڑھنے کا موقع ملا۔ انہی دنوں سید حسن مرحوم کی موسی سے مارکس تک ورپا ستان میں تہذیب کا ارتقاء شائع ہو گیا۔ ان دونوں کتب نے ذہن میں لگے چائے صاف کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت مختلف محفلوں اور مذاکروں میں یہ بات ہوا کرتی تھی کہ گمریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں تو تاریخ کا ہر پہلو سے جائزہ موجود ہے، لیکن اردو میں ایسی کتب کا فقدان ہے، جو تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کریں۔

سکھر سے گریجویشن کرنے کے بعد ماسٹر ڈگری کے لئے سندھ یونیورسٹی چانا ہوا۔ اس زمانے میں سائنس فیکلٹی کے شعبہ جات تو با مشورہ منتقل ہو گئے تھے، لیکن "سائنس فیکلٹی ہنوز حیدر آباد والے پرانے کیمپس میں تھی۔ طلبہ سیاست سے تعلق کی وجہ سے اکثر و بیشتر وڈ کیمپس چانا ہوتا تھا۔ وہاں کسی دوست سے بتایا کہ شعبہ تاریخ میں ایک استاد مبارک علی خاں نام کے ہیں، جو تاریخ کے مختلف موضوعات پر ترقی پسندانہ اور تجزیاتی انداز میں مضامین لکھ رہے ہیں۔ لیکن کچھ طلبہ سیاست کی سرگرمیوں اور کچھ تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ با مشورہ میں اوپر مذکور نے کے بعد سکھر اور پھر کراچی آگیا۔ کراچی آنے کے بعد ان کی کچھ تحریریں نظر سے گذریں اور ایک دو کتابیں بھی سامنے آئیں۔ جن سے ان کی سوچ کا ہی نہیں بلکہ تاریخی موضوعات کو تجزیاتی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوا۔ اگلے دس برسوں کے دوران ان کی کئی کتابیں مارکیٹ میں آچکی تھیں اور بامی بازو کے حلقوں میں ان کی حاصی پڑ پڑی ہو رہی تھی۔ میں خود بھی ان کا مستقل قاری بن چکا تھا۔ ورنہ کے طرز تحریر سے خاصہ متاثر تھا۔ خاص طور پر سندھ کی تاریخ کے بارے میں ان کے حقیقت پسندانہ (Rational) خیالات نے خاصی دھوم مچائی۔ بعض حلقوں نے ان پر تنقید بھی کی لیکن مثبت سوچ رکھنے والے حلقوں نے ان کے اس جرات مندانہ اقدام کو کھس کر سراہا۔ میرے دل میں بھی ان کے لئے

غیر نہ احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ مگر ملاقات پھر بھی نہ ہو سکی۔ ایک روز اتفاقاً درمراحت معید سے ملاقات کے لئے گیا، تو وہاں درمیانی قامت، کشادہ پیشانی، کھلتی ہوئی گوری رنگت اور مسکراتی آنکھوں پر مونا سا نظر کا چشمہ لگائے ایک صاحب سے موجود تھے۔ راحت سعید صاحب نے تعارف کر دیا کہ یہ معروف تاریخ دان ڈاکٹر مہارک علی ہیں۔ اس طرح ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وغیرہ کسی جھجک بھائی بے تلافی کے ساتھ ملے اور کافی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی رہی۔ یہ غالباً 1980ء کی دہائی کے آخری برسوں کی بات ہے۔ کچھ دنوں بعد معید صاحب نے سندھ یونیورسٹی سے استعفیٰ دیدیا ہے اور لاہور منتقل ہو گئے ہیں، جہاں انہوں نے گونے اسٹینڈیوٹ کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔

اس دوران زاہدہ حنائی نے روشن خیال کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ شروع کیا۔ جس میں ہمیں نائب مدیر کی ذمہ داریاں تفویض کیں۔ اگلے برس ہمیں خاندان کی ایک تقریب میں شرکت کی عرض سے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم سے ملنے والے بورڈ میں قیام کے دوران کیوں نہ لگے ہاتھوں کچھ ہم شخصیات کے ٹیویو پروگرام بھی کر گئے جاتے۔ لہذا یہ سب ہوا کہ صفدر میر مرحوم، قاضی جاوید اور ڈاکٹر مہارک علی کے ٹیویو پروگرام کے لئے جاتے۔ ہذا اس ٹیویو کے ہانے ڈاکٹر صاحب سے دوسری طویل ملاقات گونے اسٹینڈیوٹ میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ یہ ملاقات ہماری ان کے ساتھ دائمی دوستی و راحت کے تعلق کی بنیاد بنی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مسلسل رابطہ رہنے لگا۔ وہ ان دنوں خاصے مطمئن و خوش تھے ورسدہ یونیورسٹی میں ہونے والی تکیوں کو سہلانا چاہتے تھے۔ گوکہ گونے اسٹینڈیوٹ میں ان کی مدد مست بھی ماحولی ثابت ہوئی اور اگلے برس اس سے بھی مستعفی ہو گئے۔ لیکن لاہور کو بہر حال انہوں نے اپنا مستقل مستقر بنالیا اور ملازمتوں کی بجائے اپنی پوری توجہ تصنیف و تالیف پر مرکوز کر دی۔ وہ گزشتہ 24 برس سے لاہور میں مقیم ہیں۔ جہاں رہتے ہوئے انہوں نے تاریخ کے مختلف موضوعات پر معرکہ آرا کتب کے علاوہ ایک تحقیقی جریدہ ”ماہی“ تاریخ“ بھی شائع کرتے ہیں۔ جس کے اب تک 45 شمارے مارکیٹ میں آچکے ہیں اور اس مضمون کی اشاعت تک 46 شمارے بھی منظر عام پر آچکا ہوگا۔

گونے اسٹینڈیوٹ میں ہونے والی ملاقات سے قائم ہونے والی دوستی تا دمِ تحریر قائم ہے۔ وہ جب بھی کراچی آتے ہیں ان سے ملاقات، نرمی ہے، بشرطیکہ میں شہر سے باہر نہ ہوں۔ ڈاکٹر کھری طبیعت کے مالک ہیں۔ دل کی بات زبان پر آئے ہیں۔ منافقت اور چالوسی نہیں چھوڑ بھی نہیں گدڑی۔ اسی عادت کے سبب کئی انہیں مزیت بھی اٹھانا پڑتی ہے۔ بہت سے لوگ

ان کی صاف گوئی کو ناپسند بھی کرتے ہیں۔ لیکن سمجھ دار اور با اصول لوگوں کی نظر میں ان کی سنی عادت کی وجہ سے ان کی قدر و منزلت دو چند ہوئی ہے۔ ان میں برسوں کے تعلق میں میں نے کئی انہیں کوئی غیر معقول یا بے صولی کی بات کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی انہوں نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر دوستوں کو زیر و برکتیں کیا۔ وہ اپنی کھال میں مست رہنے والے قلندر صفت انسان ہیں، جن کی زندگی کا سرمایہ ان کا علم اور قناعت پسندی ہے۔ واقعی ایک سچے اور کھرے دانشور کی تمام خصوصیات ان میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر مہارک علی اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی تاریخ کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ انگریزی روزنامہ ڈان میں ہفت روزہ کام ماضی اور حال کے عنوان سے کئی برسوں سے تحریر کر رہے ہیں۔ ان کی تاریخ کے مختلف موضوعات پر ساتھ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں مشعل و بار، سندھ کی تاریخ کیسے لکھی جائے، تاریخ اور فلسفہ، تاریخ، تاریخ اور عورت، علماء و سیاست، تاریخ و دانشور، تاریخ و آج کی دنیا، تاریخ و آئینگی، برطانوی راج، اکبر کا ہندوستان، جہانگیر کا ہندوستان وغیرہ نے خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کے علاوہ ان کی دو سوانح و رد و تھوکر کھائے۔ میری دنیا بھی شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر مہارک علی کی تحاریر سادہ زبان، پرکشش انداز بیان اور پرمغز و مائل کی وجہ سے اثر انگیز ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کو متاثر کرتی ہیں اور تاریخ کو پڑھنے پر راغب کرتی ہیں۔ اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ سب سے بڑی مثال تو خود میرے اپنے گھر کی ہے۔ میری بیٹی ارم جو انٹر میڈیٹ میں پری میڈیکل کی طالبہ تھی۔ امتحانات کے بعد تین ماہ کی فراغت کے دوران اس نے میری کتابوں کی الماری سے ڈاکٹر صاحب کی کتب کا مطالعہ شروع کیا اور اسے تاریخ میں دلچسپی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تقریباً 90 فیصد کتاب میرے پاس ہیں۔ جب ریمٹ آیا تو اس نے فرسٹ کلاس میں انٹر پاس کر لیا تھا۔ ہم اس کے میڈیکل کالج میں داخلے کا اٹھنے کا انتہار کرنے لگے، کہ ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا کہ چچا، اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں۔ میں نے کہا کہ کہو۔ اس نے کہا کہ اگر میں میڈیکل کی بجائے تاریخ کا مضمون پڑھاؤں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ میری ذمہ داری صرف تہذیبی ضروریات کی تکمیل ہے۔ نہ کہ تہذیب کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے۔ میری بیٹی ارم اس وقت تاریخ میں ایم اے کی پڑھ رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہم اسے کراچی ہے۔ اس کے ذوق اور لگن کو دیکھتے ہوئے میری سب سے بھائی بیٹی۔

بھی سائنس چھوڑ کر تاریخ کے کلیدی مضمون کے ساتھ بی اے (آنرز) میں داخلہ لیا ہے۔ ارم کے پاس ان کے ڈان سنڈے میگزین اور بیگ ورلڈ میں شائع ہونے والے مضامین کی پوری فائل موجود ہے، جو اس کی تاریخ سے دلچسپی اور ڈاکٹر مہارک سے عقیدت کا اظہار ہے۔

دوسرا قد جنوبی ہوچستان کے علاقے دشت کا ہے۔ 2005ء میں پذیرجہ کار تربت سے گوادر جا رہا تھا۔ رستہ سنگھ خ اور بے آب و گیاہ تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد اس بیابان میں ایک جگہ پانی کا ایک تالاب اور اس کے ساتھ تھکی ہوئی پر ذریعہ روکی تاکہ انجن کو ٹھنڈا کیا جاسکے۔ درہم لوگ چائے پی کر تازہ دم ہوئیں۔ میں جیسے ہی ہوٹل کے اندر داخل ہوا، میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ کادونر پر ایک کونے پر ڈاکٹر مہارک کی تین چار کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ میرے استفسار پر کادونر پر بیٹھے ایک انتہائی مہذب اور شائستہ نوجوان نے بتایا کہ وہ ہوٹل کے مالک کا بیٹا ہے، اپنے والد کا ہاتھ دیتا ہے۔ اس نے نر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کا کہنا تھا، ڈاکٹر مہارک علی کی تحاریر نے اسے سیاسی و سماجی مسائل کو سمجھنے کا شعور دیا ہے، اس لئے فارغ اوقات میں وہ ان کی کتب کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر مہارک کی جب کوئی نئی کتاب شائع ہوتی ہے تو کراچی میں اس کا کزن وہ کتاب خرید کر اسے بھجواتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے سکھر، شکارپور، ورسندھ کے دیگر اضلاع میں ایسے بیٹا سمنڈی نوجوان ملتے ہیں، جو ڈاکٹر صاحب کی کتب بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ سمنڈی قوم پرست تنظیموں میں ان کا نام عزت اور احترام سے پڑھتا ہے۔ ایک دو تنظیموں نے نہیں ایوارڈ دینے کا بھی عدت کیا۔ لیکن معاملہ ایوارڈ دینے یا دینے سے زیادہ اس احترام کا ہے جو نوجوان نسل میں ان کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتب مٹی سے فرار کے اس دور میں ڈاکٹر مہارک کی تحاریر نوجوانوں میں سماجی مسئلہ کو تاریخ کے تناظر میں سمجھنے کا شوق پیدا کرنے کا سبب بن رہی ہیں۔

یہاں اپنے والد کا ایک قول نقل کرنا ہے محل نہ ہوگا۔ وہ کہہ کرتے تھے کہ تین علوم ایسے ہیں جو انسان کی ذہنی وسعت میں اضافے کا باعث بنتے ہیں، یعنی ادب، قانون اور تاریخ۔ مگر آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف یہ تینوں مضامین ہی نہیں بلکہ دیگر سماجی علوم کی طرف وہ طلبہ و طالبات توجہ نہیں دیتے، جنہیں نر میڈیٹ میں سمجھے بغیر نہیں ملتے۔ ہر نکلے اصولی طور پر ذہنی طلبہ و طالبات کو سماجی علوم کا انتخاب کرنا چاہئے، کیونکہ گے چل کر انہیں ہی ملک کی ہل دوڑ سنبھالنی ہوتی ہے۔ لیکن صرف نوجوان ہی نہیں، بلکہ تعلیم یافتہ وادین بھی اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر سائنس، ٹیکنالوجی

اور ٹیکنسٹ سائنس کی طرف بھیجتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ وہ یہ کہ ہمارے ملک میں سماجی علوم میں فارغ التحصیل افراد کے لئے روزگار کے ذریعے محدود ہیں۔ دوئم، یہ کشش مائتس جن شعبہ جات میں ہیں، وہاں سماجی علوم کی بجائے ٹیکنسٹ سائنس یا ٹیکنالوجی کے فارغ التحصیل افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوئم، ہمارے معاشرے میں بچوں کے ذہنی رجحان یا میدان کو جانچنے کا کوئی طریقہ کار نافذ العمل نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے سماجی علوم کی نہ بہتر تدریس ہو رہی ہے ورنہ ہی سرکاری سطح پر ان علوم میں تحقیق و تخلیق کی سرپرستی کی جارہی ہے۔ لہذا سماجی علوم کا انتخاب نوجوان نسل کے لئے بھلے مجبوری بن کر رہ گیا ہے۔

تین ڈاکٹر مہارک علی کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ٹیکنسٹ سائنس ورلڈ میں جیسے کسی علوم کی نوجوانوں میں مقبولیت کے اس دور میں سماجی علوم کو بھی قابل قبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک سبب ہے کہ نئی شعبہ کی وہ جماعت جنہوں نے چند برس پہلے تک خود کو صرف ٹیکنسٹ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تدریس تک محدود کر رکھا تھا، اب سماجی علوم کی فیکلٹی بھی شروع کر رہی ہیں، جو یک سمت مندرجہ تہت ہے۔ ڈاکٹر مہارک علی کا ایک دوسرا کریڈٹ یہ ہے کہ انہوں نے رد و زبان میں تاریخ نویسی کی روایت کو ایک نئی شکل دی ہے۔ انہوں نے مختلف سماجی امور کا تاریخ کے تناظر میں جائزہ لے کر غور و فکر کے لئے زاویے کھولے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سے عام موضوعات کو بھی تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کا تصور عام کیا ہے، مثلاً تاریخ اور کھانے، یا تاریخ اور طوائف وغیرہ۔ اس طرح وہ موضوعات جنہیں لوگ عام طور پر سرسری سے کرتے تھے، ان کا تاریخی پس منظر سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ رد و میں چند دہائی قبل تک انگریزی، عربی و فارسی میں لکھی گئی یہ تاریخ کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض اہم شخصیات کی سوانح حیات کو بھی تاریخ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخی واقعات پر مبنی جوناو لکھے گئے، وہ تہذیبی نرسکیٹ پھیلائے کا سبب بنے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر مہارک علی نے اس رجحان کو بھی چیلنج کیا، در ثابت کیا کہ تاریخ یک سائنس ہے، جس کی اپنی حرکیت ہے اور جو سماجی تبدیلی کے عمل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر مہارک علی نے مختلف سماجی موضوعات پر تاریخ کے تناظر میں بحث شروع کر کے اس معاشرے پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں خواندگی کی شرح کم اور غور و فکر کی روایت کمزور ہو، وہاں لوگوں کو تھاقل سے آگاہ کرنے اور انہیں بہتر سمت کے تعین میں

مدد دینے میں تاریخی حوالے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی حال کا ماضی سے تقابل کر کے مستقبل کے لئے نئی راہیں تلاش کرنے کی جستجو پیدا کرنے کا وسیعہ بنے ہوئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا انہیں طویل عمر صحت اور تندرستی کے ساتھ عطا کرے، تاکہ وہ یونہی اس معاشرے کی فکری راہنمائی کرتے رہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی حیدر آباد کی یادیں

شہزاد

پائیں بازو اور بہرل سوچ رکھنے والے ڈاکٹر مبارک علی خان اپنے حراج ۱۰ دہائیوں میں اس قدر سادہ اور علمی دلائل رکھنے والی شخصیت ہیں اس قدر اصولوں اور کمنٹس میں سخت بھی تھے۔ وقت کی پابندی کا یہ عام کہ اس کی آمد سے گھڑیوں کو درست کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی تفریب میں شہرت ہو تو دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے حصری ضروری ہے۔ ان کا حلقہ احباب کسی خاص نوعیت یا کسی خاص مذہب سے نہیں رہا۔ ان کی دوستیاں پڑھے لکھے لوگوں سے بھی رہیں تو محنت کشوں کے ساتھ بھی ان کے تہذیبی جذبہ جوش رہے۔ برٹس مین، سرکاری افسران، اساتذہ، شاعر، دیب، افسانہ نگار، تاریخ دان، مادیات، سیاسیات، فلسفہ، عمرانیات، غرض ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے حلقہ احباب میں شامل رہے۔ طلباء اور نوجوان بھی ان کے حلقہ احباب کا حصہ تھے اور اب بھی ہیں۔

پاکستان میں تاریخ کا صرف ایک تصور رہا ہے۔ اسماعیلی تاریخ اور اسی سے جڑی ہندوستان کی بھی وہ تاریخ جس دور میں مسلمان حکمران رہے اسی بنا پر پاکستان میں باخصوص ہائی اسکول اور کالجوں کے طلباء میں بھی تاریخ کا مضمون مذہبی مضمون کا ایک حصہ ہی تصور کیا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی خان نے اپنی تحقیق اور اپنی ایچ ڈی کے مقالے میں مغربی دور کا جس طرح تجزیہ کیا وہ تاریخ کے طرز عمل کو چونکا دینے سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ڈاکٹر مبارک علی خان کے مضمون تنقیدی منشستوں میں شائع جانے لگے یا تحریریں شکل میں لوگوں تک پہنچنے لگے تو ان پر بہت تنقید بھی ہوئی۔ خاص طور سے مسلمانوں کی تاریخ جو عرصہ دراز سے فاتحین، مصلح، نئی اور نوانا کے طور پر پیش کئے جا رہی تھی اور اس عرصے میں عوام کی حالت زار سے متعلق تاریخ نہیں ملتی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی خان نے عوامی مسائل کو اپنی تحقیق اور تصنیف کا عنوان بنایا۔ تاریخ کا سائنسی اور معروضی حالات کے تحت تجزیہ کیا۔

حیدر آباد جیسا چھوٹا شہر اپنی کئی شناخت رکھتا ہے۔ تاریخی عمارتیں، تاریخی وقعات، فن تعمیر، حکمران خاندان اگر اس شہر کی شناخت ہیں تو بعض ایسی شخصیات بھی اس شہر کی شناخت بنیں ان ہی میں ڈاکٹر مبارک علی خان بھی شامل ہیں۔ تاریخ کے علم کے ساتھ ساتھ تہذیب، ثقافت، ادب سے بھی گہری وابستگی کا مشہور رہا۔ وقت کی پابندی اور قدر جاننے والوں کے لیے بھی ڈاکٹر مبارک علی خان ایک بڑی مثال ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی خان سے پہلی ملاقات 1977 میں پروفیسر نایاب حسین کی معرفت ہوئی۔ یہ 77ء کی انتخابی مہم کا دور تھا۔ ہم این ایس ایف کی طرف سے اس انتخابی نظام کے خلاف سرگرم تھے۔ جس طرح سیاسی جماعتیں انتخابی مہم چلا رہی تھیں اس طرح ہم لوگ اس کے خلاف کارروائیاں کرتے تھے۔ چھوٹی گئی پر ایک ایسی ہی کارزمیننگ کے دوران ہجوم میں موجود ایک شخص ہمارے ساتھ مقررین کی حمایت کر رہا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو وہ آگے بڑھ کر مقررین سے ملے۔ یہ پروفیسر نایاب حسین تھے جن کا تذکرہ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب میری دنیا (آپ بقی) میں بھی کیا۔ پروفیسر نایاب حسین سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ساتھ ہی ان کے حلقہ حباب اور سم خیال جیسی باتیں ہمارے سامنے آ رہیں جو سچ رکھنے والوں سے بھی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ان ہی میں ڈاکٹر مبارک علی خان بھی تھے۔ ان کی باتیں بارہو کی سوچ فکر و علم سے ہم جیسے طالب علموں کو سیکھنے کا بہت موقع ملا۔ تاریخ کا جدید انداز میں جاننے اور پڑھنے کا شعور ڈاکٹر مبارک علی کی ملاقاتوں سے ہی بھیک گیا۔ اس سے قبل ہم سب تاریخ کو مہربان کا ایک جڑ بھینتے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی پچھلے عرصہ قبل ہی جرمنی سے تاریخ میں پی بی ایچ ڈی کر کے واپس آئے تھے ورنہ سندھ یونیورسٹی میں تاریخ پڑھا رہے تھے۔ کانٹے سے تاریخ ہو کر ہم نے بھی سندھ یونیورسٹی کے شعبہ مصحفیت میں داخلہ لیا تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ ورنہ زیادہ مضبوط ہو گیا۔ سندھ یونیورسٹی کی کونسل فیکلٹی کے فرسٹ فلور پر ہمارے شعبہ تھا اس سے وہ شعبہ تاریخ تھا۔ کلاسوں اور یونیورسٹی کے دیگر سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مبارک علی شعبہ فلسفہ کے استاد پروفیسر فرید الدین شیخ کے ساتھ بھی خاص وقت گزارتا تھا۔ شعبہ تاریخ میں طلبہ کی کمی کے باعث ڈاکٹر مبارک علی خان کا زیادہ وقت پاکستان اسٹڈیز سینٹر کی مابھر میری میں گزارنا تھا۔ اکثر وہ سارا سارا دن وہاں پڑھنے اور لکھنے میں گزارتے تھے۔ یونیورسٹی سے باہر شہر کی محفلوں میں ڈاکٹر مبارک علی خاں کی شرکت بھی خاصی ہو کرتی تھی۔ ادبی نشستیں ہوں یا مشاعرے کی محفلیں یا کسی سماجی اور تاریخی موضوع پر کوئی مباحثہ ڈاکٹر صاحب موجود رہتے۔ پاکستان نیشنل سینٹر ان دنوں شہر کی سماجی، ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ سید جوہر

حسین اس کے ڈائریکٹر تھے جو خود بھی صاحب دانش اور مجلسی انسان تھے۔ ان دنوں ایسا لگتا تھا کہ جوہر حسین اور نیشنل سینٹر کے بغیر شہر کی کوئی سماجی، ادبی سرگرمی کوئی مٹا کر وہ کوئی تاریخی مباحثہ دھوڑا ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہہ جائے کہ ان سرگرمیوں میں ڈاکٹر مبارک علی خاں کی عدم موجودگی بھی اوجھڑے پن کا احساس دلاتی تھی۔

یونیورسٹی اور شہر کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ چند احباب نے مل کر ایک بے نام کلب بنایا تھا۔ جوہر جماعت کو کیوں کہ ان دنوں جمعہ کی چھٹی ہوا کرتی تھی جمعرات و یکم بند تھا۔ یہ احباب مل بیٹھے تھے۔ ہم ادب سے تعلق رکھنے والی ان شخصیات میں سرفہرست ڈاکٹر مبارک علی خان ہی تھے جو نہ صرف کسی ناصی کے بغیر شریک ہوتے بلکہ اس نشست میں تنقید کے لیے پیش کی جانے والی 90 فیصد تحریریں ان ہی کی ہوا کرتی تھیں۔ اس بے نام کلب جسے میں نے بیٹھک کا نام دیا، کی نشستیں دیاں اس کلب میں ہوتی تھیں۔ سردی میں دیال داس کلب کے اندرونی حصے میں ایک کمرہ مہیا ہو چکا کرتا تھا، گرمیوں میں لان کے بنجر سے پر کریس اور سر پر بجلی کے مچھ پر لٹکا ہوا جب ہوا کرتا تھا۔ شرکائیں ریڈیو اور دب کی بڑی شخصیت یاس عشتی، یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے پروفیسر فرید الدین شیخ، علی کانٹے تاریخ اور سیاست کے پروفیسر زبیر احمد فردوسی، ممتاز، ہر تقسیم مرزا عابد، ممتاز، فلسفہ نگار اور ماہر نفسیات ڈاکٹر حسن منظر، کاظم رضا کے ساتھ میں ایک طالب علم کی حیثیت اور ہمارے دوست فکیل پٹھان اس نشست کا مستقل حصہ ہوا کرتے تھے۔ گاہے بگاہے آنے والوں میں ڈاکٹر مبارک علی خان کے استاد تاریخ کے پروفیسر حمید بشیر جس کی بیٹائی کافی حد تک کم ہوئی تھی، جوہر حسین، حیدر آباد کے سرزاسلم، سندھ میوزیم کے ڈائریکٹر ظفر کاکھی، ممتاز شاعر حمایت علی شاعر حوان دنوں سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ تھے شامل ہیں کبھی کبھی این ایس ایف کے دیگر دوست بھی آچا کرتے تھے۔ بیٹھک میں شہر و ملک کے حالات حاضرہ پر گفتگو کے ساتھ ساتھ کوشش ہوا کرتی تھی کہ شرکاء میں سے ہر ایک کچھ کھتر لائے، ڈاکٹر حسن منظر نے اپنے کئی افسانے سی نشست میں سناے جو بعد میں کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ یاس عشتی صاحب کبھی کبھی اپنی شاعری سنایا کرتے تھے۔ مگر ڈاکٹر مبارک علی خان تو ان کے ساتھ مضامین لکھا کرتے تھے۔

دیال داس کلب کی اس بیٹھک میں لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تو چل ہی رہا تھا۔ ساتھ ہی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ ڈاکٹر مبارک علی خاں جو تو ان کے ساتھ مضامین لکھ کر بیٹھک میں پیش کر رہے تھے شرکاء کا تقاضہ بڑھ رہا تھا کہ اسے شائع بھی ہونا چاہئے۔ سواں یہ تھا کہ کیسے شائع ہو۔ کوئی ادارہ یا

نہیں تھے جو تاریخ کے حوالے سے کتاب شائع کرے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش لاہور جا کر ضرور پوری ہوئی۔ حیدر آباد جیسے چھوٹے اور دولہائی شہر میں یہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی خان کی دلی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ از خود اشاعت کے اخراجات برداشت کر سکیں لہذا فیصلہ ہوا کہ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی لکھائی چھی ہے وہ خود کالی سیاہی سے ہر پیچ پر اپنی کتاب کا مواخر پر کریں اس طرح کتابت کا خرچ بچے گا جسے چھپائی کے دیگر معاملات میں استعمال کیا جاسکتا ہے اس طرح پہلی کتاب جسے کتابچہ بھی کہا جاسکتا ہے "تاریخ کیا ہے" شائع ہوئی اس کے لیے ادارہ بھی تشکیل دیا گیا جس کا نام "گہنی پبلی کیشنز" رکھا گیا۔ بیٹھک کے دوسرے اہم رکن ڈاکٹر حسن منظر اس قابل تھے لہذا انہوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ترتیب دیا۔ افسانے کے مجموعہ کا نام رکھائی تھا۔ سندھی کے معروف اویس طارق اشرف کے پریس سوہنی میں شائع ہوا۔ ان کے پاس سندھی کے حروف تو تھے۔ اردو کے نہیں تھے۔ لہذا خصوصی طور پر کراچی سے اردو کے حروف بنوائے گئے اور ان سے کمپوزنگ کرا کے کتاب شائع کی گئی۔ بعد ازاں ڈاکٹر مبارک علی خان اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اردو کے حروف جو ڈاکٹر حسن منظر نے بنائے تھے کمپوزنگ کے ساتھ شائع کرایا۔

ڈاکٹر مبارک علی ان اساتذہ کرام میں سے ہیں جن کا وزہنا بچھونا کتاب اور قلم ہے۔ علم اور تحقیق ہے۔ فالٹو ٹیٹھن ان کے نزدیک قیمتی وقت کا زیاں ہے اور پاکستان جیسے پس ماندہ یا ترقی پذیر ملک میں ہر ایک فرد کا ایک ایک منٹ بہت اہم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ سندھ یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے تو کلاس نہ ہوئے کے باعث ان کا سارا وقت لائبریری میں گزرتا تھا۔ ایک نشست میں کتاب کے کئی کئی صفحات پڑھ بیٹھا لکھ لینا ان کا معمول تھا۔ علم اور تحقیق کی اس جستجو اور جدوجہد ہی کا ثبوت تقاضا تھا کہ انہوں نے حیدرآباد میں جرمن زبان سکھانے کا بھی بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کرنے کے باعث جرمن زبان سیکھی تھی۔ اس سلسلے میں مہرتن "ٹرس کونسل کی خدمات" لکھیں اور وہاں جرمن زبان سکھانے کی کلاسوں کا اجراء کیا گیا۔ 80ء کی دہائی میں سندھ یونیورسٹی کے حالات میں سیاسی مداخلت بڑھنے لگی تھی۔ مارشل لا کے دور کا بعض لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا، مراغب اور محمدے حاصل کیے اور ڈاکٹر مبارک علی خان جیسے لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کیں۔ وہ ان ساری سازشوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ایسے میں انہیں گونے انہی ٹیوٹ لاہور سے پیش کش ہوئی تو کسی تردد کے بغیر انہوں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ سندھ یونیورسٹی کو خیر باد کہا اور لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور اشاعتی اداروں کا مرکز اور اہل علم اور اہل قلم کے حوالے سے زرخیز زمین ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی خان جیسے خود رو پودے کو

بھی اسی فضا میں کافی جلد ملی۔ آج یقیناً سندھ یونیورسٹی کے لوگ جنہوں نے ان کی راہ میں گاتے بچھائے سوچتے ضرور ہوں گے کہ اگر ڈاکٹر مبارک صاحب سندھ یونیورسٹی سے وابستہ رہتے تو ان کو یہ نام اور جو مقام حاصل ہوا ہے وہ سندھ یونیورسٹی کے ساتھ جڑ جاتا۔

1984ء میں، میں کراچی آیا اور جنگ اخبار سے وابستہ ہو گیا یوں ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہوتا گیا پھر ڈاکٹر مبارک صاحب لاہور منتقل ہو گئے تو یہ ملاقاتیں تقریباً ختم ہی ہو گئیں۔ وہ کراچی یا حیدرآباد بھی آتے تو سرسری سی ملاقات ہی ہو پاتی تھی ایک طویل عرصے کے بعد ہم ایک ساتھ ایک ادارے سے وابستہ ہوئے ہیں تو ملاقاتیں تو نہ کسی مگر رابطہ دور جدید کا سیل فون نے تعلقات کو پھر مستحکم کر دیا ہے روزنامہ جہان پاکستان میں ڈاکٹر صاحب مستقل کالم لکھ رہے ہیں اور میں جہان پاکستان کراچی کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

ڈاکٹر مبارک علی

عزیز بگٹی

تاریخ اور فلسفہ میرے دلچسپ مضامین رہے ہیں گوکہ نہ تو میں ڈگری کالج ورنہ ہی یونیورسٹی میں تاریخ کا سب سے سہولت پسند اور سب سے زیادہ ڈگری حاصل کی ورنہ یونیورسٹی بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی لیکن جب میں بھی تعلیم کی غرض سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی یونیورسٹی آف ریزنڈنٹس میں ریمطاعت تھی تو میرا ہجرتیجیکٹ مشرق وسطیٰ کی تاریخ و سیاست جبکہ انٹرنیشنل برصغیر کی تاریخ رہا۔ تاریخ کے ایک قاری کی حیثیت میں میں نے ڈاکٹر مبارک علی کا نام کافی سنا تھا اور ان کی کافی کتب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ ان سے میری بالمشافہ ملاقات پہلی پارکلسن ہاؤس، لاہور کے جناب ظہور احمد خان کے دفتر میں ہوئی تھی۔ ملک کے اس نامور مورخ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اس سے بعد ان سے میری ملاقات کوئٹہ میں اس وقت ہوئی جب وہ ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں ان کی عمیت سے کافی متاثر ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک ظہور احمد خان کے ذریعے میرا ان سے سلام دعا کا سلسلہ جاری ہے۔

اسی دوران ظہور احمد خان میری کتاب ”بلوچستان، شخصیات کے آئینہ میں“ کا تیسرا ایڈیشن شائع کر رہے تھے۔ اس کا تدارف ڈاکٹر مبارک علی نے تحریر کیا تھا جس پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا کہ پاکستان کے نامور اور حقیقی مورخ نے میری کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میرے لئے یہ بات باعث اعزاز رہے گی کہ میری اس کتاب کا پیش منظر نواب اکبر خان بگٹی نے تحریر کیا تھا اور اس کا کور لیب ڈاکٹر مبارک علی نے تحریر کیا۔

میری کچھ سطور جو ملک کے عظیم مورخ کے درجے میں شائع ہونے والی کتاب کا حصہ بننے والی ہیں۔ اس میں حوالے کے لئے چند شائع شدہ الفاظ شامل کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

نواب اکبر خان بگٹی شہید نے اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ پیش منظر میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا

”ہاں جو اس کے کہ ہم نے تاریخ میں کوئی بڑا نام پیدا نہیں کیا، ہم نے کبھی اور کہیں ایسی زیادہ عظمت حاصل نہ کی، لیکن ہمارے لوگ اور رہنما اپنے آپ تک محدود رہے اور اس طرح انہوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ انہوں نے کسی کو خراج تو نہیں دیا۔ یہ بڑی بات ہے کہ ہم نے اپنا یہ امتیاز تشخص برقرار رکھا جو آج بھی باقی ہے۔ جا کر پنجاب چلا گیا ورنہ وہیں دفن ہوا۔ گواہرام روپوش ہو گیا اور اس کی قبر کا تو ہمیں پتہ تک نہیں لیکن ہو چوں کا وطن، ہو چوں سے آباد ہے اور ہو چوں کے پاس ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے۔ اپنا وجود ہے۔ ہم بلوچ ہیں۔ حیثیت ایک قوم کے ایک خاص جغرافیائی خطے میں اپنے تشخص کے ساتھ رہتے ہیں۔ بلوچ کسی اور قوم میں مدغم نہیں ہوئے وہ ماضی میں بھی بلوچ تھے اور اب بھی بلوچ ہیں۔“

اب ڈاکٹر مبارک علی کی تحریر ملاحظہ ہو:

”اہل بلوچستان ابھی تک قبائلی دور میں ہیں کہ یہاں ہر فرد کی شناخت اس کا قبیلہ ہے۔ اگرچہ بلوچ قومیت کی بنیاد پر بگٹی ہے مگر اس قومیت میں قبائلی شناخت کو ختم کرنا ایک بڑا مرحلہ ہے۔ مگر جب تک قومیت کی تشکیل نہیں ہوگی بلوچ قبائلی بنیاد پر بنے رہیں گے اور اپنے حقوق سے محروم رہیں گے۔“

دونوں ہی تجزیے، بٹی اپنی جگہ درست ہیں۔ ایوب اور بھٹو کے جبر و تشدد اور فوجی آپریشنز کے باعث بلوچ قبائلی حصار سے کسی حد تک نکل کر قومیت کے وسیع تر دائرے میں داخل ہو رہے تھے لیکن ایک ہلکے جھڑنے نے ایک مرتب پھر بلوچوں کو قبائلی تقسیم و تقسیم کا شکار بنا دیا۔

اب میں ڈاکٹر صاحب کی تاریخ نویسی کے اس قابل ذکر پہلو کا جائزہ لیتا ہوں جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کو محض حکمرانوں کی فتوحات اور داد و دہشت نہیں سمجھتے ورنہ ہی بادشاہی واقعات کا ایک تسلسلہ وہ تو اسے اپنے دور کے حالات کی ایک تصویر بناتے ہیں جس میں اس دور کے عوام کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مغلیں دور اکبر کی عظمتوں اور بہادر شاہ ظفر کی محرومیوں کا نام نہیں بلکہ حقیقی داستان تو یہ ہے کہ کئی عوامی حالات نے بہادر شاہ ظفر کو انگریز حکمرانوں

کا وظیفہ خواہر بن کر ڈال قلعہ کا متوی بننے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر مبارک علی کی پہچان یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو عوامی لوگوں کی تاریخ بنادیا۔

تاریخ پر درجنوں کتابیں تحریر کرنے کے علاوہ ”تاریخ“ کے نام سے ایک معیاری سہ ماہی مجلہ بھی شائع کرتے ہیں جس میں انتہائی تحقیقی مواد شامل ہوتا ہے۔ 1897ء کی جنگ آزادی کے بارے میں انہوں نے ایک سے زائد مجتہ شائع کئے جس میں انہوں نے اس کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ ویسے بھی برصغیر کی تاریخ ان کا خصوصی موضوع ہے۔ تاریخ شناسی اور تاریخ فہمی کے ضمن میں اس نے ایک نیا ذہن تیار کیا۔

فلش ہاؤس کی جانب سے ڈاکٹر مبارک علی کی تین جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ شائع کی گئی جو معیاری طباعت کے علاوہ جامع معلومات کا بھی ذخیرہ ہے۔ اس کی تقسیم کچھ اس طرح ہے

1- قدیم ہندوستان

2- مہدویشی کا ہندوستان

3- برطانوی ہندوستان

پہلی جلد میں مسلمانوں کی آمد سے قبل تک کی تاریخ ہے۔ دوسری جلد میں مسلمان حکومتوں کے دور کی تاریخ ہے۔ تیسری جلد کو برطانوی ہندوستان کا نام دیا گیا ہے گوکہ شہنشاہیت کے اعتبار سے یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور تک کی تاریخ ہے۔ میری خواہش ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمے کے بعد 1858ء میں ہندوستان پر براہ راست تاج برطانیہ کے قیام کے بعد سے لے کر 1947ء تک کے حالات کے بارے میں ایک اور جلد تحریر کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے قلم سے اگر اس دور کی تاریخ رقم ہو تو یہ بھی معلومات کا ایک ذخیرہ ہوگا۔

اپنی تحریر کو حوالہ دیتے بغیر میں تجاوی کہنے پر قناعت کرتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی، اپنی ذات میں تاریخ ہیں اور ہم اس تمام تر ذخیرے کو صفحات پر منتقل ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ان کی طبیعت میں جو فلسفہ ری اور انکری کا عنصر ہے اس کا ذکر نہ کرنا ادبی بددیانتی میں شمار ہوگا۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنے کسی بھی مسئلے والے کو اپنی طبیعت و شخصیت سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ یہ سب کچھ ان کی باتوں ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

ایک مدبر۔ ایک مؤرخ

حافظ اجمیرینہ دہیت

تاریخ سے میری دلچسپی 2007ء تک یہی تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ ایک تو یہ مضمون تھا۔ ۔ ۔ ۔ ہوا ہے دوسرا یہ کہ تاریخ میں شخصیات کا ہی ذکر ہے اور کچھ نہیں۔ بچپن میں یعنی سس۔ ۔ ۔ ۔ پڑھائی جاتی تھیں ان میں سن اور سال طوطے کی طرح رٹائے جاتے تھے۔ ملاں جنگ۔ ۔ ۔ ۔ بادشاہ نے یہ جنگ جیتی؟ بادشاہ نے کتنے سال حکومت کی؟ شاہی جوس کا ساں کون رتھا؟ یہ۔ ۔ ۔ ۔ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کی کسی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی جس کے حاشیہ پر جھوٹ نہ لکھا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتاب میں وہ بھی تاریخ کے موضوع پر کسی بھی قاری کا دل چاٹ کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔

2007ء کی ہی بات ہے میں نے ایسے ہی ڈاکٹر مبارک علی کی ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنے پڑھنے مجھے محسوس ہوا کہ تاریخ لکھنے کے اور بھی زاویے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتاب پڑھنے کا جو سلسلہ چل نکلا تو میرے ہاں نئی سوچ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، اور یہ فقط ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کی مرہون منت ہو۔ شخصیات کے گرد جو روایتی تاریخ نے عقیدت کے ہالے بنا رکھے تھے وہ ٹوٹنے لگے عظمتوں کے پردوں سے نکل کر یہ شخصیتیں انسان ہی کی صورت میں نظر آنے لگیں۔ فوق فطرت کہانیاں ہوا ہو گئیں، اور تاریخ کا مضمون پڑھنے کا ایسا چسکا لگا کہ ڈاکٹر صاحب کی ساری کتابیں پڑھ لیں، اور دوسروں کو بھی ان کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کتابیں پڑھنے پر زور دیا، اور بہت سارے نوجوانوں نے ڈاکٹر صاحب کو پڑھنا شروع کیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے عزیزم دوست حفیظ کھمر کی توسط سے فون پر بات چیت شروع ہوئی۔ جب ڈاکٹر صاحب 12 دسمبر 2012ء کو حیدرآباد تشریف لائے تو انہوں نے مہربانی کر کے مجھے اور حفیظ کو وقت دیا وراگلی میز کو وہ اپنے دوست حفیظ صاحب کے ساتھ ہمارے گھر تشریف لائے جہاں

ان سے ابھی خاصی بات چیت بھی ہوئی اور حفیظ نے رات سے ہی ڈاکٹر صاحب کا جو انٹرویو کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا وہ یہاں بھی انہوں نے جاری رکھا۔ انٹرویوز کی ریکارڈنگ میں ہمارے مشترکہ دوست ویرجی کوہی کی معاونت تھی۔ یہ انٹرویو بہت تفصیلی ہیں جن کا ڈاکٹر صاحب کے پڑھنے اور سننے والوں کو ابھی تک انتظار ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے پڑھنے والے کی حیثیت سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے پاکستان میں تاریخ کے مضمون کے حوالے سے تحقیق کے نئے زاویے متعارف کرائے ہیں اور ان کی تحقیق نے درہم درہم تاریخ کے نقصانات کو بے نقاب کیا ہے، اور ایک ماقوری بھی ان کی تحقیقی تحریروں کو پڑھتے ہوئے حقائق تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔

جب بھی کوئی قاری ڈاکٹر مبارک کی تحریروں کو دچسپ قرار دیتا ہے تو میرا کہنا یہ ہوتا ہے کہ ان کی ساری دہائیوں کی تحریروں سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر جو بات ان کی تحریروں کو دچسپ بناتی ہے وہ انکشافات ہیں جو ابھی تک ہم تک نہیں پہنچے تھے اور ایک حقیقی مورخ و محقق کے طور پر انہوں نے بغیر کسی سنسنی خیزی کے وہ انکشافات ہم تک پہنچائے ہیں۔ گویا انہوں نے تاریخ کے بہت سارے راز کھول کر رکھے ہیں۔ جو ہماری آنے والی نسلوں کے لئے ضروری بھی ہیں اور مستقبل کے مؤرخین اور محققین کو تاریخ لکھنے میں مدد بھی دیں گے۔

چونکہ ڈاکٹر مبارک علی غیر روایتی انداز میں تاریخ کے موضوعات پر لکھتے آئے ہیں اور روایتی تاریخ نویسی کی روایت پر بھی انہوں نے بہت سارا لکھا ہے۔ لیکن کہیں بھی انہوں نے جذبات میں آکر ان ماضی کے مکمل رد نہیں کیا ہے۔ ایک عام محقق کے لئے یا مورخ کے لئے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے تاریخ لکھنا بہت سہل ہے۔ لیکن تحقیق اور تاریخ اس بات کا غافلہ کرتی ہے کہ جذبات کی رو میں بہتے ہوئے جب ہم کچھ تحریر کریں گے تو اس تحقیق سے انصاف نہیں کر سکیں گے، اور اپنی تحقیق سے ڈاکٹر مبارک علی نے یہی انصاف کیا ہے۔ جو انہیں ایک مدبر مورخ کا درجہ دیتی ہے وہ علم کے ان تمام تقاضوں سے نبھاتے آئے ہیں جو مورخ کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ خود یہ معاشرہ تاریخ سے سیکھتا ہے یا نہیں سیکھتا کسی نے یہ کہا بھی ہے کہ تاریخ سے یہ سبق سیکھا جاتا ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتا۔ لیکن جب یہ بات میں خود پر صد در صد کتابوں کے میں نے تاریخ سے چاہے کچھ نہ سیکھا ہو لیکن ایک مورخ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ نہ فقط میں نے بلکہ بہت سے نوجوانوں نے ڈاکٹر مبارک علی ایسے مورخ و محقق کی تحریروں سے یہ سیکھا ہے کہ تاریخ کو کیسے پڑھا جائے؟ تاریخ کو کیوں

پڑھا جائے؟ نصابی تاریخ کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ہمیں ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ تاریخ ماضی کا مضمون یا شعبہ رہتے ہوئے بھی حال میں مدد دے سکتی ہے۔ یعنی حال کو تاریخ کے تناظر میں مدلل کتی ہے، اور ہم اس دور کے بہت سے معشرتی، سیاسی اور جتماعی نصابی مسائل کو سمجھ سکتے ہیں، سمجھنے کے بعد ان کا حل بھی نکال سکتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جیسا کہ ڈاکٹر مبارک صاحب کہتے ہیں کہ اس سلسلہ کو آگے چلنا چاہئے اور تحقیق ہونی چاہئے۔ لیکن یہ بھی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس طرح کی کوشش کو ریاستی یا غیر ریاستی عناصر کی طرف سے بہت ساری رکاوٹوں کا سامنا بھی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی بھی محقق کو اس ریکارڈ تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا جو ریاست یا حکومت کے قبضہ میں ہے۔

مزاحمت فقط جنگ کے میدان میں نہیں ہوتی۔ مزاحمت تو قلمی قبیحہ و لے ڈاکٹر مبارک جیسے محقق اور مورخ بھی کرتے ہیں جو دیر پا ہوتی ہے اور اس قبیحہ کے لکھنے والے تاریخ میں وہ اعصاب شکن لڑکی لڑتے ہیں جو روایتی جنگ سے مختلف و منفرد ہوتی ہے اور قلم سے لڑی جانے والی جنگ اجتماعی شعور کا وہ حصہ بن جاتی ہے جو نسلوں تک زیر بحث رہتی ہے۔ اس قسم کی جنگ میں ڈاکٹر مبارک علی کا کردار صف اول کے ان لکھنے والوں میں رہا ہے جس کو تاریخ سے ہی سند ملتی ہے اور میرے خیال میں حقیقی تاریخ کی کوئی نصابی روایتی تاریخ سے ہزار گنا دیر پا ہوتی ہے۔ اس قلمی مزاحمت میں اس وقت فقط ڈاکٹر مبارک علی اکیلے نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی سوچ اور فکر کو درست سمجھنے والے وہ ہزاروں لاکھوں لوگ بھی شامل ہیں جن تک ان کے خیالات کتابوں کی صورت میں پہنچ چکے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی — چند تاثرات

شہزاد احمد

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری محبت میری تاریخ کے Subject کے ساتھ لگاؤ کی وجہ سے ہوئی جب میرے ایک دوست نے مجھے حوالہ دیا کہ گزرتے ڈاکٹر مبارک کی کتابیں نہیں پڑھیں تو تم سمجھ لو کہ تم نے تاریخ کے Subject کو نہیں پڑھا، ورنہ واقعی ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ جس نے ڈاکٹر صاحب کی کتابیں نہیں پڑھیں وہ ابھی نابالغ ہے۔ خیر ان کی کتابیں پڑھ کر میری ان سے نسبت میں اضافہ ہوا تو اکثر ان کے بارے میں کتابوں کی دکانوں کے مالکان سے پوچھنے لگا اور آخر کار فکشن ہاؤس سے مجھے ان کے گھر کا نمبر مل گیا۔ میں نے خوشی خوشی ان کو کال کی اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری پہلی دفعہ بات ہوئی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے اپنے آفس کے Director کو بڑے فخر سے بتایا کہ آج میں نے ڈاکٹر مبارک سے بات کی ہے۔ اس بات کو گزرتے دو تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ میں نے ایک دوست کو چھوڑنے سانجھ سے آفس گیا تو باتوں باتوں میں وہاں امجد سے پتہ چلا کہ وہ ہر ہفتے سانجھ کے آفس آتے ہیں بس میں نے فوراً امجد سے پوچھا کہ گھر میں بھی ہفتے کو آ جاؤں تو کوئی مسئلہ تو نہیں۔ اس نے کہا مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے میں نے ہر ہفتے سانجھ کے دفتر جانا شروع کر دیا اور یہیں سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میرے تعلقات کا آغاز ہوا۔ اب میرا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ محبت کا یہ عالم تھا کہ میں ان کو روزانہ دو وقت Calls کر دیتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب میرے بار بار فون کرنے سے جھنجھلاتے ہیں تو میں نے فون کرنا کم کر دیا اور ایک دن میں نے وہاں پر آنے والے ایک لڑکے کو کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو کال کر کے ان کے گھر چلے جاتے ہیں بس پھر ڈاکٹر صاحب کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا جب بھی دل کرتا ان سے ملنے کے لئے ان کو کال کر کے ان کے گھر چلے جاتے ہیں۔

اب ڈاکٹر صاحب ہر ہفتے دوستوں کے ساتھ نیرنگ گیلری میں بیٹھتے ہیں۔ اس بیٹھک میں،

میں پابندی سے شریک ہوتا ہوں یہاں مجھے موقع ملتا ہے کہ میں ان سے سوالات کروں۔ میں اکثر ان سے پوچھتا ہوں کہ آجکل وہ کونسی کتاب پڑھ رہے ہیں جس پر وہ کتاب کے مصنف اور اس کے مضمون کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہیں کیونکہ میں زیادہ تر تاریخی معلومات انٹرنیٹ سے لیتا ہوں اس پر ان کا کہنا ہے کہ مجھے کتابیں پڑھنی چاہئیں جب میں نے روس کی تاریخ میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ”گین“ (Gibbon) کی تاریخ ضرور پڑھوں جو اس نے روسی سلطنت کے زوال پر لکھی ہے۔ اس طرح میں نے ان کے کہنے پر دوسری اہم تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جن میں ”شاخ زریں“ (Golden Bough) ہے۔ جس کا مصنف جیمس فریزر ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس بیٹھک سے میرے علم میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ میں جب بھی ان سے ذاتی معاملات میں مشورہ دیتا ہوں تو وہ مجھے معقول مشورہ دیتے ہیں، مثلاً جب ایک NGO کی ملازمت میں میرے ساتھ برابر تاؤ کیا گیا تو ان کا مشورہ تھا کہ میں فوراً ملازمت چھوڑ دوں کیونکہ فرد کی عزت سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے اور میں اپنے پروفیشن میں اتنی مہارت حاصل کر لوں کہ لوگ خود مجھے ملازمت کی پیش کش کریں۔

مجھے خوشی ہے کہ میں نے یہ چند تاثرات لکھ کر ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

نا قابل فراموش

خورشید احمد شیخ

شام کے تقریباً چار بجے کا وقت ہو گا جب مجھے محترم ڈاکٹر مبارک علی خاں صاحب کا لیٹر موصول ہو۔ اس وقت میں حیدرآباد کی سینٹرل جیل کی بی کلاس کے کپ وڈ میں وادی میراثی لینن کی شہرہ آفاق کتب "کہا کیا جائے؟" (What is to be done) کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیٹر میں اس امر پر روشنی ڈالی تھی کہ ہمیں نواحِ قسم کے سڑچرز، تحریروں اور کتب کا مطالعہ کرنا چاہئے اور یہ ضروری نہیں کہ مذکورہ سڑچر اور کتب ہماری فکری نظریات سے ہم آہنگ ہوں۔ یکطرفہ مطالعہ سے قاری کا ذہن فکری تعصب کا شکار ہو جاتا ہے اور ذہنی وسعت کا دورہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ لیٹر کے مندرجات نے میری سوچ پر دور رس اثرات مرتب کئے اور میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ ایک نئی قسم کے سڑچرز و تحریروں کے مطالعہ سے قاری کی سوچ میں تعصب سرایت کر جاتا ہے اور اس کا ذہن علمی و فکری رواداری کے فقدان کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ تمام تحریروں و کتب جو ہمارے نظریات و افکار سے ہم آہنگ نہ ہوں ان کی طرف مطالعے کی عدم دلچسپی ہمیں علمی طور پر بالکل بے نفع بنا دیتی ہے۔ اس لئے ہر قسم کے سڑچرز اور کتب کا مطالعہ موجودہ سماج، اس کی قدروں، ثقافت، معیشت و سیاست کو سمجھنے کا سائنسی انداز لکھ رہا کرتا ہے۔ اس سے بیشتر میں صرف ترقی پسند نظریات و سوچ کے حامل سڑچرز و کتب کا مطالعہ کرنا ہی پسند کرتا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے مشورے کی روشنی میں میری سوچ میں ایک نمایاں تبدیلی آئی اور میں ہر قسم کے نظریات و سوچ کے حامل سڑچر و کتب کے من سے کافار کر دیا اور جیل کی بھریری میں جو بھی کتب و رسائل دستیاب تھے، ان کا مطالعہ کر ڈالا، بلکہ جیل سے باہر سے بھی کچھ کتب مختلف ذرائع سے منگوائیں جن کا مطالعہ میرے لئے بہت سودمند ثابت ہوا۔

جیل سے رہائی کے بعد میں ان علمی، ادبی و فکری نشستوں میں وقتاً فوقتاً شریک ہوتا رہا جو دیال داس کلب حیدرآباد میں ہوا کرتی تھیں اور جس کے روح رواں محترم ڈاکٹر صاحب اور دیگر سینئر اصحاب تھے اس کا ذکر خود محترم ڈاکٹر صاحب سے اپنی آپ بیتی میں تفصیل سے کیا ہے چونکہ ان فکری و علمی نشستوں میں شرکاء کا دائرہ محدود تھا اس لئے ہم دوستوں نے باہمی طور پر یہ طے کیا کہ اسٹڈی سرکلو شروع کئے جائیں جن میں بین ایس ایف کے کارکنوں اور دیگر نوجوانوں کی فکری و نظریاتی تربیت ہو سکے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک علی خاں اور پروفیسر فرید الدین صاحب نے بہت زیادہ تعاون کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب اور پروفیسر فرید صاحب باقاعدگی سے ان اسٹڈی سرکلو میں پہنچر دیا کرتے تھے اور ہر سیشن کے اختتام پر سوال و جواب کا مرحلہ آتا تھا جس میں تمام دوست بھرپور حصہ لیا کرتے تھے۔ ان اسٹڈی سرکلو میں ڈاکٹر صاحب اور پروفیسر فرید صاحب کے علاوہ دیگر ترقی پسند دانشور بھی نوجوانوں کے ذہنوں کو علم و آگاہی سے سیراب کیا کرتے تھے۔ میں نے ان تمام پہنچر اور بحث و مباحثہ کو ڈیو کیسٹس میں ریکارڈ کیا ہوا تھا جو ایک انتہائی قیمتی علمی سرمایہ تھا لیکن انیسویں صدی کے اپنے پیشرو۔ مصروفیات کی وجہ سے میں نے یہ تمام ڈیو کیسٹس اپنے ایک ذمہ دار دوست (جس کا نام یاد نہیں) کے حوالے سے اس شرط کے ساتھ دی تھیں کہ وہ نہ صرف ان کو حفاظت سے رکھے گا بلکہ دیگر دانشور بھی اس سے علمی طور پر مستفیض ہونے کے مواقع فراہم کرے گا۔ لیکن نہ تو مذکورہ دوست اور نہ ہی ان کی قیمتی علمی مواد کی نشاندہی ہو پاری ہے۔ گذشتہ دنوں اس کی اشاعت کے سلسلے میں اشاعتی ادارے میں ہاؤس کے جناب ظہور محمد خان صاحب سے تبادلہ خیال ہوا۔ ظہور صاحب نے اس قیمتی علمی مواد کی شکل دے کر شائع کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ بعد ازاں میں نے انتہائی کاوشیں کیں لیکن یہ علمی مواد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اگر نیکچرز و ریچٹ و مباحثے کو تحریری شکل میں لایا جائے تو یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوتی جس کا مجھے بہت ملال ہے۔

بہر حال مجھے امید ہے کہ میں جلد یا بدیر مذکورہ ڈیو کیسٹس مواد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور محترم ظہور محمد خان صاحب اسے فکشن ہاؤس کی جانب سے شائع کرنے کا بندوبست فرمادیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی خاں صاحب نے اپنی یادداشتوں (آپ بیتی) میں کافی دوستوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے لیکن پھر بھی آج کے دوست ایسے ہیں کہ اگر ان کی خدمات کا تذکرہ ڈاکٹر کے حوالے سے کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی نامکمل رہے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتداء میں جب اپنی تحریروں کو

شائع کرانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے بڑے ہیچر پر نہ صرف خود کتابت کا آغاز کیا بلکہ این ایس ایف کے دوستوں خصوصاً مہتاب احمد خان، نوشاد احمد چندر نگر اور ظفر احمد راجپوت وغیرہ نے بھی کتابت کے کام میں ڈاکٹر صاحب کی کافی معاونت کی۔ اسی طرح کتبوں کی اشاعت کے موقعوں پر بھی تمام دوستوں نے بھرپور طور پر ان کی پابندی اور فروخت میں حصہ لیا۔

مزید برآں جب ڈاکٹر صاحب حیدر آباد سے لاہور منتقل ہو رہے تھے ان دنوں اندرون سندھ ماہینڈ آرڈر کی صورتوں انتہائی خراب تھی۔ ڈاکوؤں نے قومی شاہراہ اور دیگر چھوٹی بڑی شاہراہوں پر سفر کو ناممکن بنا دیا تھا ان دنوں ظفر احمد راجپوت (جو کل حیدر آباد سٹریٹ پارا سوی اسٹیشن کے صدر ہیں) نے ڈاکٹر صاحب کی حیدر آباد سے لاہور منتقلی میں کافی مدد کی۔ محترم ظفر احمد راجپوت صاحب، ڈاکٹر صاحب کا تمام گھریلو سامان اور فرنیچر ٹرک میں لوڈ کر دیا حیدر آباد سے لاہور لے گئے تھے۔ ان دنوں قومی شاہراہ پر اتنا طویل سفر کرنا انتہائی خطرناک مگر دیر کی کام تھا جو ظفر احمد راجپوت صاحب نے انجام دیا۔

میں نے ایک مقالہ بعنوان "کیا اقبال تصور پاکستان کے خالق تھے؟" ان دنوں تحریر کیا تھا جبکہ ڈاکٹر صاحب حیدر آباد میں ہی قیام پذیر تھے۔ مذکورہ مقالے میں علامہ اقبال کی تحریروں کی روشنی میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ علامہ اقبال نے بھلم خود پاکستان یا، ایسے کسی مجوزہ ملک کی تشکیل کے منصوبہ سے وضع طور پر اپنی برکت کا اعلان کیا تھا۔ مذکورہ مقالے کی تحریر سے پہلے ڈاکٹر صاحب در دیگر سینئر ترقی پسند دوستوں سے کافی گفت و شنید رہی اور کچھ تحریری مواد بھی کٹھا کیا گیا۔ جس کی وجہ سے مذکورہ مقالہ مکمل ہو سکا۔

میں نے تاریخ کا مضمون کیوں لیا

دنیا میں ہر انسان کا کوئی نہ کوئی رول ماڈل ہوتا ہے جس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ طرح پر رول ماڈل ایک طرح روحانی استاد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کل میرے رول ماڈل اور روحانی سے ہیں جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تاریخ کے مضمون میں اپنا مقام بنانا چاہتی ہوں۔

میں نے بچپن میں نصابی کتب کو شوق سے پڑھتی تھی اور کلاس میں اچھی پوزیشن بناتی تھی۔ پتی بڑی بہن کی طرح اخبار وغیرہ پڑھنے کا دل شوق نہیں تھا۔ حالانکہ میرے ہاتھ میں کتب کی ہدایت کیا کرتے تھے۔ میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد پتی کی دلجوئی پر پری میڈیکل میں داخلہ لے لیا، یہ حالے بغیر کہ اس مضمون میں میرے دلچسپی سے دلچسپی نہ ہو۔ میں اچھے نمبروں سے آئی اور سائنس اور کیمسٹری کی تیسری تہ درجہ کر دی۔ سائنس کا امتحان دینے سے قبل میں نے اچھے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس لئے اپنے پیپا سے مشورہ کیا کہ جیسوں میں سے چائے۔ انہوں نے کہا کہ اگر تمہاری دلچسپی ہو تو میری کتابوں کی اماری سے اپنا پسند کیا۔ کتابیں لے کر پڑھ سکتی ہو۔ مگر اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ خواب نہ ہونے پائیں۔ میں بھی نہ میں۔ ہو رہی تھی، اس لئے سوچا چو کوئی کتاب سے کر پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

یوں ایک دن میں نے پیپا کی اماریوں کا بار بار میرا شروع کر دیا۔ سامنے میں کتابیں لے کر کتابیں رکھی تھیں، جو دیکھنے میں بہت اچھی کتابیں تھیں۔ میں نے یہ کتابیں شروع کر دی۔ یہ انسانی تاریخ کی مختصر داستان تھی، جس میں رنگیں تصاویر تھیں۔ جب کہ دوسری اور تیسری کتاب دیکھی اور پھر پچاس کی چارٹ سے اپنے کمرے میں لے آئی۔ یہ کتابیں دلچسپ اور معلوماتی تھیں۔ ان کے نام پتھر کا زمانہ، کانسی کا زمانہ اور لوہے کا زمانہ تھے۔ یہ کتابیں

دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کتاب پڑھتی چلی گئی اور یوں مجھے اس مضمون میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ میں نے پچاسے پوچھ کہ اس طرح کے موضوع پر کچھ اور کتنے ہیں آپ کے پاس؟ انہوں نے کہا کہ اب تم خود ماریوں میں تلاش کرو اور جو کتاب اچھی لگے اسے اٹھا کر پڑھ لو، مگر میری شرط یاد رکھنا۔ میں نے جب الماری پر نظر ڈالی تو ایک پوری ریک میں ڈاکٹر مبارک علی کی کتابیں بھی ہوئی تھیں۔ نیچے والی ریک میں سہ ماہی تاریخ کے شمارے بہت بہتے سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی دو کتابیں اٹھائیں اور پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ کتابیں تاریخ کیسے لکھنی چاہئے اور تاریخ کا شعور تھیں۔

اس کے بعد میری دلچسپی مزید بڑھی اور میں نے پچاس کی الماریوں میں موجود ڈاکٹر مبارک علی کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ہمارے گھر میں روزانہ چار اخبارات پڑھتے ہیں۔ ان میں انگریزی اخبار ان بھی شامل ہے۔ میرے پیپا ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ انگریزی درست کرنے کے لئے انگریزی اخبار پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر ہم نے کبھی ان کی اس نصیحت پر توجہ نہیں دی۔ لیکن جب ڈاکٹر مبارک علی کی کتابیں پڑھنے کے بعد تاریخ میں شوق پیدا ہوا تو ایک دن پیپا نے بتایا کہ ڈاکٹر مبارک علی ڈان میں ہفتہ وار مضامین لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے اب ہر اتوار کو ڈان کے سنڈے میگزین Images کو نہ صرف پڑھنا شروع کر دیا، بلکہ ان مضامین کو فائل بھی کرنے لگی۔ یوں میرے پاس نتیجہ آئے تک ان کے مضامین کی ایک فائل بن چکی تھی۔

رہنمائی نے پر میرے بہت اچھے نمبر آئے، اور یہ امید تھی کہ مجھے میڈیکل میں داخلہ مل جائے گا۔ امی بہت خوش تھیں کہ مینی ڈاکٹر بننے جارہی ہے کہ ایک دن میں نے پیپا سے کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ میں میڈیکل کی بجائے تاریخ میں ماسٹر کروں۔ میرے پیپا خاصے روشن خیال ہیں اور بیٹیوں اور بیٹوں میں امتیاز نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ جو تمہاری مرضی جس مضمون میں چاہو تعلیم حاصل کرو، میں میری خواہش ہے کہ تعلیم ضرور حاصل کرو۔ امی کو بہر حال غصہ آیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تمہیں ڈاکٹر بنانے کی خواہش میں تمہارے لئے نیشن لگا دی اور اب تم تاریخ پڑھو گی؟ یہاں چھپتا نے میری وکالت کی اور امی کو سمجھا دیا کہ بچہ جس مضمون میں دلچسپی سے وہی پڑھ دینا چاہئے اور اپنی مرضی مسط نہیں کرنا چاہئے۔ یوں میں ہر ماہ کرچی کے شعبہ تاریخ میں داخلہ دینے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ میری زندگی کا ایک انتہائی خوب صورت موڑ تھا، کیونکہ میں اپنی مرضی کا مضمون اپنی پسند کے مطابق پڑھنے جارہی تھی۔

میں اپنے پیپا کے ساتھ ڈاکٹر مبارک علی کی مشکور ہوں جن کی وجہ سے مجھے اپنے ذہنی میدان کے مطابق مضمون منتخب کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر مبارک علی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے محض

تاریخی واقعات بیان نہیں کئے بلکہ تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کے مختلف موضوعات پر رد و میں کتابیں لکھ کر پاکستان کے عام شہری کو تاریخ کا شعور بخشا۔ ان کی تیسری خوبی یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کی صورت حال کو تاریخ کے تناظر میں جانچنے کا سیدھا سکھایا۔ یونیورسٹی کے چار سالہ دور میں میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ تاریخ کو ایک بنیادی طالب علم کے طور پر پڑھا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ آج میں نے تاریخ عمومی (General History) میں ایم اے کر لیا ہے۔ لیکن میری پیدائش نہیں سمجھی۔ میری خواہش ہے کہ میں اس مضمون میں Ph.D کروں اور ڈاکٹر مبارک علی کی طرح عوام کے شعور میں اضافے کا سبب بنوں۔ بہت شکریہ ڈاکٹر مبارک علی کہ آپ کی کتابوں کی بدولت تاریخ کی ایک طالبہ میڈیکل کالج کی بیہوشیوں میں بھٹکنے سے بچ گئی۔ ڈاکٹر تو بہت لوگ بن جاتے ہیں، مگر تاریخ کا شعور ایک پڑھ لکھے معشرے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ ڈاکٹر صاحب آپ میرے لئے روشنی کا ستار ہیں۔

یادوں کی واپسی

آج ہم پورے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر مہارک علی نہ صرف عوام کے موزن اور عوام کے محقق ہیں بلکہ وہ پاکستان میں تاریخ کے ایک مکتبہ فکر کا سب سے مستند ادارہ ہیں۔ میں اپنے مضمون کا اختتام اسی واقع پر کروں گا کہ اپریل 2012ء میں میرا بورڈ جانا ہوا، اپنے ایک اور مدد و استاد محترم ”حسن شاز“ صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لئے اُن سے وقت لئے کر اُن کے گھر واقع (نیلی پور) ”سیا“ دوران قتلوجب میں نے یہ بتایا کہ میں حیدر آباد میں ڈاکٹر مہارک علی صاحب کا میران (جونیئر) ہوتا ہوں تو ”سپ“ یقین چائے کہ وہ نہ صرف بہت خوش ہوئے بلکہ فرمایا کہ پاکستان میں ایک وہ تاریخ ہے جو ”ڈاکٹر صفدر محمود“ نے لکھی۔ جو آج اُمر کی واجیرداروں کی اور ایلٹ کی تاریخ ہے، وریک وہ تاریخ ہے۔ جو ”ڈاکٹر مہارک علی“ نے لکھی۔ جو ”پکی میری“ اس دھرتی کی اس دھرتی کے بیٹوں بیٹیوں کی تاریخ ہے، پے ہوئے طبقت کی تاریخ ہے۔ درحقیقت جو عوام کی تاریخ ہے۔

دوستوں نے جس محبت، الفت اور لگاؤ کے ساتھ یہ مضامین لکھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔
احساس ہوا۔ ان میں سے کچھ مضامین نے پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔
محبت سے راجع کہتے ہیں، جرمنی کی بھولی بسری یادوں کو تازہ کر دیا۔ جب میں روح ۔ ۔ ۔ ۔
تو اس وقت وہاں پاکستانی طلباء کی تعداد بہت کم تھی۔ ان میں سے اکثریت ۔ ۔ ۔ ۔
پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں واحد تھا۔ دوستوں سے تعریف ۔ ۔ ۔ ۔
جا کر ہندوستان اور پاکستان کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

دوستیاں ہندوستان کے طلبہ سے بھی اسی طرح خفیں، جیسے پاکستان۔ ۔ ۔ ۔ ۔
 ہارے سینئر یونس خاں تھے، جو الیکٹرک ویک انجینئرنگ میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ۔ ۔ ۔ ۔
 یہ نئے آنے والوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ جب ان سے دوستی بڑھی تو اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
 کی بازی ہونے لگی۔ اس میں راجہ میرے پارٹنر ہوتے تھے، اور جہانگیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
 خاں کو شک کرتا تھا، جس پر اکثر دو ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ رات بھر بے سوجھ بوجھ سے
 یونس خاں ہم سب کو پٹی کار میں بند کر دیتے تھے، ہمارے ٹھکانوں پر چھوڑنے آتے تھے۔ دن نہ کہتے تھے
 قمر و ذل بڑے شوق سے ہمیں جرمن کھانے کھلاتی تھیں۔

جرمن یونیورسٹیوں میں سسٹر کے خاتمہ پر رواج ہے کہ طلباء پہلے سے سسٹر کے ساتھ رہتے ہیں، اس موقع پر گانے گائے جاتے ہیں، ڈانس ہوتا ہے، سسٹر کے ساتھ جاتے ہیں، اکثر غیر ملکی کے طلباء آپس میں مل کر پارٹیاں دیتے ہیں۔ سسٹر کے ساتھ رہنے میں کھانے کا اسٹل لگا ہوا تھا، یہ کھانا میں نے یونیورسٹی کے کھانے کے ساتھ لیا تھا۔

تقاق سے کھانا مزیدار بن گیا اور خوب بگا۔

دوسری بار ہم نے فلسطینیوں کی مدد کے لئے ایک اسٹال بگایا۔ یہ بیسٹیاں بومشیر کے قریب ایک پرانے قلعہ میں ہوتا ہے۔ وہاں بھی کھانا لوگوں کو پسند آیا۔ تیسری مرتبہ جب رابعہ کی بی۔ ایچ۔ ڈی کمپن ہوئی تو اس موقع پر یونس خاں نے کھانا پکایا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ کھانا پکانے میں ماہر ہیں، واقعی کھانا لذیذ تھا۔

اس موقع پر بہت سے جرمن دوست یاد آ رہے ہیں۔ ہانس جو ہائیں بازو کے نظریات کی جماعت میں سرگرم تھا، ہر موقع پر مدد کے لئے تیار ہوتا تھا۔ جب ہم ہاسٹل سے اپارٹمنٹ میں آئے تو اسی نے کمڑکیوں اور دروازوں پر پردے لگائے۔ سامان کو ہمارے ساتھ اٹھوایا، وہ درویشانہ حالت میں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر شہر سے باہر تفریح کرائی، اور اس قدر تیز رفتاری سے موٹر سائیکل چلائی کہ میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ رہا کہ یہ کب مجھے واپس لے آتا ہے۔ جب کبھی وہ نہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتا تو اس کو پیچھا نہ مشکل ہوتا تھا۔

جرمنی کے ہاشموں میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ رہتے ہیں، اس لئے ان کے درمیان دوستی اور محبت ہو جاتی ہے۔ شام کو جب مین میں سب مل کر کھانا پکاتے، کھاتے، تو اس وقت سیاست پر گرم گرم بحث ہوتی تھی۔ یہ زمانہ سیاسی طور پر بڑا اہم تھا۔ ویت نام کی جنگ نے طلباء میں شعور پیدا کر دیا تھا۔ روس اور چین کے حامیوں کے درمیان بحث ہوتی تھی۔ فلسطینی طلباء اپنے حقوق کی بات کرتے تھے۔ مجھے عمر شملی یاد ہے، جسے کٹر عروسی فریڈل بھی کہتے تھے۔ بڑا باتونی تھا، جب کینے میرا میں آتا تو اس زور سے بولتا کہ صرف جاس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہم سب فلسطینیوں کے ساتھ ان کے حقوق کی بات کرتے تھے۔ ہماری یونیورسٹی میں بھی ترک طلباء کی تعداد بہت تھی۔ ترک بڑے سیدھے، صاف گو اور بے وقار لوگ ہیں۔ مجھ کو جبکہ میرے ساتھ ہی بی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا تھا۔ بعد میں وہ جرمنی ہی میں رک گیا۔ علی جو سائنس کا طالب علم تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ساتھ ہم ایمرسٹڈیم گئے تھے۔ اکثر یہ طلباء ہمیں اپنے گھروں پر بھی بلاتے تھے اور اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے ملاتے تھے۔ مجھ سے اکثر کہتے تھے کہ ترکی میں آ جاؤ، تمہیں اس کی شہریت دے دیتے ہیں۔

شعبہ تاریخ کے پروفیسر کو ایلون سے میری دوستی تھی وہ اکثر میرے ہاسٹل میں آ جاتے تھے۔ جب بھی میرے ساتھ مسکن ہوتے وہ فوراً مدد کرتے تھے۔ ایک بار میری مالی حالت خراب تھی، تو انہوں نے موسیقی کے شعبہ سے اسٹنٹ شپ لے کر مجھے دوا دی۔

فراڈر دھک، جولا بیریری کی انچارج تھیں، اکثر گھر پر کھانے پر بدلتی تھیں۔ اس شہ۔ یہ اسوں میں موسیقی کے استاد تھے۔ اس کا رکا بھی موسیقی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جرمنوں میں موسیقی بہت اچھی ہے۔ جب کبھی اکٹھے ہو جائیں تو مل کر گانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

رابعہ کے مضمون نے جرمنی میں پانچ سالہ قیام دوران کی یادوں کو ایک بار پھر تازہ کر دیا۔ دوست سے دوست یاد آنے کہ جن سے بعد میں کوئی رابطہ نہیں رہا۔ لیکن ان کی یادیں اب بھی ساتھ ہیں۔

جرمنی سے واپس آنے کے بعد میں تین بار جرمنی گیا۔ دوبارہ اپنی یونیورسٹی کو بھی گئے۔ اب حالات بدل چکے تھے۔ یورپ کا سیاسی، حول تبدیل ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کا کیفیہ یہ یا جیہ ان سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا اب سسٹن پڑا تھا۔ یونیورسٹی اپنی جگہ تھی۔ یونی سینٹر بھی سی طح سے تھا، مگر جب دوست نہ ہوں تو یہ دیران نظر آئے۔ حامد بک طلباء و طبابت کے مجاہد اب بھی ہونٹوں، اور یونی سینٹر کی پنجوں پر بیٹھے خوش گیسوں کرتے نظر آئے۔

میں یونی سینٹر سے بیرون چلتا ہوا، اس بلڈنگ تک گیا کہ جہاں ہم رہتے تھے۔ وہ بلڈنگ، کنگ ای طرح سے تھی، لیکن اب درختوں کی تعداد بڑھ گئی تھی، حول پہلے سے زیادہ خوشگوار اور تازہ۔

کچھ دوستوں نے حیدر آباد کے بارے میں لکھا، خاص طور سے اس وقت کا حال۔ جب میں جرمنی سے واپس آیا اور حیدر آباد میں لو جوانوں سے ملاقات ہوئی کہ جو سیاسی طور پر ترقی پسند حریت کے حامی تھے اس وقت حیدر آباد میں ادبی سرگرمیوں کا مرکز مجلس مصنفین ہوا کرتی تھی کہ جس باسٹ۔

جلال طیف آباد نمبر 7 میں، کارپوریشن کی ایک لائبریری میں ہوتا تھا۔ اس کے لائبریرین احمد مدین تھے، جنہوں نے بڑی محنت سے کتابیں جمع کی تھیں، اور طلباء میں کتابیں پڑھنے کے شوق کو بھارت تھے۔ اس ادبی مجلس نے شہر کے کچھ لوگوں میں ادب کے شوق کو زندہ رکھ رکھا تھا۔ لیکن جب ختم ہو گیا کی اچانک وفات ہوئی تو کارپوریشن جو شاید اس کا انتظار کر رہی تھی لائبریری بند کر دی۔ یہ مجلس کی کتابوں کا کیا ہوا؟ مجلس مصنفین کے اجلاس بھی ختم ہو گئے۔ شہر کی علمی فضا، اس وقت ختم ہو گئی کہ جب یونیورسٹی جام شورو سے چلی گئی۔ کالجوں میں طلباء کی ایسی سیاست آئی کہ سب سرگرمیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ اب حیدر آباد میں شاید ایک مجلس نے قائم کیا۔ میں بھی وادبی تذکروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اکثر اپنی درجہ تازہ بات بات پر سدا رہ گئے۔ شہر میں آبادی تو بہت بڑھ گئی مگر اپنی۔ یہ غم و غصہ کی بات ہے۔ اس علمی انحراف سے ہم معاشرے کے ذہن کا حسرتا رہتے ہیں۔

دوستوں کے مضامین پڑھے تو ان کے ساتھ بیٹے دن یاد آئے جب انور کمال اور رضی عابدی پہلی بار حیدر آباد آئے تو ہم مل کر مونجواڑو گئے تھے، جہاں نوجوانوں نے ہمارے ساتھ ایک شام منائی تھی۔ دوسری بار نور کمال آئے تو ٹھیک پانچن کے ساتھ مکھی بھی گئے تھے۔ سب تصویروں میں یادیں ٹھنڈ کر رہ گئی ہیں۔

اب بچھڑے دنوں ہمارے دوست خورشید قائم خانی بھی انتقال کر گئے، جب میں حیدر آباد میں تھا، یہ ہر مہینے گڈ وال یا رے آتے تھے، اور پھر ہم فرید الدین صاحب کے گھر جاتے اور وہاں خوب بات چیت ہوتی تھی۔ فرید صاحب نے جدید فلسفہ سے لے کر قدیم ہندوستانی فلسفہ اور راکسزم پر بہت پڑھ رکھا ہے۔ افسوس ہے کہ انہوں نے صرف دو کتابچے لکھے اور لکھنے سے زیادہ پڑھے میں وقت گزرا۔ اب وہ بھی حیدر آباد کو چھوڑ کر کراچی اور کینیڈا میں رہنے لگے ہیں۔

لیکن اب بھی حیدر آباد کے نوجوان اس شہر کی کھلی فضا کو قائم رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس نے جب بھی میرا جانا ہوتا ہے، محفلیں جم جاتی ہیں، پرانے دوست اور نوجوان کٹھن ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ جذبہ رہا تو شہر زندہ رہے گا۔

آخر میں، میں اپنے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے یہ مضامین لکھ کر مجھے حوصلہ دیا۔ اس سے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے جو کچھ کام کیا ہے وہ رنگاں نہیں گیا ہے اور میری یہ شکایت ختم ہو گئی ہے کہ معاشرہ میں، میں اکیلا ہوں۔

آخر میں، میں ظہور احمد خان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کی تیاری اور چھپائی میں دلچسپی لی۔ خاص طور سے محمد شفیق کا شکریہ کہ اس نے میری تحریر کو پڑھا اور کم غلطیوں کے ساتھ کمپوزنگ کی اور ڈاکٹر ریاض احمد شیخ کا جنہوں نے دوستوں سے مضامین لکھوا کر یہ کتاب تیار کی۔

سہ ماہی تاریخ کانفرنسیں

- 1- پہلی تاریخ کانفرنس "تاریخ اور" 2002ء، لاہور
- 2- دوسری تاریخ کانفرنس "پنجاب اور سکھ" 2002ء، لاہور
- 3- تیسری تاریخ کانفرنس "تاریخ سندھ" 2003ء، حیدر آباد سندھ
- 4- چوتھی تاریخ کانفرنس "پنجاب کی تاریخ" 2004ء، لاہور
- 5- پانچویں تاریخ کانفرنس "کولونیل ازم" 2004ء، کراچی
- 6- چھٹی تاریخ کانفرنس "میشل ازم" 2005ء، لاہور
- 7- ساتویں تاریخ کانفرنس "شہنشاہ کبیر" 2005ء، کراچی
- 8- آٹھویں تاریخ کانفرنس "تاریخ نویسی" 2007ء، لاہور، کراچی، گجرات
- 9- نویں تاریخ کانفرنس "1857ء" 2007ء، لاہور، کراچی، گجرات
- 10- دسویں تاریخ کانفرنس "پاکستان میں مارشل لا کی تاریخ" 2009ء، لاہور
- 11- گیارہویں تاریخ کانفرنس "تاریخ اور عورت" 2010ء، کراچی
- 12- بارہویں تاریخ کانفرنس "تاریخ اور عوام" 2012ء، کراچی، لاہور
- 13- تیرہویں تاریخ کانفرنس "تاریخ اور جنگ" 2012ء، کراچی
- 14- چودھویں تاریخ کانفرنس "سماجی علوم" 2012ء، کراچی

تاریخ پہلی کیشنز کا کتابی سلسلہ

سہ ماہی "تاریخ"

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

- 1- سہ ماہی تاریخ نمبر (1)، اشاعت اول مارچ 1999ء
- سہ ماہی تاریخ نمبر (1)، اشاعت دوم جون 2005ء
- 2- سہ ماہی تاریخ نمبر (2)، اشاعت اول جولائی 1999ء
- سہ ماہی تاریخ نمبر (2)، اشاعت دوم جون 2005ء
- 3- سہ ماہی تاریخ نمبر (3)، اشاعت اول اکتوبر 1999ء
- سہ ماہی تاریخ نمبر (3)، اشاعت دوم جون 2005ء
- 4- سہ ماہی تاریخ نمبر (4)، اشاعت اول جنوری 2000ء
- سہ ماہی تاریخ نمبر (4)، اشاعت دوم جون 2005ء
- 5- سہ ماہی تاریخ نمبر (5)، اپریل 2000ء
- 6- سہ ماہی تاریخ نمبر (6)، جولائی 2000ء
- 7- سہ ماہی تاریخ نمبر (7)، اکتوبر 2000ء
- 8- سہ ماہی تاریخ نمبر (8)، جنوری 2001ء
- 9- سہ ماہی تاریخ نمبر (9)، اپریل 2001ء
- 10- سہ ماہی تاریخ نمبر (10)، جولائی 2001ء
- 11- سہ ماہی تاریخ نمبر (11)، اکتوبر 2001ء

- 12- سہ ماہی تاریخ نمبر (12)، خاص نمبر "لاہور نمبر" جنوری 2002ء
- 13- سہ ماہی تاریخ نمبر (13)، اپریل 2002ء
- 14- سہ ماہی تاریخ نمبر (14)، خاص نمبر "پنجاب اور سکھ" جولائی 2002ء
- 15- سہ ماہی تاریخ نمبر (15)، اکتوبر 2002ء
- 16- سہ ماہی تاریخ نمبر (16)، خاص نمبر "سندھ نمبر" جنوری 2003ء
- 17- سہ ماہی تاریخ نمبر (17)، اپریل 2003ء
- 18- سہ ماہی تاریخ نمبر (18)، اکتوبر 2003ء
- 19- سہ ماہی تاریخ نمبر (19)، اکتوبر 2003ء
- 20- سہ ماہی تاریخ نمبر (20)، "پنجاب نمبر" جنوری 2004ء
- 21- سہ ماہی تاریخ نمبر (21)، اپریل 2004ء
- 22- سہ ماہی تاریخ نمبر (22)، خاص نمبر "کولونیل ازم برصغیر ہندوستان میں" جولائی 2004ء
- 23- سہ ماہی تاریخ نمبر (23)، اکتوبر 2004ء
- 24- سہ ماہی تاریخ نمبر (24)، خاص نمبر "پیشل ازم" جنوری 2005ء
- 25- سہ ماہی تاریخ نمبر (25)، اپریل 2005ء
- 26- سہ ماہی تاریخ نمبر (26)، جولائی 2005ء
- 27- سہ ماہی تاریخ نمبر (27)، خاص نمبر "شہنشاہ اکبر" اکتوبر 2005ء
- 28- سہ ماہی تاریخ نمبر (28)، جنوری 2006ء
- 29- سہ ماہی تاریخ نمبر (29)، اپریل 2006ء
- 30- سہ ماہی تاریخ نمبر (30)، جولائی 2006ء
- 31- سہ ماہی تاریخ نمبر (31)، اکتوبر 2006ء
- 32- سہ ماہی تاریخ نمبر (32)، خاص نمبر "تاریخ نویسی" جنوری 2007ء
- 33- سہ ماہی تاریخ نمبر (33)، اپریل 2007ء
- 34- سہ ماہی تاریخ نمبر (34)، خاص نمبر "1857ء" جولائی 2007ء (جلد اول)
- 35- سہ ماہی تاریخ نمبر (35)، خاص نمبر "1857ء" اکتوبر 2007ء (جلد دوم)
- 36- سہ ماہی تاریخ نمبر (36)، خاص نمبر "1857ء" اپریل 2008ء (جلد سوم)

ڈاکٹر مبارک علی کی اردو کتب

- 1- ✓ مغل دربار
- 2- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان
- 3- تاریخ شناسی
- 4- تاریخ و فلسفہ تاریخ
- 5- تاریخ کے بدلتے نظریات
- 6- تاریخ کیا کہتی ہے؟
- 7- تاریخ کی روشنی
- 8- ✓ البیہ تاریخ
- 9- برصغیر میں مسلمان معاشرے کا البیہ
- 10- علماء اور سیاست
- 11- تاریخ اور عورت
- 12- ✓ تاریخ فحش اور ڈاکو
- 13- سندھ: خاموشی کی آواز
- 14- ✓ اچھوت لوگوں کا ادب
- 15- ✓ غلامی اور نسل پرستی
- 16- تاریخ اور سیاست
- 17- شاہی محل
- 18- تاریخ: کھانا اور کھانے کے آداب
- 19- تاریخ اور دانشور

- 37- سہ ماہی تاریخ نمبر (37)، خصوصی شمارہ "کیا تاریخ ضروری ہے؟" دسمبر 2008ء
- 38- سہ ماہی تاریخ نمبر (38)، اپریل 2009ء
- 39- سہ ماہی تاریخ نمبر (39)، خصوصی شمارہ "پاکستان میں مارشل لاء کی تاریخ" ستمبر 2009ء
- 40- سہ ماہی تاریخ نمبر (40)، اپریل 2010ء
- 41- سہ ماہی تاریخ نمبر (41)، خصوصی شمارہ "تاریخ اور عورت" اکتوبر 2010ء
- 42- سہ ماہی تاریخ نمبر (42)، مئی 2011ء
- 43- سہ ماہی تاریخ نمبر (43)، خصوصی شمارہ "لاہور نمبر" نومبر 2011ء
- 44- سہ ماہی تاریخ نمبر (44)، خصوصی شمارہ "تاریخ اور عوام" مئی 2012ء
- 45- سہ ماہی تاریخ نمبر (45)، خصوصی شمارہ "تاریخ اور جنگ" اگست 2012ء
- 46- سہ ماہی تاریخ نمبر (46)، خصوصی شمارہ "ایک ہائس باؤم" جنوری 2012ء

- 20- تاریخ اور مورخ
- 21- نئی زندگی کی تاریخ
- 22- کیتھارینا بلوم کی کھوئی ہوئی عزت
- 23- ملکہ کا اور کوٹ
- 24- جدید تاریخ
- 25- تاریخ اور تحقیق
- 26- تاریخ کی آواز
- 27- تاریخ کی تلاش
- 28- تاریخ اور انصافی کتب
- 29- تاریخ سے مرکار
- 30- سندھ کی تاریخ کیا ہے؟
- 31- سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ
- 32- لطف اللہ کی آپ بیتی
- 33- درود شہو کر کھائے
- 34- یورپ کا عروج
- 35- برطانوی راج (ایک تجزیہ)
- 36- بدلتی ہوئی تاریخ
- 37- جاگیر داری
- 38- تاریخ اور معاشرہ
- 39- اکبر کا ہندوستان
- 40- جہانگیر کا ہندوستان
- 41- تاریخ اور مذہبی تحریکیں
- 42- گمشدہ تاریخ
- 43- تاریخ اور آج کی دنیا
- 44- تاریخ: تحقیق کے نئے رجحانات

- 45- تاریخ کی دریافت
- 46- تہذیب کی کہانی: (1) پتھر کا زمانہ، (2) کانسی کا زمانہ، (3) لوہے کا زمانہ (مکمل سیٹ تین جلدیں)
- 47- (1) قدیم ہندوستان، (2) عہد وسطی کا ہندوستان، (3) برطانوی ہندوستان (مکمل سیٹ تین جلدیں)
- 48- میں اور میرا مقدمہ
- 49- تاریخ کی دریافت
- 50- امروز (1857ء) ترتیب
- 51- تاریخ کی باتیں
- 52- پاکستانی معاشرہ
- 53- قائد اعظم کیا تھے، کیا نہیں تھے؟
- 54- میری دنیا

- 55- تاریخ کہ آئی ہے -
- 56- تاریخ کی گوی -
- 57- تاریخ فہمی -
- 58- تاریخ کیا سکھاتی ہے -

ڈاکٹر مبارک علی کو ملنے والے ایوارڈز

- 1- فیض ایوارڈ، 1988ء (فیض فاؤنڈیشن)
- 2- بی حسام الدین راشدی گولڈ میڈل، 1993ء (سندھی ادبی سنگت)
- 3- کیو بی ہارمنی ایوارڈ، 2002ء (رام کرشن سوسائٹی دہلی)
- 4- کمال اعتراف، 2012ء (کراچی آرٹس کونسل)

ڈاکٹر مبارک علی کی انگلش کتابیں

- 1- *A Social and Cultural History of Sindh*
- 2- *In the Shadow of History*
- 3- *Sindh Observed*
- 4- *The English Factory In Sindh*
- 5- *Historian's Dispute*
- 6- *History On Trial*
- 7- *Ulema, Sufi's and Intellectuals*
- 8- *Crow's Account of Sindh*
- 9- *Essays On The History of Sindh*
- 10- *A Page From History*
- 11- *Interviews and Comments*
- 12- *Pakistan In Search For Identity*
- 13- *In Search of History*
- 14- *Sindh Analysed*
- 15- *Dimension of History*
- 16- *What History Tell Us?*
- 17- *Power of History*
- 18- *Tales from the Later Mughals*
- 19- *Story of Civilization Indian History*
- 20- *Story of Civilization*
- 21- *Court of The Great Mughal*